مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم

مرتب

حسن چشتی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم

مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم

مرتب

حسن چشتی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

MUJTABA HUSSAIN
KE
MUNTAKHAB COLUMN
AUTHOR
MUJTABA HUSSAIN
EDITED BY
HASAN CHISHTI
YEAR OF Ist EDITION - 2004
ISBN 81-8223-002-0
PRICE Rs. 250-/

نام کتاب	مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم
مصنف	مجتبیٰ حسین
مرتب	حسن چشتی
سنِ اشاعتِ اوّل	۲۰۰۴ء
قیمت	۲۵۰ روپے
مطبع	راحیل نسیم پرنٹرس، دہلی۔

Published by
Educational Publishing House
3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (India)
Ph.: 23216162, 23214465 Fax: 91-011-23211540
E-mail:ephdelhi@yahoo.com

انتساب

مایۂ ناز محقق اور عالمِ بے بدل
پروفیسر نثار احمد فاروقی کے نام

عشق میں وصل و جُدائی سے نہیں کچھ گفتگو
قُرب و بُعد اس جا برابر ہے، محبت چاہیے
(میرؔ)

ترتیب

تماشائے اہلِ قلم

●●

تماشائے اہلِ کرم

تماشائے اہلِ ستم

☆☆

مقدمہ

اُردو کی ابتدا کبھی ہوئی ہو مگر اُردو نثر کی سمت و رفتار اُنیسویں صدی سے متعین ہوئی۔ پہلے داستانیں، پھر کہانیاں، پھر ناول اور آخر میں مختصر افسانے کا دور آ گیا۔ مختلف اصناف کے لحاظ سے نئے نئے اسالیب بھی پیدا ہوئے۔ اسی صدی میں اُردو صحافت کا آغاز بھی ہوا اور اچانک اخباروں کا سیلاب سا آ گیا، جن کی تفصیل گارسین دتاسی کے خطبات اور اختر شہنشاہی جیسی کتابوں کے علاوہ ابھی پچھلی نصف صدی میں لکھی ہوئی امداد صابری، محمد عتیق صدیقی اور عبدالسلام خورشید کی تصانیف میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اُردو اخباروں کا صحافتی معیار بہت بعد میں قائم ہوا۔ ابتداء میں کچھ نجی خبریں، مختلف شہروں سے آئے ہوئے مراسلات وغیرہ شائع ہوا کرتے تھے۔ اودھ پنچ اور اودھ اخبار شائع ہونا شروع ہوئے تو مقامی سیاست اور اصلاح معاشرہ کی تحریکوں نے بھی صحافت میں راہ پائی۔ برطانوی سامراج کے زمانے میں حکومت کی پالیسیوں پر کُھلے بندوں تنقید کرنا ممکن نہیں تھا تو طنز و مزاح کے پردے میں گفتگو کی جاتی تھی۔ اس طرح اُردو طنز و مزاح کو بھی آگے بڑھنے کا راستہ مل گیا۔ بیسویں صدی کے دہانے تک آتے آتے اُردو صحافت کا اک معیار بن چکا تھا۔ اس دور میں بہت سے اخبار نکلے جن میں کچھ ابھی دس بیس برس پہلے تک بھی شائع ہو رہے تھے۔ لاہور سے شائع ہونے والے اخباروں میں انقلاب اور زمیندار خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان نے نظم و نثر میں خوب خوب لکھا، انقلاب میں عبدالمجید سالک جیسے کہنہ مشق صحافی تھے۔ اُنھوں نے کالم نگاری کو ایک مستقل فن بنا دیا۔ ''افکار و حوادث'' کے نام سے اُن کا

کالم بہت مقبول تھا جس میں کبھی شائستہ طنز و مزاح کے ایسے نمونے سامنے آتے تھے جن کی ادبی قدر و قیمت بھی تھی۔ رفتہ رفتہ کالم نویسی بھی اُردو صحافت کا ایک ایسا جزو بن گئی جس میں ناگفتنی باتیں کہی جاسکتی تھیں۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد کالم نگاری کو بہت فروغ ہوا، اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ کبھی وہاں فوجی حکومت ہو جاتی تھی اور جمہوریت کی تصویر دھندلی رہتی تھی، اس لیے حکومت پر تنقید یا سیاست کی بدعنوانیوں پر اخباری کالم میں ہی حرف گیری ہوسکتی تھی۔ پاکستان کے مشہور و مقبول کالم نگاروں میں چراغ حسن حسرت، احمد ندیم قاسمی، ابراہیم جلیس، ابن انشا، مشفق خواجہ، عطاء الحق قاسمی، جمیل الدین عالی، مُنّو بھائی، انتظار حسین، نصر اللہ خاں جیسے کئی نام سامنے آتے ہیں۔ ان کے کالموں کی اپنی اپنی خصوصیات تھیں۔ ہندوستان میں اُردو اخبار قومی آواز میں ''گلوریاں'' کے نام سے ایک کالم ہوتا تھا۔ اس میں کبھی طنز و مزاح کی جھلکیاں تو نظر آتی تھیں مگر سیاسی اور معاشرتی موضوعات پر اس کا دائرہ فکر زیادہ وسیع نہیں تھا۔ روزنامہ ملاپ نئی دہلی میں فکر تونسوی ''پیاز کے چھلکے'' لکھا کرتے تھے۔ فکر تونسوی کا لکھنے کا اپنا انداز تھا اس لیے یہ بھی ایک مقبول کالم تھا۔ روزنامہ پیام حیدر آباد میں قاضی عبدالغفار ''سر راہے'' کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔ اُن کی دو مشہور کتابیں ''لیلیٰ کے خطوط'' اور ''مجنوں کی ڈائری'' پہلے اسی کالم میں قسط وار شائع ہوئی تھیں۔ جب حیدر آباد سے اخبار سیاست شائع ہونا شروع ہوا تو اُس میں شاہد صدیقی ''شیشہ و تیشہ'' کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے، اُن کا قلمی نام ''کوہ کن'' تھا۔ ۱۹۶۲ء میں شاہد صدیقی کا انتقال ہو گیا تو اچانک اس کالم کے لکھنے کی ذمہ داری نوجوان صحافی مجتبیٰ حسین کے کندھوں پر رکھ دی گئی۔ شروع میں خود مجتبیٰ کو بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ اُن کا قلم کتنا دم دار اور فکر کتنی پہنادر ہے۔ وہ ''کوہ پیا'' کے قلمی نام سے ''شیشہ و تیشہ'' کی روایت کو آگے بڑھاتے رہے مگر انھیں بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ اُن کی تحریروں کو پسند کیا جارہا ہے۔ ۱۹۶۴ء سے اُنھوں نے اپنے چہرے سے نقاب اتار دیا اور حیدر آباد کے مجاہد اُردو منظور احمد صاحب کی فرمائش پر (جو اُس وقت اُردو مجلس، اُردو ہال حمایت نگر حیدر آباد کے سکریٹری تھے) مجتبیٰ نے اپنے نام سے پہلا مضمون لکھا تھا۔ وہ لگ بھگ پندرہ برسوں تک روزنامہ سیاست کا روزانہ کالم ''کوہ پیا'' کے قلمی نام سے لکھتے رہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے جید اہل قلم نے اُن کی کالم نگاری کو سراہا تھا۔ بعد میں اگست ۱۹۹۳ء سے وہ اپنے نام سے ہی ''میرا کالم'' لکھنے لگے جو نہ صرف سیاست کے

قارئین کا نہایت پسندیدہ کالم رہا ہے بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے اخباروں اور رسالوں میں بھی نقل کیا جاتا رہا ہے۔ ان کی پچھلی بے نامی تحریروں کو فی الوقت شمار نہ بھی کریں تو ۱۹۹۳ء سے اب تک دس سال کی مدت میں اُن کے لگ بھگ ۵۰۰ کالم سیاست میں اور وہاں سے نقل ہو کر برصغیر کے دوسرے اُردو اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُردو اخباروں کے علاوہ اُن کی اکثر تحریریں ہندی پتریکاؤں میں بھی چھپی ہیں اور ہندی والے بھی ان کے نام سے خوب شناسا ہیں۔ ہندوستان کی بعض دوسری علاقائی زبانوں میں بھی مجتبیٰ کی تحریروں کے ترجمے ہوئے ہیں۔ ان کالموں کا ایک انتخاب ''میرا کالم'' ہی کے نام سے جون ۱۹۹۹ء میں حسامی بک ڈپو حیدرآباد سے شائع ہوا جو ۲۹۷ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس میں ۵۶ کالم انتخاب کیے گئے تھے اور اس کتاب کا پیش لفظ زندہ دلان حیدرآباد کے سرخیل ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، ایڈیٹر رسالہ ''شگوفہ'' حیدرآباد نے لکھا تھا۔ اس کتاب کو مجتبیٰ نے تین حصّوں میں تقسیم کیا تھا: (۱) تماشائے اہلِ کرم (۲) تماشائے اہلِ ستم اور (۳) تماشائے اہلِ قلم۔ ہم نے مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں انتخاب کیں تو اُنھیں چار جلدوں میں تقسیم کیا۔ پہلی جلد میں اُن کے مزاحیہ مضامین ہیں، دوسری جلد میں اُن کے لکھے ہوئے خاکے دیے گئے ہیں، تیسری جلد سفرناموں پر مشتمل ہے۔ اب اس چوتھی جلد میں اُن (۷۶) کالموں کا انتخاب کیا گیا ہے جو اس سے پہلے کتابی صورت میں نہیں آئے تھے۔ ان کی بھی وہی ترتیب رکھی گئی ہے۔ تماشائے اہلِ قلم، اہلِ کرم اور اہلِ ستم۔ جس طرح ملک اور بیرون ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں پہلی تین جلدوں کی پذیرائی ہوئی ہے اُسے دیکھتے ہوئے ہمیں پوری امید ہے کہ یہ چوتھی جلد بھی قبول عام کا خلعت حاصل کرے گی۔

مجتبیٰ کی ادبی حیثیت، اُن کا صاف، سادہ، بے ریا، طرازِ اسلوب اور دل سے نکل کر دل پر اثر کرنے والا لب و لہجہ، وسیع مطالعہ اور اس سے بھی زیادہ وسیع اور گہرا مشاہدہ، زندگی کے تلخ و شیریں تجربات، اپنے عہد کے زندہ مسائل سے براہ راست واسطہ، اور دوسری خوبیاں ایسی نہیں ہیں کہ اُن پر دو چار صفحوں میں تبصرہ و تعریف کا حق ادا کیا جا سکے۔ ڈاکٹر جانسن نے ایک بار کہا تھا کہ جو اچھی اور اعلیٰ معیار کی زبان لکھنا چاہتا ہو وہ اپنے دن رات ایڈیسن کو پڑھنے میں لگا دے۔ ایسی ہی بات کلیم الدین احمد نے خواجہ حسن نظامی کے اسلوب نثر کے بارے میں بھی کہی ہے۔ میں تردید و تعریض کے خوف کے بغیر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے عہد میں مجتبیٰ حسین ایسی ہی

سادہ و رنگیں، بامزہ و شیریں نثر لکھتے ہیں جس میں اُن کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ اُن کے اظہار و ابلاغ میں کہیں یہ شبہ بھی نہیں ہوتا کہ انھوں نے اپنی بات کہنے کے لیے کوئی تکلف کیا ہے، یا جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے اُسے اپنے قاری تک پہنچانے میں ناکام رہے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ غیر معمولی محنت کے علاوہ خداداد صلاحیت کے بغیر ممکن نہیں۔ پھر اُن کے موضوعات کو دیکھیے کہ ان میں کتنا تنوّع ہے۔ وہ سیاسی مسائل پر بھی قلم چلاتے ہیں تو ان کی سیاسی سوجھ بوجھ بین السطور سے جھانکتی رہتی ہے۔ معاشرت کی خرابیوں پر لکھتے ہیں مگر کوئی طنز نہیں، کوئی تلخی نہیں، کوئی مناظرانہ انداز نہیں۔ جو کچھ کہتے ہیں وہ براہ راست قاری کے دل و دماغ پر اثر کرتا ہے۔ اُن کی تحریر میں کہیں نہ علمیت کا اظہار ہے نہ وہ بقراطیت کا رعب گانٹھتے ہیں۔ اُن کے اور قاری کے درمیان ہمیشہ ایک سیدھا رشتہ باقی رہتا ہے جس میں کوئی حجاب یا تکلف نہیں ہوتا۔ اسی طرح ادبی موضوعات اور شخصیات پر وہ اعتدال اور سبک روی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ انھوں نے مختلف شخصیات کے جو خاکے لکھے ہیں وہ اُردو میں خاکہ نگاری کا ایک نیا معیار پیش کرتے ہیں۔ اُن کی شرافتِ نفس بھی کبھی ان سے جدا نہیں ہوتی۔ شخصیات کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی کی صرف خوبیوں پر نظر رکھنا اور اُس کے ہنر کو خراجِ تحسین پیش کرنا، اُس کے شخصی معائب اور کمزوریوں سے دامن بچا لینا کوئی آسان کام نہیں، یہ منزلِ دشوار صرف شرافت نفس کے سہارے طے کی جاسکتی ہے۔ اپنے خاکوں میں انھوں نے اگر اپنے تختۂ مشق کی کمزوریوں کا بیان بھی کیا ہے تو اُسے "شکر پوش" کر دیا ہے۔ اس کے بعد مجتبیٰ کے سفرنامے دیکھیے کہ وہ ہمیں ہفت اقلیم کی سیر کرا دیتے ہیں اور ہر جگہ اُنھیں اپنی شوخی و شگفتگی کی تسکین کا سامان مل جاتا ہے۔ خاکے ہوں یا سفرنامے، کالم ہوں یا دوسرے انشائیے مجتبیٰ اُس میں اکثر خود بھی نمودار رہتے ہیں مگر کہیں خود بینی و خود نمائی، انانیت یا اپنی شہرت کی ہوس اور نمود کی خواہش کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ وہ اس تحریر کا جزوِ لازم یعنی مکمل کرنے والا کردار بن کر قاری کے ساتھ رہتے ہیں۔

راقم الحروف نے شروع میں موضوعات کے تنوّع کی بات کہی۔ یہ بھی کوئی کھیل نہیں ہے۔ بھاری پتھر ہے جسے بڑے بڑے سورما چوم کر چھوڑ دیتے ہیں۔ کالم لکھنے والے کے سامنے ضروری نہیں کہ ہر بار کوئی ایسا موضوع ہو جس میں اُس کی قدرتِ تحریر اور ندرتِ خیال کا اظہار ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ دربارِ اودھ نے میر انشاء اللہ خاں انشا کے لیے روز ایک نیا لطیفہ سنانے کی

قید لگا دی تھی تو کچھ ہی دنوں کے بعد وہ کھو کھلے ہو گئے تھے۔ جب قلم پوری طرح کسی کے قابو میں آجاتا ہے اور اسلوب ہاتھ باندھ کر اُس کے پیچھے دور باش کہتا ہوا چلنے لگتا ہے تو موضوعات بھی اس کی خدمت میں صف بست حاضر رہتے ہیں۔ مجتبیٰ کو شاید خود بھی احساس نہ ہو کہ وہ اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں اُنھیں کسی موضوع کی احتیاج نہیں۔ وہ موضوع کے بغیر بھی اپنی بات کہہ سکتے ہیں، موضوع نہ ہو تو اُسے پیدا کر سکتے ہیں۔ عام آدمی کی نظر جن باتوں کا مشاہدہ نہیں کر سکتی یا جس منظر کو دیکھتی ہے اُس کی صرف بالائی سطح میں الجھ کر رہ جاتی ہے وہاں مجتبیٰ کی نظر اُس منظر کی تہ میں اتر جاتی ہے اور ہمیں اُس کی وہ شکل دکھاتی ہے جس سے عام حالت میں ہم غافل ہوتے ہیں۔ کسی بھی اخبار کی عمر ایک دو دن سے زیادہ نہیں ہوتی مگر مجتبیٰ کی یہ تحریریں اخبار کی عمر کے ساتھ بندھی ہوئی نہیں ہیں۔ یہ اب ہمارے ادب کا حصہ بن چکی ہیں۔ انھیں ہمیشہ پڑھا جائے گا اور پسند کیا جائے گا۔ میں پورے برصغیر کے بارے میں تو نہیں کہتا اس لیے کہ طنز و مزاح کے شاہ ولایت مشتاق احمد یوسفی ماشاء اللہ حیات ہیں، (اللہ تعالیٰ انھیں طویل عمر عطا کرے)، مشفق خواجہ اور عطاء الحق قاسمی جیسی دیو قامت شخصیات کے قلم بھی رواں ہیں، وہاں مجتبیٰ حسین بھی برصغیر کے ممتاز مزاح نگاروں اور کالم نگاروں کی صف میں سامنے ہی بیٹھے نظر آرہے ہیں۔ مگر ہندوستان میں تو اب اُردو طنز و مزاح کالم نگاری، انشائیہ اور فکاہیہ سارے میدانوں میں بقول غالب **لِمَنِ المُلک الیوم** کا ڈنکا بجا رہے ہیں۔ مجتبیٰ کی شوخی، شگفتگی اور شادابی پر آج تک کمھلاہٹ کا اثر نہیں آیا ہے۔ ہماری اور ان کے سب چاہنے والوں کی یہی دعا ہے کہ وہ خوب طویل عمر پائیں، بوڑھے ہو جائیں مگر اُن کا قلم اسی طرح جوان رہے۔ ذہن یونہی رسا رہے، وہ خوش رہیں اور سب کو خوشیاں بانٹتے رہیں۔

مجتبیٰ حسین نے ہماری درخواست کو منظور کرتے ہوئے اپنی تحریروں کا انتخاب شائع کرنے کی منظوری دی اور دو جلدیں منظر عام پر آگئیں۔ اس کے بعد وہ مزید جلدوں کے لیے ہچکچا رہے تھے اور یہی کافی سمجھتے تھے کہ دو جلدیں سامنے آگئیں۔ مگر انھیں تیسری اور اس چوتھی جلد کے لیے راضی کرنے میں پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ہماری بہت مدد کی، جو مجتبیٰ حسین کے پرانے دوست اور قدر دان ہیں۔ مجتبیٰ حسین پروفیسر فاروقی کے علم و فضل کے بے پناہ معترف ہیں اور پروفیسر فاروقی مجتبیٰ حسین کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ فاروقی صاحب کا خیال تھا کہ مجتبیٰ کے فن کو پوری طرح سمجھنے

کے لیے اُن کی تحریروں کے سب نمونے انتخاب ہونے چاہئیں۔ اُن کے اصرار پر مجتبیٰ نے بھی سرِتسلیم خم کردیا۔ اس کے علاوہ بھی ان جلدوں کی تیاری میں ہمیں فاروقی صاحب سے مفید مشورے ملتے رہے، جس کے لیے ہم اُن کے تہِ دل سے شکرگذار ہیں۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کے سربراہ محمد مجتبیٰ خاں بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے پچھلی تین کتابوں کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اس چوتھی جلد کو بھی نہایت اہتمام سے شائع کیا اور نفیس اور دیدہ زیب طباعت کے معیار کو برقرار رکھا۔ مجتبیٰ حسین کے دفتر کے پرانے ساتھی عظیم الدین صدیقی کا شکریہ کہ انھوں نے انتظامی امور میں مدد کرنے کے علاوہ کتاب کی پروف ریڈنگ میں بھی مدد کی۔

(حسن چشتی)

۲۰ رنومبر ۲۰۰۳ء

7033- N Kedzie # 112
CHICAGO IL 60645
U.S.A.

☆☆

تماشاے اہلِ قلم

جگن ناتھ آزاد کا اعمال نامہ

ماہر اقبالیات، شاعر، نقاد، محقق، دانشور، مقرر اور استاد کی حیثیت سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد وہاں وہاں بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں جہاں جہاں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ وہ ہمارے بزرگ اور کرم فرما ہیں بلکہ زندگی میں پہلی بار ہم نے جس شاعر کو اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ دیکھا وہ جگن ناتھ آزاد ہی تھے۔ ان کے علمی اور ادبی کارناموں کا احاطہ کرنا ہمارے بس کی بات تو کجا شاید خود ان کے بس کی بات بھی نہ ہو۔ پچھلے دنوں ہمیں ایک انگریزی کتاب ملی ہے جس کا عنوان ہے A JAGAN NATH AZAD CHRONOLOGY۔ قارئین کی سہولت کے لیے ہم نے اس کا آسان اُردو ترجمہ "جگن ناتھ آزاد کا اعمال نامہ" کیا ہے۔ ان کا یہ اعمال نامہ بھی ان کی تصانیف کی طرح خاصا ضخیم ہے۔ اس میں جگن ناتھ آزاد کی پیدائش (۵ / دسمبر ۱۹۱۸) سے لے کر آج تک ان کے علمی اور ادبی کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ بخدا ہم نے بھی ابھی حال ہی میں محض اس خیال سے کہ اب ہم اپنی تاریخ پیدائش سے کافی دور نکل آئے ہیں اور تاریخ وفات کی آمد آمد ہے، اپنا اعمال نامہ مرتب کیا ہے۔ یقین مانیے دو ہی صفحوں کے بعد ہمارے اعمال نامہ کی سانس اُکھڑ گئی بلکہ ایک دوست نے دو صفحات پر مشتمل اس اعمال نامہ کو بھی طویل قرار دیتے ہوئے یہاں تک کہا کہ "میاں تم صرف اپنی تاریخ پیدائش لکھ دیتے تو کافی تھا۔ تاریخ وفات تو ہم بعد میں بڑھا لیں گے، وہ بھی اس لیے کہ اس وقت تم موجود نہ رہو گے۔ تاریخ پیدائش سے لے کر آج تک تم نے جو کچھ کیا ہے اور تاریخ وفات تک جو کچھ کرو گے وہ ایسا

کام تو ہے نہیں کہ اس کے ذکر سے آنے والے زمانہ کے سینہ پر مونگ دلنے کا کام کیا جائے"۔

بعض لوگ بزعم خود اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ آنے والا مورخ پیدا ہی اس لیے ہوگا کہ وہ ان کے کارناموں کا جائزہ لے سکے۔ ہم اپنا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں کرتے ہیں، مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے کارناموں کے حوالہ سے آنے والی تاریخ کے لیے ایک اثاثہ بن جاتے ہیں اور ان کا ذکر آنے والے وقت کو چیرتا ہوا آگے ہی آگے نکلتا چلا جاتا ہے۔ بلاشبہ جگن ناتھ آزاد کا شمار بھی ہمارے ادب کی ایسی ہی ہستیوں میں ہوتا ہے جو پیدا ہوتے ہی کچھ ایسے کام کرنے لگ جاتے ہیں کہ تاریخ انہیں ہمیشہ یاد رکھے۔ ماشاء اللہ جگن ناتھ آزاد کا اعمال نامہ پورے سو صفحوں پر مشتمل ہے اور اس کے مرتب ڈاکٹر اسد اللہ وانی ہیں (اسد اللہ وانی نے جس محنت، مشقت اور عرق ریزی کے ساتھ جگن ناتھ آزاد کا اعمال نامہ مرتب کیا ہے وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو خود ڈاکٹر اسد اللہ وانی کے شخصی اعمال نامہ کو بھاری بھرکم اور وقیع بناتا ہے)۔ اسی اعمال نامہ کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلا کہ جگن ناتھ آزاد کی ساٹھ سے زیادہ تصانیف اور تالیفات ہیں۔ انہیں جو اعزازت اور انعامات ملے ہیں ان کی تعداد ۱۵۷ ہے۔ انھوں نے دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں جو توسیعی خطبات دیے ہیں اُن کی تعداد ۶۷ ہے۔ ان کے علاوہ انہوں نے مختلف اداروں اور سیمناروں میں جو مقالات پڑھے ہیں ان کی تعداد ۲۱۶ ہے۔ ہندوستان کے علاوہ انھوں نے بیرونی ممالک کے جن ریڈیو اسٹیشنوں اور ٹیلی ویژن مراکز پر اپنے متعدد پروگرام پیش کیے ہیں ان کی تعداد ۳۲ بنتی ہے۔ مشاعروں میں تو وہ آئے دن شرکت کرتے رہتے ہیں اور ان کی تعداد یقیناً ہزاروں میں ہوگی لیکن پھر بھی جن اہم مشاعروں میں انھوں نے شرکت کی ہے ان کی تعداد صرف ۱۱۵ بتائی گئی ہے (کفایت شعاری کی بھی ایک حد ہوتی ہے)۔ جگن ناتھ آزاد نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ تو اپنی جگہ پر ہیں ہی لیکن ان کتابوں کی وجہ سے دوسروں کی جو مزید کتابیں وجود میں آئی ہیں، یعنی خود جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور فن پر جو کتابیں لوگوں نے لکھی ہیں اور مختلف رسالوں نے جو خصوصی نمبر شائع کیے ہیں، اُن کی تعداد بھی ایک درجن سے زیادہ ہے۔ تفصیلات تو خیر اور بھی بہت سی ہیں۔ ہم نے اوپر جتنی باتیں لکھی ہیں وہ اس اعمال نامہ کی صرف موٹی موٹی باتیں ہیں اور خود ڈاکٹر اسد اللہ وانی نے بھی اس ضخیم اعمال نامہ میں صرف موٹی موٹی باتوں سے ہی مطلب رکھا ہے۔ اگر وہ مزید باریکیوں میں جاتے جس کے ہم عادی ہیں تو اس

اعمال نامہ میں جگن ناتھ آزاد کے ان مدّاحوں اور عقیدت مندوں کی فہرست بھی شائع کی جاسکتی تھی جن کی تعداد لاکھوں میں جائے گی۔ انہیں مشاعروں میں بے پناہ داد کے علاوہ جو معاوضہ ملا ہوگا اس کا تخمینہ بھی پیش کیا جاسکتا تھا۔ جگن ناتھ آزاد نے اپنے احباب کو جو خطوط لکھے ہیں ان کی فہرست بھی مرتب کی جاسکتی تھی (خود ہمارے پاس جگن ناتھ آزاد کے سو سے زیادہ خطوط محفوظ ہیں)۔ غرض اور بھی کئی باتیں ہیں جن کا ذکر اس اعمال نامہ میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اسد اللہ دوانی کی کچھ مجبوریاں بھی رہی ہوں گی، اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ تب ہی تو وہ تفصیل میں نہیں گئے۔ تاہم ہمیں ایک شخصی شکایت یہ ہے کہ اس اعمال نامہ میں اس کل ہند مشاعرہ کا کوئی ذکر نہیں ہے جسے ہم نے ۱۹۵۲ میں گلبرگہ میں منعقد کیا تھا۔ ان دنوں ہم گلبرگہ کے انٹرمیڈیٹ کالج کی بزم اُردو کے جنرل سکریٹری تھے اور اس مشاعرہ کی صدارت قبلہ جگن ناتھ آزاد نے ہی فرمائی تھی۔ گلبرگہ کی تاریخ کا بلکہ دیکھا جائے تو خود ہماری شخصی تاریخ کا یہ پہلا بڑا مشاعرہ تھا جس میں مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، شاہد صدیقی، سلیمان اریب، لطیف ساجد اور عزیز قیسی وغیرہ نے شرکت کی تھی۔ ہم نے نہ صرف جگن ناتھ آزاد کو بلکہ اُردو کے شاعروں کو بھی پہلے پہل وہیں دیکھا تھا۔ اس مشاعرہ کو ہم نے کتنی مشکلوں سے منعقد کیا تھا اس کا اندازہ اسد اللہ دوانی کو تو خیر کیا ہوگا لیکن جگن ناتھ آزاد کو تو ہونا چاہئے تھا۔ پھر اس مشاعرہ کی صدارت بھی تو ہم نے اُن سے کروائی تھی۔ اگرچہ اس زمانہ کے کلکٹر گلبرگہ اقبال چند اس مشاعرہ کے سرپرست تھے لیکن اس مشاعرہ کے اخراجات کی پابجائی کے لیے گلبرگہ کے اہل علم اور مخیّر حضرات سے چندہ مانگنے کا کام تو ہم نے اور ہمارے ساتھیوں نے انجام دیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے کے ایس شفیق صاحب کی کتاب ''یادوں کی رہ گزر'' پڑھی تو اندازہ ہوا کہ ان دنوں وہ بھی گلبرگہ کے لیبر آفیسر کے عہدہ پر فائز تھے۔ یقیناً انھوں نے بھی چندوں کی وصولی میں ہماری مدد کی ہوگی۔ اب ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ یوں بھی لیبر آفیسر چندوں کی وصولی کے معاملہ میں بڑے کارآمد ہوتے ہیں۔ اس یادگار مشاعرہ کے ذکر کو جگن ناتھ آزاد کے اعمال نامہ مین نہ پاکر ہمیں اس لیے بھی تکلیف ہوئی کہ ان کے عام اعمال نامہ کے ہمارے ذاتی اعمال پر گہرے اور دوررس اثرات مرتب ہوئے تھے کیونکہ اس مشاعرہ کے بعد ہی ہم نے نہ صرف چندہ مانگنے سے بلکہ احباب سے اُدھار مانگنے سے بھی توبہ کرلی تھی۔ یہ اسی مشاعرہ کا فیض ہے کہ مالی مشکلات اور وسائل کی تنگی کے باوجود آج بھی ہم ایک باعزت زندگی گزار رہے

ہیں۔ دوسری طرف اس مشاعرہ کی وجہ سے ہمیں شعر و ادب کا ایسا چسکہ لگا کہ آج تک اس سے نجات نہ پا سکے۔ اس کے بعد کئی برسوں تک جگن ناتھ آزاد، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی اور سلیمان اریب وغیرہ کے شعر گنگنانا اور وہ بھی خاص طور پر غسل کرتے وقت گنگنانا، ہمارا محبوب مشغلہ بن گیا۔

یوں جگن ناتھ آزاد سے ہمارا سمبندھ خاصا پرانا ہے۔ پھر دہلی آنے کے بعد تو ان سے ایک طرح کے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ یہ ان کی بڑائی نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ چھوٹوں کو بھی اپنا دوست ہی سمجھتے ہیں۔ جب تک وہ سری نگر میں حکومت ہند کے ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن افیسر رہے، یہ معمول سا بن گیا تھا کہ وہ جب بھی دہلی آتے (جو وہ اکثر آتے رہتے تھے) تو پہلے سے ہمیں اطلاع دے دیتے تھے کہ فلاں تاریخ کی شام تمہارے لیے خالی رکھی ہے، کشمیر گیسٹ ہاؤس پر چلے آنا۔ اگر ہم ان شاموں کی تفصیل ہی اختصار کے ساتھ جمع کر دیں تو ان کے اعمال نامہ میں مزید پچاس ساٹھ صفحات کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ آزاد صاحب ہم سے کم و بیش سولہ برس بڑے ہیں۔ شروع ہی سے وہ ہمیں عزیز رکھتے آئے ہیں۔ ان کی صحبت میں وقت کچھ ایسی تیزی سے گزر جاتا ہے کہ آدمی کو چٹکی بجانے کی مہلت بھی نہیں دیتا۔ انھوں نے دنیا کو ہر زاویہ سے دیکھا ہے۔ ادب کی کیسی کیسی عظیم ہستیوں سے ان کا سابقہ رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اب ہم جیسوں کی صحبت میں گزارہ کرنے پر مجبور ہیں۔ بلاشبہ انھیں اپنے اور اساتذہ کے لاکھوں اشعار یاد ہیں، کتنے ہی لطیفے ہیں جنھیں ہم نے آزاد صاحب کی زبان سے ہی سنا۔ وہ ہمارے ادب کی ایک ایسی متاع عزیز ہیں جس پر ہم سب کو فخر کرنا چاہیے۔ اقبالیات کے ماہر کی حیثیت سے ان کا ڈنکا چہار دانگ عالم میں بجتا ہے۔ یہ جگن ناتھ آزاد ہی ہیں جنھوں نے اپنی تحقیق کے ذریعہ ایسے حالات پیدا کیے کہ علامہ اقبال ۹ رنومبر ۱۸۷۷ کو اس دنیا میں پیدا ہو سکے ورنہ اس سے پہلے لوگوں نے علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش ۲۲ رفروری ۱۸۷۳ مقرر کر رکھی تھی۔ مانا کہ جگن ناتھ آزاد کی تحقیق سے علامہ اقبال کی عمر میں اچانک چار برسوں کی کمی واقع ہو گئی لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ جگن ناتھ آزاد نے بھلے ہی علامہ اقبال کا عرصۂ حیات تو تنگ کیا لیکن اس کمی کے باوجود ان کے شعری سرمایہ اور ان کی قدر و منزلت میں کوئی کمی واقع نہ ہونے دی۔ اقبال کے وہ سچے عاشق ہیں، تبھی تو ہر دم اپنی خودی کو اتنا بلند کیے رکھتے ہیں کہ ہم جیسوں کو ان سے گڑگڑا کر پوچھنا پڑتا ہے کہ آخر ان کی رضا کیا ہے۔ ان کی حسِ

مزاں بھی نہایت تیز ہے۔ایک بار ہم۔نے یونہی کہیں لکھ دیا کہ اگر علامہ اقبال ''حکیم الامّت'' تھے تو ہوا کریں ہمیں کم ازکم ''نیم حکیم الامّت'' ہی تسلیم کر لیجئے۔چنانچہ اب وہ ہمیں ''نیم حکیم الامّت'' ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔جگن ناتھ آزاد اب ماشاء اللہ ۸۰ برس کے ہونے والے ہیں لیکن ہم نے ان میں کام کرنے کی جو توانائی اور لگن دیکھی وہ خود ہم اپنے میں نہیں پاتے۔وہ ہمارے ادب کا ایک ایسا قیمتی اثاثہ ہیں جس کی جی جان سے حفاظت کرنا ہم سب کا فرض ہے اور انھیں بجا طور پر اپنے کارناموں پر فخر کرنے کا حق پہنچتا ہے۔اس اعمال نامہ کو پڑھ کر ہمیں ان کے بارے میں کئی نئی معلومات بھی حاصل ہوئیں۔مثلاً یہ کہ وہ جب میانوالی (پاکستان) میں چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے تو انھوں نے خوشی محمد ناظر کی طویل نظم ''جوگی'' زبانی سنائی تھی۔اس سے متاثر ہو کر راولپنڈی کے انگریز انسپکٹر آف اسکولز مسٹر ولسن نے انھیں ایک روپیہ بطور انعام دیا تھا (گویا بچپن ہی سے انھیں اعزازات حاصل کرنے کا شوق رہا ہے)۔پھر اس کے دو سال بعد جب وہ نو برس کے تھے تو انھوں نے ایک مشاعرہ میں اپنے والد محترم تلوک چند محروم کی نظم ''ہندو مسلمان'' سنائی تھی۔اس نظم کو موثر ڈھنگ سے پیش کرنے پر انھیں جو انعام ملا تھا ویسا انعام آج تک کسی اور شاعر کو نہیں ملا۔اعمال نامہ کے مطابق انھیں ایک نہایت قیمتی ''لنگی'' بطور انعام دی گئی تھی جس کی رائج الوقت قیمت اُن دنوں پندرہ روپے تھی۔(آج کے ڈیڑھ ہزار روپے فرض کر لیجئے) لیکن افسوس کہ جگن ناتھ آزاد اس لنگی کو استعمال نہیں کر سکے کیونکہ وہ شروع ہی سے پٹھانی سوٹ پہننے کے عادی رہے ہیں۔ہمارے ہاں انعاموں میں ہمیشہ یہ گھپلا ہوتا ہے کہ انعام پانے والے کی پسند اور ناپسند کو نظر میں نہیں رکھا جاتا۔برخلاف اس کے ہمیں بھی کچھ عرصہ پہلے بطور اعزاز ایک شال پیش کی گئی تھی۔شال ہم نے کھولی تو دیکھا کہ یہ ایک جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔منتظمین سے شکایت کی تو بولے'' جناب! شال پر نظر ڈالنے سے پہلے ذرا اپنی خدمات پر بھی تو نظر ڈال لیجئے۔جیسی خدمات ہیں ویسی ہی شال بھی دی گئی ہے''۔اسی اعمال نامہ سے اندازہ ہوا کہ جگن ناتھ آزاد جتنی مرتبہ پاکستان گئے ہیں اتنی مرتبہ تو ہم دہلی سے حیدرآباد بھی نہیں گئے ہونگے۔ڈاکٹر اسداللہ وانی نے جگن ناتھ آزاد کا جو اعمال نامہ مرتب کیا ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ اس سے کراماً کاتبین کا کام خاصا آسان ہو گیا ہے۔جو کام اصولاً کراماً کاتبین کو کرنا چاہیے تھا وہ کام ڈاکٹر اسداللہ وانی نے انجام دے دیا ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' (جون ۱۹۹۸ء)

☆☆

کچھ شاہد علی خاں کے بارے میں

ماہنامہ ''کتاب نما'' کے مدیر اور مکتبہ جامعہ دہلی کے جنرل منیجر شاہد علی خاں بھی پچھلے دنوں ''انعام یافتہ'' بن گئے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو انعام حاصل کرنے کو ہی اہم کام سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کام کو ہی سب سے بڑا انعام سمجھتے ہیں۔ شاہد علی خاں کا شمار موخرالذکر لوگوں میں ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ سنتے تو سب کی تھے لیکن کام اپنا ہی کیے جاتے تھے لیکن ادھر جب سے ان کی سماعت کسی قدر متاثر ہوئی ہے تب سے وہ کام میں کچھ زیادہ ہی ڈوبتے چلے جارہے ہیں۔ اب وہ یا تو کہنے والے کی بات کو سنی ان سنی کر دیتے ہیں یا پھر بالکل ہی نہیں سنتے، ہر دم کام میں لگے رہتے ہیں۔ اگر آپ سلام کے بعد ان کی خیریت پوچھیں تو جواب ملے گا ''جی ہاں! اس بار 'کتاب نما' کی پوسٹنگ میں تین دنوں کی تاخیر ہوگئی۔'' آپ پوچھیں گے ''اس بار رمضان میں کتنے روزے رکھے؟'' تو جواب ملے گا ''ذرا مکتبہ جامعہ کی اسٹاک ٹیکنگ Stock Taking ہو جانے دیجئے پھر بتاؤں گا۔'' غرض ان سے تبادلہ خیال کے نتیجہ میں دونوں فریقوں کی طرف سے ادا ہونے والے جملوں کو اگر آپ ہو بہو کاغذ پر منتقل کر دیں تو بخدا کسی کامیاب نثری نظم کا لطف آجائے۔ برسوں کے تعلقات کی وجہ سے ہمیں تو خیر ان کی کمزوری کا اندازہ ہے اسی لئے جب بھی ان کے ہاں جاتے ہیں تو گلے میں خضاب لگا کے جاتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے ہفتہ شاہد علی خاں کو ''ہارمونی ایوارڈ'' کے ملنے کی اطلاع دینے کی غرض سے جب ہم ان کے ہاں گئے تو اتفاق سے ہمارے ساتھ ہمارے حیدرآبادی دوست سید عبدالقدوس ایڈوکیٹ بھی تھے جو اسی

دن حیدرآباد سے دہلی آئے تھے۔ (قدوس میاں کی عادت ہے کہ جب بھی دہلی آتے ہیں تو مکتبہ جامعہ سے خاصی اُردو کتابیں خریدتے ہیں) جو لوگ عبدالقدوس سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ قدرت نے انہیں ایسی پاٹ دار آواز عطا کی ہے کہ اگر وہ دوسو گز کی دوری پر کسی کے کان میں راز کی کوئی بات کہہ دیں تو آپ کے کان بھی راز کی اس بات کو آسانی سے سن سکتے ہیں۔ ان کی آواز میں جو اٹھان اور بلند آہنگی ہے اس کے باعث مشہور ہے کہ وہ کسی کی حمایت میں بھی آواز بلند کرتے ہیں تو لگتا ہے اس کے خلاف آواز اُٹھا رہے ہیں۔ ایسی آواز وکالت کے پیشہ میں بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا استدلال جہاں نہایت قانونی ہوتا ہے وہیں ان کی آواز غیر قانونی سی لگتی ہے۔ بہر حال سید عبدالقدوس کے ہمراہ جب ہم نے شاہد علی خاں کو انعام ملنے کی اطلاع دی تو بے پناہ خوش ہوئے۔ جس والہانہ انداز سے انہوں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا اس سے ہمیں تو اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ انعام اُنہیں نہیں بلکہ ہمیں ملا ہے۔ پھر انہوں نے انعام کی رقم ہم سے پوچھی اور اس رقم کو جاننے کے بعد مزید اظہارِ مسرت کرنا ہی چاہتے تھے کہ قدوس نے کہا ''شاہد صاحب! آپ کی اُردو خدمات کے مقابلہ میں یہ رقم تو کچھ بھی نہیں ہے''۔ حیرت سے بولے ''میری اُردو خدمات کا اس انعام سے کیا تعلق ہے؟''۔ قدوس نے کہا ''یہ انعام آپ ہی کو تو ملا ہے۔'' چہرے پر تردّد کے آثار نمایاں کرتے ہوئے اور اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولے ''مگر میں کس طرح انعام کا حقدار ہو سکتا ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ کسی بات پر اپنے دفتر کے کسی ملازم سے ناراض ہوئے تو ناراض ہوتے ہی چلے گئے اور اُس وقت تک ناراض ہوتے رہے جب تک کہ ہم وہاں سے اٹھ کر نہیں آ گئے۔ شاہد علی خاں اُن لوگوں میں سے ہیں جن کی خدمات کا اعتراف چاہے زمانہ کر لے لیکن خود شاہد علی خاں اپنی خدمات کو یہ اعزاز نہیں بخشتے۔ گرمی ہو یا سردی، آندھی ہو یا طوفان، کام کا دن ہو یا چھٹی کا دن ان کی خدمات ہمیشہ جاری و ساری رہتی ہیں۔ میز پر مضامین کا انبار لگا ہوا ہے، خطوط کے پلندے بندھے ہوئے ہیں، کتابوں کے پروفس رکھے ہوئے ہیں، جا بجا کاغذات کا ڈھیر ہے۔ ان کے کام کرنے کی میز کو اگر کوئی دیکھ لے تو اسے اندازہ ہو گا کہ انتشار میں تنظیم، بکھراو میں ٹھہراو پیدا کرنے کا نام ہی اُردو کی خدمت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے انتشار میں اُردو کی خدمت کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ شاہد علی خاں سے لگ بھگ تیس برس پہلے بمبئی میں ہماری ملاقات ہوئی تھی جب وہ مکتبہ جامعہ کی

بمبئی برانچ کے منیجر تھے۔ وہاں بھی ان کا وہی حال تھا، وہی بے ترتیبی میں ایک ترتیب اور وہی بکھراؤ میں ایک رچاؤ، وہ اسی کو اُردو تہذیب بھی کہتے ہیں۔ اُردو میں ایسی بے لوث خدمت کرنے والے اب کم ہی پائے جاتے ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ اُردو کے سارے ادیبوں سے تعلق رکھنے کے باوجود ان کا تعلق ادیبوں کے کسی گروہ سے نہیں ہے۔ ''کتاب نما'' اور ''پیام تعلیم'' کے مدیر کی حیثیت سے بھی ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اُردو کے سارے گروہوں کی نمائندگی ان کے رسالوں میں تو ہو لیکن ان کے رسالے کسی گروہ کے ترجمان نہ بن جائیں۔ اس مقصد کے لئے ہر ماہ وہ ایک ''مہمان مدیر'' کو پکڑ کر لاتے ہیں (اُردو صحافت میں ''مہمان مدیر'' کی ایجاد کا سہرا بھی شاہد علی خاں کے سر جاتا ہے)۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ ''مہمان مدیر'' کے ساتھ وہ وہی سلوک کرتے ہیں جو ہم عموماً اپنے گھر آنے والے کسی مہمان کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ یعنی اس کی سرگرمیوں پر غیر محسوس ڈھنگ سے نظر بھی رکھتے ہیں۔ آپ نے اس مہمان کا قصہ تو سنا ہوگا جو کسی سے ملنے گیا تو میزبان نے گرم گرم سموسے اس کی خدمت میں پیش کرنے شروع کر دیئے۔ مہمان جیسے ہی ایک سموسہ کھا لیتا، میزبان فوراً اس کی پلیٹ میں دوسرا سموسہ ڈال دیتا۔ جب مہمان پانچ چھ سموسے کھا چکا اور ایک مرحلہ پر میزبان نے اس کی پلیٹ، میں ایک اور سموسہ ڈالنے کی کوشش کی تو مہمان نے کہا ''حضور! اب بس بھی کیجئے۔ کتنے سموسے کھاؤں گا، پانچ سموسے تو کھا چکا ہوں۔'' اس پر میزبان نے کہا ''حضور! ویسے تو آپ نے چھ سموسے کھائے ہیں لیکن ایک اور سموسہ لیجئے۔ تکلف نہ کیجئے۔'' مانا کہ شاہد علی خاں ایک اچھے میزبان کی طرح بھلے ہی سموسوں کا حساب نہ رکھتے ہوں لیکن جب ''مہمان مدیروں'' کے اداریوں پر ''کتاب نما'' میں بحث شروع ہوتی ہے تو یہ پتہ ضرور چل جاتا ہے کہ مہمان مدیر نے کتنے سموسے کھائے ہیں۔

شاہد علی خاں بچوں کے مقبول ماہنامہ ''پیام تعلیم'' کے مدیر بھی ہیں اور اُردو میں بچوں کے ادب کو فروغ دینے کے معاملے میں ہر دم سنجیدہ رہتے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ ہم جیسوں کی بچکانہ تحریروں کے لئے تو ''کتاب نما'' کے صفحے موجود ہیں لیکن ''پیام تعلیم'' میں ایسی تحریریں چھپنی چاہئیں جن سے واقعی بچوں کی تربیت ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ''کتاب نما'' کے مقابلہ میں ''پیام تعلیم'' کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ یادش بخیر! ہمارے ایک دوست بچوں کا ایک رسالہ نکالا کرتے تھے لیکن خود اپنے بچوں کو جس طرح ڈانٹتے، ڈپٹتے اور پیٹتے تھے اس سے اندازہ

ہوتا تھا کہ وہ بچوں کا رسالہ نکالنے کے بالکل اہل نہیں ہیں۔ جب کہ شاہد علی خاں کو بچوں سے واقعی محبت ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ بچے ''پیام تعلیم'' کو پڑھ کر نہ صرف اپنا مستقبل سنواریں بلکہ مہذب اور شائستہ بن جائیں، یہی وجہ ہے کہ جب بھی ہمیں کوئی مہذب اور شائستہ بچہ نظر آتا ہے تو ہم اس سے یہ ضرور پوچھ لیتے ہیں کہ کہیں وہ ''پیام تعلیم'' کا خریدار تو نہیں ہے۔ بچوں سے شاہد علی خاں کی محبت کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب چھ سات مہینے پہلے مکتبہ جامعہ کے رکشاران نعمت کا چار سالہ بیٹا اپنے باپ کے پاس کچھ عرصہ رہنے کے لئے بہار کے کسی گاؤں سے دہلی آیا۔ وہ بہار کی کسی مقامی بولی میں بات چیت کرتا تھا لیکن شاہد علی خاں نے اسے اُردو اور اُردو تہذیب سے واقف کرانے کا بیڑہ اُٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تین چار مہینوں میں وہ اُردو تہذیب سے اتنا واقف ہو گیا کہ اس نے شاہد علی خاں کو اپنا دادا بنالیا اور ان کے ملنے والوں کو حسبِ عمر چچا، تایا، انکل وغیرہ بنانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مکتبہ جامعہ کا ایک اہم کردار بن گیا اور مکتبہ میں اس کی اہمیت خود شاہد علی خاں سے بھی کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ وہ اکثر شاہد علی خاں کی گود میں بیٹھا رہتا اور نت نئی فرمائشیں کرنے کے علاوہ دلچسپ باتیں بھی کرتا جاتا۔ رات کو بھی وہ ان ہی کے پاس سو جاتا تھا۔ ایک دن وہ ہمیں مکتبہ جامعہ کے گیٹ پر مل گیا تو اس نے حسب معمول بہ آواز بلند ہمیں سلام کیا (شاہد علی خاں کی وجہ سے اسے ہر ایک سے بہ آواز بلند بات کرنے کی عادت ہو گئی تھی)۔ پھر مخصوص انداز میں ہماری خیریت پوچھنے لگا، ہم نے پوچھا ''شمشیر علی! تمہارے دادا اس وقت کیا کر رہے ہیں؟'' بولا ''وہی ہاتھ میں قلم لے کر کاغذوں کے پلندوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔'' ہم نے اسے ٹوکا کہ میاں شمشیر کوئی تم سے ایسا سوال کرے تو تمہیں اس طرح جواب نہیں دینا چاہئے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ''دادا اس وقت اُردو کی خدمت کر رہے ہیں۔'' اس کے بعد جب بھی وہ ہمیں ملتا اور ہم اس سے یہ سوال کرتے تو فوراً جواب دیتا ''دادا اُردو کی خدمت کر رہے ہیں''۔ ایک دن ہم مکتبہ گئے تو وہ پھر ہمیں صحن میں مل گیا۔ ہم نے پوچھا ''تمہارے دادا کیا کر رہے ہیں؟'' روتے ہوئے بولا ''وہ اُردو کی خدمت نہیں کر رہے ہیں کیونکہ انہیں کل سے بہت تیز بخار ہے، آپ لوگ خود اُردو کی خدمت کیوں نہیں کرتے، میرے دادا سے کیوں خدمت کرواتے ہیں''

اس کی بات کو سن کو ہم ہنسنے لگے تو غصہ سے بولا ''میرے دادا کی طبیعت خراب ہے اور آپ ہنس رہے ہیں، میں آئندہ سے دادا کو اُردو کی خدمت نہیں کرنے دونگا''

پچھلے مہینہ شمشیر علی اپنے 'دادا' کے پاس چار مہینوں تک رہنے کے بعد اپنے گاؤں واپس جانے لگا تو زاروقطار رو رہا تھا۔ پچھلے ہفتہ ہم نے شاہد علی خاں سے اس کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے "وہ اب اپنے آبائی گاؤں میں رہنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہے۔ وہ بہت جلد واپس آجائے گا کیونکہ ہمارے بغیر وہ وہاں نہیں رہ سکتا"

ہم نے کہا "مجھے تو لگتا ہے کہ آپ بھی اس کے بغیر یہاں نہیں رہ سکتے"

یہ سنتے ہی وہ اُردو کی خدمت میں مصروف ہو گئے اور کسی بات پر مکتبہ کے ایک ملازم کو ڈانٹنے لگے۔ اپنی ناگواری کو چھپانے کا یہ ان کا پرانا اسٹائل ہے۔ اُردو والوں کی یہ خوش بختی ہے کہ نفسا نفسی کے اس دور میں شاہد علی خاں جیسا بے لوث اور بے نیاز انسان ہمارے درمیان موجود ہے۔

روزنامہ "سیاست" (۲۴ر مئی ۱۹۹۸ء)

ایک خاندان، ستّر برس اور اُردو ادب

۲۵ را کتوبر ۱۹۹۸ء کو ابراہیم جلیس کو اس دنیا سے رخصت ہوئے پورے اکیس برس بیت جائیں گے اور یہ ایک اتفاق ہے کہ پچھلے ہفتہ ہم اقبال متین کی کتاب "سوندھی مٹی کی خوشبو" کی ورق گردانی کر رہے تھے (جو ہم اکثر کرتے رہتے ہیں) تو ہماری نظر اُن کی کتاب میں لکھے ہوئے ان جملوں پر پڑی۔ "تقسیم ملک سے قبل لکھنے والوں میں ابراہیم جلیس نے اُردو فکشن کو بہت کچھ دیا جو ہر طرح ناقابلِ فراموش ہے۔ میرا حیدرآباد اس سفاکانہ بے اعتنائی کا مجرمانہ حد تک مرتکب رہا ہے کہ اس نے اپنے ہی جواہرات کو بازار کے نقلی کنکروں جتنی وقعت بھی نہیں دی۔ جلیس جہاں کہیں بھی رہیں حیدرآباد کا ورثہ ہیں۔" ظاہر ہے کہ اقبال متین نے جب یہ تحریر لکھی تھی تو اس وقت ابراہیم جلیس بقید حیات تھے۔ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد ہم نے سہ ماہی "ارمغان" کراچی کا وہ خصوصی شمارہ اپنی الماری میں سے نکالا جو ابراہیم جلیس کی بیسویں برسی کے موقع پر پچھلے سال شائع ہوا تھا۔ اس خصوصی شمارہ میں ابراہیم جلیس کے بارے میں نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، کرشن چندر، مالک رام، احمد ندیم قاسمی، رئیس امروہوی، شوکت صدیقی، ابن انشاء، ڈاکٹر جمیل جالبی، محمد طفیل، صفی الدین صدیقی، عزیز کارٹونسٹ، وحید اختر، فکر تونسوی اور بیسیوں اہم ادیبوں کی نگارشات شامل ہیں۔ اس شمارہ میں ایک گوشہ محبوب حسین جگر کے بارے میں بھی شامل ہے۔ محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس دونوں کے بارے میں دنیا جانتی ہے کہ دونوں نے قلندرانہ زندگی گذاری۔ جب تک زندہ رہے مال ومتاع، جاہ وحشمت اور ظاہری نام ونمود سے

بے نیاز ہی رہے۔ اپنی نجی زندگی کم جی اور دنیا اور سماج کے لئے زیادہ جئے۔ کچھ شخصیتیں ان پہیوں کی طرح ہوتی ہیں جن پر سماج کی گاڑی چلتی رہتی ہے۔ ان دونوں ہستیوں کا شمار بھی سماج کے ایسے ہی پہیوں میں ہوتا ہے جن پر بھلے ہی ان کی نجی زندگی کی گاڑی نہ چلتی رہی ہو مگر اُردو ادب کی گاڑی تو ضرور چلتی رہی۔

ابراہیم جلیس کے بارے میں اقبال متین کی تحریر پڑھی تو ہمیں نہ جانے کیوں اپنے خاندان کا خیال آ گیا جس کے تین افراد نے لگ بھگ ستر برسوں سے اُردو ادب سے اپنا سروکار بنائے رکھا ہے۔ محبوب حسین جگر ہمارے سب سے بڑے بھائی تھے اور ابراہیم جلیس تیسرے نمبر کے بھائی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ابراہیم جلیس اکیس برس پہلے بیچ میں سے ہی اچانک اپنا ناتہ توڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔ پھر محبوب حسین جگر بھی دو سال پہلے اس دنیا سے منہ موڑ گئے۔ اب ہم باقی رہ گئے ہیں سو وہ بھی اس طرح کہ ؎

نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

آج یونہی موٹا سا حساب لگایا تو احساس ہوا کہ ہمارے خاندان نے لگ بھگ ستر برس تک اُردو زبان و ادب سے اپنا تعلق بنائے رکھا۔ محبوب حسین جگر نے طالب علمی کے زمانہ میں ہی ۱۹۳۶ء کے آس پاس لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے خاندان میں شعر و ادب کے جراثیم ہمارے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کی معرفت ہی پہنچے۔ اور پہنچے تو کچھ اس طرح پہنچے کہ اس خاندان سے جانے کا نام ہی نہ لیا بلکہ ایک بھائی سے دوسرے بھائی میں منتقل ہوتے چلے گئے۔ محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس نے آج سے ساٹھ پینسٹھ برس پہلے ہی گلبرگہ جیسی سنگلاخ زمین میں ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا۔ بعد میں بڑے بھائیوں کی دیکھا دیکھی ہم بھی بلا وجہ ادب میں داخل ہو گئے۔ مگر اب صورتحال بالکل بدلتی نظر آ رہی ہے۔ ادب کے جراثیم کو ہمارے خاندان میں جس قدر پھیلنا تھا وہ کب کے پھیل چکے بلکہ اب تو ان کا اثر تک زائل ہونے لگا ہے۔ یوں اب ان کے مزید پھیلنے کے دور دور تک کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے کیونکہ کم از کم ہمارے خاندان میں بعد میں جو نسلیں سامنے آئی ہیں ان میں دور دور تک کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس کا ادب سے کوئی سروکار ہو۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خاندان کی آنے والی نسلوں نے ہم تینوں بھائیوں سے کافی سبق سیکھ لیا ہے اور وہ اتنی آسانی سے گمراہ نہیں ہونگیں۔ چونکہ اب ہم اس خاندان کے آخری فرد رہ گئے ہیں جس کا اب

بھی ادب سے تھوڑا بہت تعلق برقرار ہے، جو کسی بھی وقت ختم ہوسکتا ہے، تو ہم نے اُردو والوں کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا کہ اب وہ ہمارے خاندان کے بھروسے نہ رہیں بلکہ ہو سکے تو کسی اور غافل خاندان کو اس سلسلہ میں زحمت دیں۔ ہماری جھولی میں بس اتنا ہی کچھ تھا۔ یاد آتا ہے کہ ہمارے والد محترم بھی اگرچہ ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے لیکن غالبؔ کی طرح وہ بھی اس بات پر فخر محسوس کرتے تھے کہ پیشۂ آبا سپہ گری تھا۔ یوں بھی ایک زمانہ میں یہی ایک ایسا پیشہ تھا جو بیروزگار آبا کو آسانی سے میسر آجاتا تھا۔ محبوب حسین جگر نے جب ادب کی راہ اپنائی تو والد صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ کم از کم ابراہیم جلیس حیدرآباد سیول سرویس کا امتحان دیں اور کوئی عہدیدار بن جائیں (اس خواہش کی وجہ یہ تھی کہ والد خود تحصیلدار تھے) لیکن جب ابراہیم جلیس نے بھی ادب کی راہ اپنائی تو انھوں نے اپنی خواہش کو اپنے دل میں دبا کر رکھا اور خاندان کو ادب کے راستہ پر جانے سے بالکل نہیں روکا۔ ہمیں اس وقت اپنے دوست بلراج کومل یاد آگئے جو مشہور شاعر ہیں۔ پچاس برس پہلے جب بلراج کومل نے شاعری شروع کی اور اپنے شاعر دوستوں کی صحبت میں زیادہ وقت گذارنا شروع کردیا تو ایک دن ان کے والد نے انھیں ٹوکا ''میاں بلراج! یہ کیا تم شاعروں کی صحبت میں اپنا وقت برباد کرنے لگے ہو۔ کچھ تو اپنے خاندان اور اس کی روایات کا لحاظ کرو۔'' اس پر بلراج کومل نے برجستہ کہا ''پتا جی! ہمارا خاندان ایسا کونسا مغلیہ خاندان ہے کہ میں اس کی روایات کا لحاظ کروں''۔ کومل بتاتے ہیں کہ ان کے اس جواب کے بعد ان کے والد نے انھیں پھر کبھی نہیں ٹوکا اور وہ بلا جھجک شاعری کرنے لگے۔ آج جب کہ ہمارے دونوں ادیب بھائی اس دنیا میں نہیں رہے تو احساس ہوتا ہے کہ ان دونوں نے اُردو ادب سے اُس وقت اپنا رشتہ قائم کیا تھا جب اُردو ادب اپنے عروج پر تھا۔ ہر جگہ اُردو شعر و ادب کا بول بالا تھا۔ آزادی کی جدوجہد زور و شور سے جاری تھی اور سارے ملک میں ترقی پسند تحریک کا دور دورہ تھا۔ ۱۹۴۸ء میں ابراہیم جلیس جب ہندوستان سے گئے ہیں تو اس وقت ان کی عمر صرف ۲۴ سال تھی اور اس کم عمری میں اُنھوں نے جو ملک گیر شہرت حاصل کی تھی وہ برسوں کی ریاضت کے بعد اچھے اچھوں کو میسر نہ آسکی۔ ابراہیم جلیس نے انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم گلبرگہ میں حاصل کی۔ پھر گریجویشن کے لئے علی گڑھ چلے گئے۔ ۱۹۴۲ء میں واپس آکر حیدرآباد میں رہنے لگے۔ گویا حیدرآباد میں ان کا قیام صرف چھ برس رہا اور اس مختصر عرصہ میں ان کی چھ کتابیں شائع ہوئیں۔ تخلیقی سطح پر وہ بہت سرگرم رہے۔

پاکستان میں بھی ان کی بیسیوں کتابیں شائع ہوئیں۔ان کا شمار پاکستان کے مقبول ترین کالم نگاروں میں ہوتا تھا اور لوگ ان کے کالم کا بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔سہ ماہی ''ارمغان'' نے ابراہیم جلیس کے بارے میں جو ضخیم خصوصی شمارہ شائع کیا ہے اس میں ان کی افسانہ نگاری، کالم نگاری، صحافت اور فلم سے متعلق ان کی خدمات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔

اس خصوصی شمارہ کو پڑھتے ہوئے ہمیں اقبال متین کی بات پھر یاد آئی کہ حیدرآباد نے اپنے اس سپوت کی وہ قدر نہیں کی جس کا وہ مستحق تھا۔ہمیں خود اندازہ ہے کہ حیدرآباد کی نئی نسل ابراہیم جلیس کے ادبی کارناموں سے کماحقہ واقف نہیں ہے۔ان کی تصانیف بھی اب حیدرآباد میں کم ہی دستیاب ہوتی ہیں حالانکہ وہ زندگی بھر اپنے حیدرآبادی ہونے پر ناز کرتے رہے۔ہمیں یہ باتیں اس لئے یاد آئیں کہ اب اپنے خاندان میں ہم آخری فرد رہ گئے ہیں جس کا ادب سے سروکار برقرار ہے۔مگر ہمارے ساتھ مشکل یہ ہوئی کہ ہم نے اُس وقت اُردو ادب سے اپنا تعلق قائم کیا جب کم از کم ہندوستان میں اُردو کی حالت دگرگوں ہونے لگی تھی۔ ہمارے اکثر دوست ہم سے کہتے رہتے ہیں کہ ہم ایک رو بہ زوال زبان میں ترقی کرتے چلے جارہے ہیں۔ہم نے کل یونہی اپنے ایک دوست سے جب ذکر کیا کہ ہمارے خاندان نے چارسو برس پرانی اُردو زبان میں لگ بھگ ستر برس تک خدمات انجام دی ہیں اور اب آگے نہ جانے ان خدمات کا کیا حشر ہوگا تو مسکرا کر بولے ''میاں! تمہیں اپنے خاندان کی فکر لگی ہے۔ذرا اس زبان کے بارے میں بھی تو سوچو جس میں تمہارے خاندان نے خدمات انجام دی ہیں۔آخر کس نے کہا تھا تمہارے خاندان سے کہ ایک ایسی زبان کی خدمت کرو جس کا مستقبل غیر یقینی ہو۔اگر وہ زبان ہی باقی نہ رہے تو تم کیا اور تمہارا خاندان کیا۔ایسی باتیں سوچ کر اپنی عاقبت کیوں خراب کرتے ہو۔بہت سے لوگ تاریخ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں اور جب یہ تقاضے پورے ہوجاتے ہیں تو تاریخ کے 'کوڑے دان' کے حوالہ ہوجاتے ہیں''۔چونکہ ہمارے دوست کی اس تلخ بات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس لئے خاموش ہوگئے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۲۵/اکتوبر ۱۹۹۸ء)

☆☆

گجرال کمیٹی پر عمل ہو تو ہم حیدر آباد جائیں

صاحبو! ہمارے احباب اکثر ہم سے پوچھتے رہتے ہیں کہ میاں تمہیں تو ملازمت سے ریٹائر ہوئے چار پانچ برس بیت گئے۔ اب دہلی میں تمہارا کیا کام۔ تم حیدر آباد واپس کیوں نہیں جاتے؟۔ اس سوال کا جواب ہم ہمیشہ گول کر جاتے ہیں۔ سوچا کہ آج اس سوال کا جواب دے ہی دیں تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آوے۔ آپ میں سے بہت سوں کو پتہ ہوگا کہ نومبر ۱۹۷۲ء میں ہم اُردو کے مسائل کا جائزہ لینے کے لئے قائم کردہ کمیٹی (جس نے بعد میں اس کے صدر نشین اندر کمار گجرال کے نام کی رعایت سے گجرال کمیٹی کی حیثیت سے شہرت پائی) کے شعبۂ ریسرچ میں کام کرنے کے لئے حیدر آباد سے دہلی آئے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ سفارشات کے ساتھ حکومت ہند کو پیش کردی تھی۔ ہمیں اصولاً کمیٹی کی رپورٹ کی پیشکشی کے بعد ہی حیدر آباد واپس چلے جانا چاہیے تھا مگر سوچا کہ دو سال تک شبانہ روز محنت کے بعد جب ہم نے اس رپورٹ کی تیاری میں اپنا بھی ایک حقیر سا حصہ ادا کیا ہے تو کیوں نہ اس رپورٹ کی عمل آوری تک دہلی میں ہی قیام کیا جائے۔ ایک بار اس پر عمل ہو جائے تو حیدر آباد واپس چلے جاتے ہیں۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کیا ہم اپنی پیاری زبان اُردو کے لئے اتنی بھی قربانی نہیں دے سکتے۔ اس خیال کے آتے ہی ہم نے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں نوکری ڈھونڈھ لی اور اُس دن کا انتظار کرنے لگے جب گجرال کمیٹی رپورٹ پر عمل ہوگا۔ اب یہ ایک اتفاق ہے کہ چار پانچ برس تک اس رپورٹ پر کوئی عمل نہیں ہوا۔ سرکاری کاموں میں ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔

اس عرصہ میں ہمیں حیدرآباد بہت یاد آتا رہا لیکن اُردو سے محبت نے ہمیں دہلی میں روکے رکھا۔ پھر یوں ہوا کہ اس کمیٹی کے صدر نشین اندر کمار گجرال خود ماسکو میں ہندوستان کے سفیر بن کر چلے گئے۔ ایک لمحہ کے لئے ہم نے سوچا کہ جب اس کمیٹی کے صدر نشین ہی دہلی چھوڑ کر ماسکو چلے گئے تو ہم کیوں بلاوجہ دہلی میں رُکے ہوئے ہیں۔ مگر آپ تو جانتے ہیں کہ ہم بے حد حساس، ذمہ دار اور فرض شناس آدمی ہیں۔ ہمیں اپنے فرائض غیر منصبی کا ہر دم خیال رہتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ جہاں آٹھ دس برس بیت گئے ہیں وہاں دو چار برس اور انتظار کر لینے میں کیا قباحت ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ ہم نے جس نئے دفتر میں ملازمت شروع کی تھی وہاں اس عرصہ میں ہماری پرموشن بھی ہوگئی تھی۔ خیر ہمیں پرموشن وغیرہ سے کیا مطلب کیونکہ ہم تو فطرتاً قلندر صفت آدمی واقع ہوئے ہیں۔ ہم نے پیسہ کو ہمیشہ دوسروں کے ہاتھ کا میل سمجھا۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ دفتر میں یہ جو ہماری پرموشن ہوئی ہے وہ قدرت کی جانب سے ہوئی ہے تاکہ ہم دہلی میں ذرا اطمینان سے رہ سکیں اور اُس دن کا انتظار کریں جب گجرال کمیٹی کی رپورٹ پر عمل ہوگا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ گجرال کمیٹی کی رپورٹ برسوں حکومت کے سردخانے میں پڑی رہی حالانکہ اس عرصہ میں کئی سرکاریں بدلیں۔ مگر ہم کب ہمت ہارنے والے تھے سو دہلی میں رُکے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن ہم اپنی ملازمت سے بھی ریٹائر ہوگئے۔ آس کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو ایک عرصہ بعد اس پر اوس تو پڑ ہی جاتی ہے۔ ہم نے سوچا کہ اب دہلی میں رُکنا بیکار ہے۔ آخر ہم کب تک گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کے انتظار میں دہلی میں اپنے بچے کھچے بڑھاپے کے دن ضائع کرتے رہیں۔ مگر ادھر ہم نے حیدرآباد کو واپسی کے منصوبے بنانے شروع کئے اور اُدھر دیکھتے ہی دیکھتے جناب اندر کمار گجرال خود وزیراعظم بن گئے۔ ہم بے حد خوش ہوئے اور اپنے حیدرآبادی احباب کو اطلاع دی کہ میاں اب جدائی کی گھڑیاں ختم سمجھو۔ للّٰلہ ہماری یاد میں آنسو نہ بہاؤ۔ ہم انشاء اللہ بہت جلد گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل کرواکے حیدرآباد واپس ہو جائیں گے۔ جس کام کے لئے دہلی آئے تھے اسے پورا کر کے ہی آئیں گے۔ مگر کیا بتائیں اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ جب گجرال صاحب کی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں بھی بوجوہ اس رپورٹ پر عمل نہ ہو سکا تو ہم نے تہیہ کر لیا کہ اب ہم اپنے ذاتی حشر سے ہی مطلب رکھیں گے اور گجرال کمیٹی کی رپورٹ کے حشر کے بارے میں سوچنا بالکل چھوڑ دیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی ہمیں اصولاً اپنا ''سامان سفر'' باندھنا شروع کر دینا چاہئے

تھا مگر دیکھا کہ ہمارے پاس تو سامان ہے ہی نہیں۔ باندھیں تو کیا باندھیں۔ سوچا کہ کمر ہی باندھ لیں لیکن اب یہ بھی خمیدہ رہنے لگی ہے۔ بہت دن اسی ادھیڑ بُن میں بیت گئے۔ اس اثناء میں یہ اطلاع ملی کہ قومی کونسل برائے فروغ اُردو کا اجلاس لگ بھگ دو سال کے وقفہ کے بعد ۲۶ اکتوبر کو منعقد ہونے والا ہے اس میں شرکت کرو۔ اطلاعاً عرض ہے کہ پچھلے دو برسوں سے ہم فروغ اُردو کونسل کے رکن ہیں جس کے نائب صدر نشین ہمارے بزرگ کرم فرما ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ہیں اور مرکزی وزیر تعلیم اس کے صدر نشین ہوا کرتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ جاتے جاتے لگے ہاتھوں کیوں نہ اس اجلاس میں شرکت کر لیں اوراس کے دو ایک دن بعد دہلی کو خیر باد کہہ کر حیدرآباد واپس چلے جائیں۔ یوں بھی مرکزی وزیر تعلیم مرلی منوہر جوشی اس کونسل کے صدر نشین ہیں۔ گویا اب حیدرآباد کو ہماری واپسی پکی ہو چکی ہے۔

صاحبو! پچھلے ہفتے ہم نے فروغ اُردو کونسل کے اجلاس میں شرکت کی جس کی وجہ سے ہمیں حیدرآباد واپس ہونے کے اپنے فیصلے کو پھر سے معرض التوا میں ڈال دینے پر مجبور ہو جانا پڑا ہے۔ کیونکہ اس اجلاس میں مرلی منوہر جوشی جی نے بڑے طمطراق کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ ان کی حکومت بہت جلد گجرال کمیٹی کی سفارشات کو روبعمل لانے کے بارے میں اعلان کرے گی۔ اس طرح گجرال کمیٹی نے پھر سے ہمارے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔ کیا کریں گجرال کمیٹی ہمارے حق میں ایک ایسا کمبل بن گئی ہے جسے ہم بھلے ہی چھوڑ دیں لیکن وہ ہمیں چھوڑنے کا نام نہیں لیتی۔ آس بھی کیا بری چیز ہے۔ کونسل برائے فروغ اُردو کو دو سال پہلے تک مرکزی حکومت کے ایک محکمہ ''بیورو فار پروموشن آف اُردو'' کی حیثیت حاصل تھی مگر اب اسے ایک خود مختار ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ جب تک شہباز حسین، شارب ردولوی اور شمس الرحمٰن فاروقی اس محکمہ کے سربراہ رہے تب تک اس ادارہ میں کام بھی ہوا کرتا تھا مگر ادھر دس بارہ برسوں سے اس ادارہ کی حیثیت ایک زندہ لاش کی سی ہوگئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں سے سڑنے کی بُو بھی نہیں آ رہی تھی۔ لیکن ادھر جب سے حمید اللہ بھٹ اس ادارہ کے ڈائرکٹر بن کر آئے ہیں تب سے اس میں سرگرمی دکھائی دینے لگی ہے۔ اخباروں میں رپورٹیں آ رہی ہیں۔ بجٹ میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مستقبل کے منصوبے بن رہے ہیں۔ لگ بھگ دو برس پہلے کونسل کا پہلا اجلاس اس وقت کے وزیر تعلیم ایس آر بومائی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔

موجودہ مرکزی وزیر تعلیم مرلی منوہر جوشی جی نے ٹھیٹ، خالص اور نہایت فصیح و بلیغ اُردو میں جو تقریر کی اس نے ہمارے سوائے کونسل کے سارے ارکان کو حیرت میں ڈال دیا۔ مرلی منوہر جوشی نے اُردو کے ثقیل سے ثقیل لفظ کا تلفظ بھی اس طرح ادا نہیں کیا جس طرح ہمارے آج کے اُردو اساتذہ ادا کرتے ہیں جو دس جملے بھی بولتے ہیں تو اس میں گرامر اور تلفظ کی کم از کم دس غلطیاں تو ضرور کر جاتے ہیں۔ ہمیں مرلی منوہر جوشی کے صحیح تلفظ پر حیرت اس لئے نہیں ہوئی کہ دو چار سال پہلے ہم اُردو کی دو ایک محفلوں میں انھیں بولتے ہوئے سن چکے ہیں۔ پھر وہ الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں جب ہندوستان میں گیری بالڈی کی کتاب پر پابندی عائد تھی اور وہ انھیں انگریزی اور ہندی میں دستیاب نہ ہو سکی تو انھوں نے راست طور پر اس کے اُردو ایڈیشن کا مطالعہ کیا تھا۔ بہر حال ان کی تقریر کے دوران میں ہمارے برابر بیٹھے ہوئے ایک رکن نے کہا ''بھئی لکھی ہوئی اُردو تقریر کو پڑھنا ایک الگ بات ہے لیکن فی البدیہہ اُردو بولنا دوسری بات ہے۔''

مگر جب جوشی جی نے تقریر کے بعد فی البدیہہ اُردو بولنی شروع کی تو ویسی ہی اُردو بولی جیسی کہ ان کی لکھی ہوئی تقریر میں تھی۔ ہمیں تب بھی حیرت نہیں ہوئی۔ البتہ حیرت اس وقت ضرور ہوئی جب انہوں نے گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل کرنے کا اعلان کیا۔ اب ہم پھر اس مخمصہ میں گرفتار ہیں کہ حیدر آباد واپس چلے جائیں یا پھر گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کے انتظار میں دہلی میں مزید رک جائیں۔ مرلی منوہر جوشی جی نے بڑی آسانی سے یہ اعلان تو کر دیا ہے لیکن ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ ان کا تعلق اُس پارٹی سے ہے جو بابری مسجد کے انہدام کے وقت اتر پردیش میں برسر اقتدار تھی اور جس نے حکومت ہند سے لے کر سپریم کورٹ تک کو یہ تیقن دیا تھا کہ وہ بابری مسجد کو گرنے نہیں دے گی۔ مگر اس نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بابری مسجد کو اس طرح منہدم ہوتے دیکھا جیسے مسجد گرائی نہ جا رہی ہو بلکہ اپنے آپ ہی گرتی چلی جا رہی ہو۔ سیاسی جماعتیں بہت سے کام کرنے کے وعدے تو کرتی ہیں لیکن ان پر عمل کر نہیں پاتیں مگر بھارتیہ جنتا پارٹی وہ واحد پارٹی ہے جو کام نہ کرنے کا وعدہ کرتی ہے تو پھر اس کام کو ضرور پورا کر دیتی ہے۔ اگر مرلی منوہر جوشی جی اردو کے تعلق سے کچھ نہ کرنے کا اعلان فرماتے تو شائد ہم مان لیتے کہ وہ اُردو کے تعلق سے ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔ بہر حال اس تضاد کے باوجود ہم نے گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کی آس پھر سے اپنے دل میں پیدا کر لی ہے۔ بہت عرصہ پہلے ہم نے کہیں

لکھا تھا کہ جو آدمی صحیح اُردو جانتا اور بولتا ہے اور جو اردو کلچر سے گہری واقفیت رکھتا ہے وہ متعصب ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے اس خیال کو پھر ایک بار آزمائش کا سامنا ہے۔ دیکھتے ہیں مرلی منوہر جوشی کیا کرتے ہیں۔

یادش بخیر! مرلی منوہر جوشی جی سے ہماری ایک تفصیلی ملاقات دو برس پہلے اُس وقت ہوئی تھی جب انہوں نے ہمارے شاعر دوست امیر قزلباش کے مجموعہ کلام کی رسم اجراء انجام دی تھی۔ اس محفل میں ہم نے بھی امیؔر کا ایک خاکہ پڑھا تھا۔ کونسل کے اجلاس کے بعد جب مرلی منوہر جوشی جانے لگے تو ہمیں دیکھ کر رُک گئے۔ بولے "جناب! میں آپ سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ اُس دن تو آپ کا کمال دیکھا ہی تھا۔ ہندی میں آپ کی چیزیں پڑھتا رہتا ہوں"۔ لوگوں کی بھیڑ اُن کے اطراف بہت تھی ورنہ ہم ان سے ضرور پوچھتے کہ حضور! اگر آپ سچ مچ گجرال کمیٹی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے والے ہوں تو ہم دہلی میں رُک جاتے ہیں ورنہ ہمیں حیدرآباد واپس چلے جانے کی اجازت دیجئے۔ آخر ہم کب تک یہاں رہیں۔ حیدرآباد میں ہماری مٹی ہمارا انتظار کررہی ہے۔

روزنامہ "سیاست" (یکم نومبر ۱۹۹۸ء)

راج نارائن راز کی یاد میں

اب تو یہ ایک معمول سا بن گیا ہے کہ اُدھر حیدر آباد میں ہمارا کوئی دوست دنیا سے اُٹھ جاتا ہے تو جواباً اِدھر دہلی میں بھی ہمارا کوئی دوست اس دنیا سے منہ موڑ لیتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے ان دونوں شہروں میں ہمارے دوستوں کی تعداد کو کم کرنے اور یوں خود ہمارے عرصہ حیات کو تنگ کرنے کا کوئی مقابلہ شروع کر رکھا ہے۔ وقار خلیل کے انتقال کی خبر ''سیاست'' کے جس شمارہ میں چھپی تھی وہ ہمیں ڈاک کی گڑبڑ کی وجہ سے پورے آٹھ دنوں بعد ملا۔ اخبار میں وقار خلیل کی تصویر نظر آئی تو دل دھک سا رہ گیا۔ جو لوگ لمبے عرصے سے ادب میں سرگرم عمل ہیں ان کی تصویریں ان کی تخلیقات کے ساتھ ذرا کم ہی چھپتی ہیں۔ البتہ ان کی تصویر اُس وقت چھپتی ہے جب وہ ہمیشہ کے لئے ادب اور دنیا سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ چنانچہ خبر پڑھی تو پتہ چلا کہ وقار خلیل بھی اپنا دامن جھاڑ کر دنیا سے نکل گئے۔ وقار خلیل کو برسوں پہلے جس حالت میں دیکھا تھا اسی حالت میں انھیں پانچ چھ مہینے پہلے بھی دیکھا تھا۔ مخلص، بے لوث، محنتی، منکسر المزاج، سنجیدہ، بردبار اور خوددار۔ ہمیں اُن کی باتیں یاد آ ہی رہی تھیں کہ ہمارے دوست امیر قزلباش کا فون آیا کہ ہمارے دوست راج نارائن راز کا ۶/نومبر کو امریکہ میں انتقال ہو گیا، جہاں وہ اپنے بیٹے سے ملنے کے لئے دو دن پہلے ہی دہلی سے گئے تھے۔ کیسے بتائیں کہ ان دونوں دوستوں کے گذر جانے کی اطلاع نے دل کو کتنا ملول کیا۔ اب ہم عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں ایک طرف تو نئے دوستوں کی گنجائش کم سے کم نکلنے لگی ہے اور دوسری طرف پرانے دوست ہیں کہ ہاتھ سے نکلے چلے جا رہے ہیں۔

ہمارے دوست حیات لکھنوی کا ایک سیدھا سادا شعر ہے ۔

وہ بُرے ہوں کہ بھلے جو بھی ہمیں پیارے ہیں

اب نیا دوست کوئی ہم تو بنانے سے رہے

راج نارائن راز سینیارٹی کے اعتبار سے ہمارے دہلی کے اولین دوستوں میں سے تھے۔ کمار پاشی ہمارا پہلا دوست تھا اور راج نارائن دوسرے نمبر کے دوست تھے۔ دہلی آنے کے دو تین دن بعد ہی ہماری ملاقات راج نارائن راز سے شاستری بھون میں ہوگئی تھی جہاں ہم دونوں کام کرتے تھے۔ وہ وزارت اطلاعات میں علی جواد زیدی سے منسلک تھے اور اگرچہ ہم تھے تو وزارت تعلیم میں لیکن ہمارا سرکاری سروکار بھی علی جواد زیدی سے تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ علی جواد زیدی کے کمرہ میں ہی اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ہم نئے نئے دہلی آئے تھے لہذا ہماری غریب الوطنی اور مفلوک الحالی کے پیش نظر راج نارائن نے ہم سے کہا ''میاں! کل سے تم دوپہر کا کھانا میرے ساتھ ہی کھالیا کرنا۔ جہاں میں اپنے لئے دو چپاتیاں لاتا ہوں وہاں تمہارے لئے بھی دو چپاتیاں آجائیں گی''۔ ہم نے کہا ''مگر میں تو تین چپاتیاں کھاتا ہوں''۔ بولے ''اوہو! تو تین چپاتیاں آجائیں گی۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے''۔ ہم نے تو یہ بات مذاق میں کہی تھی لیکن راج نارائن سنجیدہ ہوگئے اور ہمارے لئے کھانا لانے لگے۔ ہم نے انھیں لاکھ منع کیا کہ وہ یہ تکلیف نہ کریں لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔ چنانچہ ہم اکثر دیر سے ان کے کمرہ میں پہنچتے تھے تو وہ ہمارے انتظار میں اپنے ہاتھ روکے بیٹھا کرتے تھے۔ ہمیں یہ اچھا نہیں لگتا تھا اور ہم کسی نہ کسی بہانے کھانے کی اس پابندی سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور ایک دن ہمیں یہ بہانہ ہاتھ آہی گیا۔ دو مہینوں تک ان کے ساتھ کھانا کھاچکے تو ایک دن راج نارائن راز نے کہا ''میاں مجتبیٰ! آج ہم تمہیں اپنی تازہ غزل سُناتے ہیں جو کل رات ہی ہوئی ہے''۔ انھوں نے غزل سنائی۔ بہت اچھی تھی اور ہم نے داد بھی بہت دی۔ اس کے بعد ہم اچانک سنجیدہ ہوگئے تو راج نارائن نے پوچھا ''کیا بات ہے۔ تم اچانک سنجیدہ کیوں ہوگئے؟''۔ ہم نے کہا ''راز صاحب! میں کل سے آپ کے ساتھ کھانا نہیں کھاؤں گا''۔ پوچھا ''وہ کیوں؟''۔ ہم نے کہا ''بات دراصل یہ ہے کہ دو مہینوں سے آپ کا نمک کھارہا ہوں اور آج مجھے احساس ہورہا ہے کہ نمک کتنی بُری چیز ہے۔ یہ اتنی بُری چیز ہے کہ مجھے آپ کے شعر بھی اچھے لگنے لگے ہیں۔ میں اپنی ادبی دیانتداری کو مجروح نہیں کرنا چاہتا''۔

اس پر وہ ہنسنے لگے حالانکہ وہ ہنستے بہت کم تھے۔

راج نارائن پستہ قد تھے۔ اوپر سے شخصیت بھی چھوئی موئی سی تھی۔ آواز بھی اتنی باریک اور منحنی سی تھی کہ اگر وہ برابر والے کمرہ میں بول رہے ہوں تو لگتا تھا کوئی خاتون باتیں کر رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جس دفتر سے بھی وابستہ رہے وہاں ان کے ماتحتین ان کے رعب اور دبدبہ سے خوفزدہ ہی رہے۔ ہم اکثر کہا کرتے تھے کہ ایسی چھوئی موئی سی شخصیت کی مدد سے ایسا گھنا رعب اور دبدبہ پیدا کرنا آدمی کے بس کی بات نہیں، سائنس کا کمال تو ہوسکتا ہے۔ ان کے بیشتر دوست بھی ان سے بہت محتاط اور خائف رہتے تھے۔ جھٹ خفا تو تھے ہی۔ اپنے مزاج کے خلاف کسی بات کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ سنجیدگی، بردباری اور متانت کے معاملہ میں وہ فرشتوں کو بھی شرماتے تھے۔ ہم غالباً ان کے اکیلے دوست تھے جسے انھوں نے اپنے ساتھ مذاق کرنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ (پتہ نہیں کیوں)۔ ایک بار ہم نے ان کے گھر فون کیا۔ راج نارائن نے جیسے ہی فون کا ریسیور اٹھا کر اپنی نسوانی آواز میں ''ہیلو'' کہا۔ ہم نے کہا ''بھابی! ذرا راز صاحب سے بات کرادیجئے''۔ ہماری آواز کو پہچان کر بولے۔ ''میاں مجتبیٰ! کیا میں نہیں پہچانتا کہ ایسی بیہودہ شرارت کون کرسکتا ہے۔'' دوسرے دن خود ہی دوستوں کو شکایت کے لہجہ میں یہ واقعہ سنایا۔ جب ایک دوست اسے سن کر ہنسنے لگا تو اس سے ناراض ہوگئے۔ دیکھا جائے تو انھیں ہم سے ناراض ہونا چاہئے تھا مگر وہ خواہ مخواہ ایک معصوم دوست سے ناراض ہوگئے۔ یہ بھی اُن کا ایک اسٹائل تھا۔ یہ سچ بھی ہے کہ لوگوں نے ان کے ہونٹوں پر ہنسی کم ہی دیکھی۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھتے تھے۔ چنانچہ کبھی وہ غلطی سے کسی بات پر مسکرا دیتے تو ہنسی ان کے ہونٹوں پر نہیں بلکہ ان کی مونچھوں پر صاف دکھائی دیتی تھی۔ یہ ہمارا مشاہدہ تھا اور ایک بار ہم نے اس مشاہدے کا ذکر اُن سے کیا تو بولے ''مجھے حیرت ہے کہ کبھی کبھی تم کیسی نان سنس (Non Sense) باتیں کرتے ہو۔'' (حالانکہ ہماری صحبت میں وہ ایسی نان سنس باتوں کو پسند کرنے لگے تھے)۔ جب وہ ماہنامہ ''آج کل'' کے ایڈیٹر بنے تو ان میں اور بھی سنجیدگی آ گئی۔ یوں بھی وہ جوش ملیح آبادی کے جانشین بن گئے تھے۔ اسی کرسی پر بیٹھتے تھے جس پر کبھی جوش ملیح آبادی بیٹھا کرتے تھے۔ جوش صاحب کی یہ کرسی اُن کے تن و توش اور جسامت کے اعتبار سے بنائی گئی تھی۔ منحنی سے راج نارائن جب اس کرسی پر بیٹھتے تو کرسی کا بیشتر حصہ خالی ہی رہ جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کرسی پر نہیں بلکہ چارپائی

پر بیٹھے ہیں۔(' آج کل' کے موجودہ مدیر محبوب الرحمٰن فاروقی نے اس کرسی کو اب ہٹا کر ایک کونہ میں رکھ دیا ہے۔ یوں بھی ہر کس و ناکس اس کرسی پر تھوڑا ہی بیٹھ سکتا ہے)۔ راج نارائن بے حد محنتی آدمی تھے۔ کام کرنے کی لگن اور جذبے سے بھرپور۔ انھوں نے '' آج کل'' کے کئی ایسے یادگار نمبر نکالے جو شائد جوش ملیح آبادی بھی مرتب نہیں کر سکتے تھے۔ مضامین کے انتخاب کے معاملہ میں وہ بہت سخت گیر تھے (غالباً یہی وجہ ہے کہ ہماری کوئی تحریر ان کے دورِ ادارت میں ' آج کل' میں شائع نہ ہو سکی) اُردو کے کلاسکی ادب پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ نثر بھی بہت اچھی لکھتے تھے۔ اچھے شاعر تو وہ تھے ہی۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے ان کے ماتحتین ان سے بے حد گھبراتے تھے۔ البتہ ان کی منہ بولی بیٹی مدبرہ عثمانی کے کام سے، جو ان کی اسسٹنٹ بھی تھی، بہت خوش رہا کرتے تھے۔ بات بات پر بیٹی مدبرہ، بیٹی مدبرہ کی رٹ لگائے رہتے تھے۔ (مدبرہ کے ذریعہ ہی اُردو والوں کو امریکہ میں ان کے انتقال کی خبر ملی)۔ ایک دن ہم نے کہا '' راز صاحب ! آپ ہمیں اور تو کچھ نہیں بنا سکتے۔ ہمیں کم از کم اپنا منہ بولا مدّاح ہی بنا لیجئے''۔ منہ بنا کر بولے '' یہ منہ بولا مدّاح کیا ہوتا ہے؟''۔ ہم نے کہا '' جیسے آپ ہمارے منہ بولے شاعر ہیں۔'' منہ پھیر کر بولے '' نان سنس۔'' راز صاحب بہت اچھے شاعر تھے۔ یہ اور بات ہے کہ مشاعروں میں کم ہی جاتے تھے۔ کیونکہ وہ تعلقات عامہ کا گر نہیں جانتے تھے اور اپنی ہی انا میں مگن رہنے کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی شاعری کے تین مجموعے '' چاندنی اساڑھ کی''، ''لذّت لفظوں کی'' اور '' دھنک احساس کی'' شائع ہو چکے ہیں۔ شعر فہمی کے معاملہ میں ہماری بے بضاعتی سے واقف ہونے کے باوجود وہ ہمیں اپنے شعری مجموعوں سے ضرور نوازتے تھے۔ جب انھوں نے اپنا تیسرا مجموعہ '' دھنک احساس کی'' ہمیں دیا تو ہم نے کہا '' راز صاحب! ہر شاعر کی شاعری میں ایک کلیدی لفظ (Key Word) ہوتا ہے۔ اتفاق سے آپ کی شاعری کا ' کی ورڈ'' کی' ہے۔''

پوچھا '' وہ کیسے؟''

ہم نے کہا '' آپ خود دیکھ لیجئے۔ آپ کے ہر شعری مجموعہ کا نام ' کی' پر ختم ہوتا ہے جیسے ' چاندنی اساڑھ کی'، 'لذّت لفظوں کی' اور 'دھنک احساس کی'۔ بلکہ اس کے آگے ڈیش (Dashes) لگا دیں تو کوئی گالی بھی بن سکتی ہے''۔

منہ پھیر کر بولے '' نان سنس''۔

ہمیں ان کا نان سنس کہنا بہت اچھا لگتا تھا۔ ہمارے ایسے دوست تو بہت سے ہیں جن سے ہم بے تکا مذاق بھی کر لیتے ہیں لیکن اب ایسا کوئی دوست اس دنیا میں باقی نہیں رہا جس سے مذاق کرنے کی کوئی دوسرا شخص ہمت نہیں کر سکتا تھا مگر ہم کر لیتے تھے۔ یہ ایک ایسا ناقابلِ تلافی نقصان ہے جس کی کمی ہمیں ہمیشہ شدّت سے محسوس ہوتی رہے گی۔ راج نارائن ہم سے عمر میں پانچ چھ برس بڑے تھے لیکن ملتے تو برابری کا درجہ دیتے تھے۔ بے حد مخلص، شریف، وضعدار اور محبت والے آدمی تھے۔ جس سے محبت کرتے تھے اس کے لیے سات خون بھی معاف کر دیتے تھے۔ ان کی پیدائش بلوچستان میں ہوئی تھی اسی لئے اپنی پسند ناپسند کے معاملہ میں بلوچیوں کا سا رویہ رکھتے تھے۔ بعض اشخاص سے ناراض رہے تو زندگی بھر ناراض ہی رہے۔ کبھی مصالحت نہیں کی۔ وہ سانچے اب ٹوٹ گئے ہیں جن سے راج نرائن راز جیسے لوگ بن کر نکلا کرتے تھے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۲۲ر نومبر ۱۹۹۸ء)

تصویر مِری دل تیرا بہلا نہ سکے گی

پچھلے دنوں ''سیاست'' کے خواتین سپلیمنٹ میں سیاست کی قاری محترمہ صبا جبیں (ملک پیٹ) کا ایک خط شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے ہمارے کالم کے ساتھ شائع ہونے والی تصویر پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا تھا ''یہ تصویر بڑی سنجیدہ ہے۔ کیا ان کی کوئی مسکراتی ہوئی یا شوخی بھری تصویر چھاپی نہیں جاسکتی؟''

آج ہم اس سوال کے جواب کے طور پر اپنی وضاحت پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے تو ہم شخصی طور پر کالم کے ساتھ تصویر چھپوانے کے قائل نہیں ہیں اور ایک عرصہ تک ہمارا کالم تصویر کے بغیر چھپتا بھی رہا ہے۔ اس تصویر کو بحالت مجبوری چھپوانے کی ضرورت بھی محض اس لئے پیش آئی کہ ہم نے ایک بار ''مشاعرے اور مجرے'' کے عنوان سے ایک کالم لکھا تھا جس میں اُن خاتون شعرا کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا تھا جو مشاعرہ میں کچھ ایسے بناؤ سنگھار، سج دھج اور میک اپ کے ساتھ شرکت کرتی ہیں کہ لگتا ہے مشاعرے میں نہیں ''مجرے'' میں شرکت کررہی ہیں۔ ہم نے لکھا تھا کہ مشاعروں میں اب یہ سلسلہ بند ہونا چاہئے۔ اس کالم کی اشاعت کے بعد ہمارے پاس ایک خاتون شاعر کا خوشبوؤں میں بسا ہوا ایک خط (جس میں مردہ گلاب کی چند پتیاں بھی رکھی ہوئی تھیں) آیا تھا جس میں انہوں نے ہمارے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے یہ پیش کش کی تھی کہ وہ اس معاملہ میں ہمارے ساتھ شانہ بشانہ بلکہ سینہ بہ سینہ اور قدم بہ قدم چلنے کو تیار ہیں۔

مجروح سلطان پوری کی غزل کا ایک مصرعہ بھی لکھا تھا

ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

ہم نے تاڑ لیا کہ محترمہ ہمارے تعلق سے ضرور کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا ہیں اور اپنا صحیح وقت ایک غلط آدمی پر برباد کر رہی ہیں۔ محترمہ کو غالباً یہ پتہ نہیں کہ ہمارے ہاتھوں کو اب کسی ہاتھ کی نہیں بلکہ ایک لاٹھی کی ضرورت ہے۔ ہم نے سوچا کہ اگر کسی طرح انہیں ہماری عمر کا اندازہ ہو جائے تو شاید وہ کم از کم ہمارے حوالہ سے مجروح سلطان پوری کے شعروں کو زحمت نہیں دیں گی۔ اس خیال کے آتے ہی ہم نے اخبار کے انتظامیہ سے خواہش کی کہ وہ ہمارے کالم کے ساتھ ہماری تصویر بھی چھاپا کرے تا کہ محترمہ جیسی معصوم ہستیاں ہمارے تعلق سے گمراہ نہ ہوں۔ اس تصویر کی اشاعت کا مقصد ہی یہ تھا کہ ان جیسی معصوم ہستیاں ہم سے فاصلہ برقرار رکھیں۔ گویا ہماری تصویر کی اشاعت کا مقصد لوگوں کو اپنے خط وخال سے متاثر کرنا نہیں بلکہ انھیں ڈرانا اور ہم سے دور رکھنا تھا۔ ہمیں اس وقت اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس یاد آ گئے۔ ایک بار وہ اپنے ایک لکھ پتی دوست کے ہاں گئے تو دیکھا کہ ان کے دیوان خانہ میں حضرت جگر مرادآبادی کی ایک بڑی سی تصویر آویزاں ہے۔ ابراہیم جلیس نے اپنے لکھ پتی دوست سے کہا ''مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ جگر مرادآبادی اور ان کی شاعری کے اتنے بڑے مدّاح ہیں۔ تبھی تو آپ نے اپنے دیوان خانہ میں ان کی تصویر لگا رکھی ہے''۔ اس پر ان کے لکھ پتی دوست نے کہا ''کیا کہا! یہ جگر مرادآبادی ہیں؟۔ مجھے کیا معلوم، میں نے تو یہ تصویر اپنے بچوں کو ڈرانے کے لئے لگا رکھی ہے''۔ گویا ہمارے کالم کے ساتھ ہماری تصویر کو بھی وہی حیثیت حاصل ہے جو لکھ پتی کے دیوان خانہ میں جگر مرادآبادی کی تصویر کو حاصل تھی۔

دوسری بات یہ کہ ہم ہمیشہ اپنی رائج الوقت تصویر ہی رسالوں میں چھپواتے ہیں۔ ہم اُردو کے ان بیشتر شاعروں اور ادیبوں میں سے نہیں ہیں جو بفضل تعالیٰ ساٹھ ستر برس کے ہو چکے ہیں لیکن اپنے کلام کے ساتھ ہمیشہ نوجوانی کی تصویر ہی چھپواتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس اہتمام کے باوجود ان کا کلام بچکانہ ہی رہتا ہے۔ اب محترمہ صباجبیں کی خواہش ہے کہ ہماری کوئی ایسی تصویر چھاپی جائے جس میں ہم مسکرا رہے ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ کوئی آدمی یونہی تو نہیں مسکراتا۔ کوئی بات ہو تو تبھی مسکراتا ہے۔ ہمیں تو آج تک کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جس پر ہم مسکرا سکیں۔ اگرچہ فوٹو گرافر حضرات کسی کی تصویر کھینچنے سے پہلے عادتاً کہہ دیتے ہیں کہ ''ذرا مسکرائیے۔'' لیکن کوشش کے باوجود ہم کبھی مسکرا نہ سکے۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک فوٹو گرافر نے ایک میت کی الوداعی تصویر کھینچتے

وقت بے خیالی میں مرحوم کی نعش کو مخاطب کر کے کہہ دیا تھا ''ذرا مسکرایئے۔'' بعد میں فوٹوگرافر اپنی اس حرکت پر جھینپنے لگا تو ہم نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا ''میاں! تم نے میت کو مسکرانے کے لئے کہہ کر کوئی غلطی نہیں کی ہے کیونکہ زمانہ اتنا پر آشوب ہے کہ کسی آدمی کا جیتے جی مسکرانا ناممکن ہوتا جارہا ہے۔ آدمی کو مرنے کے بعد جب اس بھیانک زندگی سے نجات پانے کا احساس ہوتا ہے تو تبھی وہ سچی مسرت اور خوشیوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں سچی اور اصل مسکراہٹ زندوں کے ہونٹوں پر نہیں بلکہ مردوں کے ہونٹوں پر ہی دکھائی دیتی ہے۔'' خیر اس وقت ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔

ہمیں یاد ہے کہ ہم نے زندگی میں صرف ایک ہی تصویر کھنچوائی تھی جس میں ہم مسکراتے ہوئے پائے گئے تھے اور ہم اس واقعہ کو ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی کوئی چالیس برس پرانی بات ہے۔ ہمیں اپنی شادی کے سلسلہ میں اپنی تصویر لڑکی والوں کے پاس بھیجنے کا مسئلہ درپیش تھا اور ہم نے اس سے پہلے کبھی تصویر نہیں کھنچوائی تھی۔ اس زمانہ میں فوٹوگرافروں کے کیمرے بھی بڑے عجیب وغریب ہوا کرتے تھے۔ اس کیمرہ کے اوپر ایک غلاف لٹکتا رہتا تھا جس میں فوٹوگرافر بار بار داخل ہو کر نہ جانے کیا کیا کرتا رہتا تھا۔ فوٹوگرافر نے پہلے تو ہمیں کیمرہ کے سامنے کھڑا کیا۔ پھر کہنے لگا ''اپنی گردن سیدھی جانب موڑ کر کھڑے ہو جائیں۔'' ہم نے حکم کی تعمیل میں گردن موڑ دی اور وہ کیمرے کے پیچھے غلاف میں چلا گیا۔ چونکہ ہماری گردن مڑی ہوئی تھی لہذا ہم یہ دیکھ نہیں سکتے تھے کہ وہ غلاف کے پیچھے کیا کر رہا ہے۔ بڑی دیر بعد جب ہماری گردن میں درد ہونے لگا تو ہم نے کہا ''بھیا! یہ ورزش ہم سے نہ ہو سکے گی۔ گردن اکڑنے لگی ہے اب تو تصویر کھینچ لو''۔ ہماری بات کا جواب نہ ملا تو ہم گھبرا کر اسٹوڈیو سے باہر نکل آئے۔ دیکھا کہ فوٹوگرافر کسی گاہک سے بات چیت کر رہا ہے۔ ہم نے غصہ سے کہا ''یہ کیا بات ہوئی۔ ایک ہی پوز میں کھڑے کھڑے ہماری گردن میں درد ہونے لگا ہے اور تم گاہک سے باتیں کر رہے ہو''۔ بولا ''اس پوز میں کھڑے ہونے کی مشق نہایت ضروری ہے۔ جاؤ اور اسی طرح کھڑے رہو میں ابھی آتا ہوں''۔ ہم واپس آ کر پھر یہی پوز بنا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد فوٹوگرافر آیا۔ اس نے ہماری گردن کچھ اور بھی موڑ دی اور غلاف کے پیچھے چلا گیا۔ پھر کہنے لگا ''اب ذرا مسکرایئے''۔ ہم نے پوچھا ''کس بات پر مسکرائیں۔ ہم کوئی پاگل تو ہیں نہیں جو بلاوجہ مسکرانے

لگیں۔'' وہ بولا'' جو فوٹو کھنچواتا ہے اُسے تو مسکرانا ہی پڑتا ہے۔ یہ تو اس کے مقدر میں لکھا ہوتا ہے''۔
ہم نے کہا'' مگر ہم نے آج تک بلاوجہ مسکرانے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی لطیفہ سناؤ تو شاید ہم مسکرا پائیں''۔ بولا'' لطیفے سنانے کے دام الگ ہونگے''۔ اس کے بعد کمبخت نے ایسے گھسے پٹے لطیفے سنائے کہ مسکرانے کی بجائے رونا آنے لگا۔ کچھ دیر بعد فوٹو گرافر کے ڈرانے دھمکانے سے ہم جیسے تیسے مسکرانے کے قابل ہوئے تو اب کی بار فوٹو گرافر نے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ کہنے لگا '' آپ کا پوز بھی ٹھیک ہے۔ آپ نے جو سوٹ پہن رکھا ہے وہ بھی نیا ہے اور شاندار ہے۔ ماشاء اللہ اب تو آپ مسکرانے بھی لگے ہیں لیکن اس کے باوجود آپ کی شخصیت میں اب بھی اعتماد کی کمی نظر آرہی ہے۔ کوئی ایسی بات ہے ضرور جس کی وجہ سے آپ کی شخصیت مکمل نہیں ہو پا رہی ہے''۔
ہم نے کہا'' ہماری شخصیت تمہارے سامنے موجود ہے۔ تم خود دیکھ لو''۔ فوٹو گرافر نے اچانک ہمارے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس کو نکالا اور اسے کھول کر دیکھتے ہوئے کہنے لگا'' یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ ایک طرف تو آپ نے ہزار روپے کا سوٹ پہن رکھا ہے اور دوسری طرف آپ کے پرس میں صرف آٹھ آنے موجود ہیں۔ اس تضاد کی وجہ سے تمہاری شخصیت احساسِ کمتری میں مبتلا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تم میں فوٹو کھنچواتے وقت خود اعتمادی پیدا نہیں ہو رہی ہے۔ جاؤ اور پرس میں کم از کم سو روپے ہی رکھ کر لے آؤ''۔ بعد میں ہم نے اپنی شخصیت میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی غرض سے ایک دوست سے سو روپئے اُدھار مانگے۔ غرض جب تصویر بن کر آئی اور یہ ہمارے حوالہ کی گئی تو ہم نے دیکھا کہ اس میں ہم تو کہیں نظر نہیں آرہے تھے البتہ خود اعتمادی ہی خود اعتمادی نظر آرہی تھی۔ اپنی اس کارٹون نما تصویر کو دیکھ کر جیسے ہی ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی تو فوٹو گرافر نے انجانے میں اچانک اپنے کیمرے کا بٹن دبا دیا۔ پھر بولا'' آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی اصلی تصویر تو میں نے اب کھینچی ہے۔ پہلی تصویر تو صرف اس لئے کھینچی تھی کہ اسے دیکھ کر آپ کے ہونٹوں پر فطری مسکراہٹ آجائے''۔ ہماری زندگی کی وہ واحد تصویر تھی جس میں ہم مسکراتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ اب یہ تصویر بھی ہمارے پاس نہیں ہے کیونکہ جس جگہ رشتہ کی خاطر ہماری تصویر بھیجی گئی تھی وہاں ہمارا رشتہ طے نہیں ہو پایا اور انھوں نے یہ تصویر بھی واپس نہیں کی۔ گویا ہماری اکیلی مسکراتی ہوئی تصویر ایک گمنام رشتہ کی نذر ہوگئی۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی ہماری تصویر کھینچتا ہے تو ہم سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ طے کر

رکھا ہے کہ اب تو اُسی وقت مسکرائیں گے جب ہمیں مکروہات زندگی سے مکمل نجات مل جائے گی۔
ہم نے یہ وضاحت محترمہ صبا جبیں کی فرمائش کے جواب میں لکھی ہے۔ ان کی فرمائش پر ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے البتہ ہمیں اصل شکایت تو خواتین سپلیمنٹ کے مرتب ذہانت علی بیگ سے ہے جنھوں نے اس سوال کے جواب میں لکھا ہے "مجتبیٰ حسین ہمارے بزرگ ہیں اور ہم ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ اس لئے ایسی کوئی فرمائش اُن سے نہیں کر سکتے"۔ سچ بتایئے کیا احترام اسی کو کہتے ہیں۔ کیسے بتائیں کہ ہم تو خود ذہانت علی بیگ کو اپنا بزرگ سمجھتے آئے ہیں۔ اب وہ الٹا ہمیں اپنا بزرگ ماننے لگے ہیں تو جوش ملیح آبادی یاد آ گئے جنہوں نے کہا تھا۔

معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یارب

روزنامہ "سیاست" (۱۵ر نومبر ۱۹۹۸ء)

لوگ ہمیں بھی ڈاکٹر کہنے لگے

ادھر جب سے یہ اطلاع آئی ہے کہ جمشید پور کے کریم سٹی کالج کے اُردو استاد افسر کاظمی نے ہمارے بارے میں ایک تحقیقی مقالہ بعنوان ''مجتبیٰ حسین بحیثیت طنز نگار'' لکھ کر بہار کی رانچی یونیورسٹی سے پی ایچ ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے تب سے ہم گھر سے باہر ذرا کم ہی نکلنے لگے ہیں۔خدارا آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس تحقیق کے بعد ہم منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئے ہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے ایک پرانے دوست، جو اُردو کے ممتاز ناقد اور پروفیسر بھی رہ چکے ہیں، اچانک راستہ میں مل گئے تو ہمیں دیکھ کر حیرت سے بولے ''ارے! تم تو ابھی زندہ ہو۔ میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ تم کب کے گزر چکے ہو کیونکہ ابھی کچھ دن پہلے یہ اطلاع کہیں پڑھی تھی کہ کسی ریسرچ اسکالر نے تم پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ بھیا! ایک زمانہ میں تحقیق تو صرف مُردوں پر ہوا کرتی تھی۔ زندوں پر بھلا کوئی تحقیق کرتا ہے۔ تحقیق تو گڑے مُردوں کو اکھاڑنے کا کام ہے۔ زندوں کو گاڑنے کا نہیں''

ہم نے نظریں جھکا کر کہا ''ہم بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ تحقیق اصولاً مُردوں پر ہی ہونی چاہئے تاکہ موضوع تحقیق کے مرنے میں اب بھی کوئی کسر باقی رہ گئی ہو تو وہ پوری ہو جائے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات تحقیق زندوں کو مارنے میں بھی بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جو لوگ کسی وجہ سے بروقت مر نہیں پاتے اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس دھرتی کے سینہ پر مونگ دلنے کا کام انجام دیتے رہتے ہیں اُنھیں تحقیق کے ذریعہ ہی ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے۔ کسی کو مارنے کا یہ

بڑا مجرب نسخہ ہے"۔

ہمارے پروفیسر دوست نے پوچھا" پھر سچ سچ بتاؤ۔ اس اعتبار سے تم زندہ ہو یا مر چکے ہو؟"

ہم نے کہا" میں نے تو یہ مقالہ اب تک نہیں دیکھا ہے۔ کیسے بتا پاؤں گا کہ زندہ ہوں یا مر چکا ہوں"

حیرت سے بولے" خدا کی قسم سچ بتاؤ کیا یہ مقالہ تم نے نہیں لکھا؟"

ہم نے کہا" تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں خودکشی بھی کر سکتا ہوں۔ کوئی دوسرا مجھے ہلاک کردے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن ایک شریف آدمی اپنے ہاتھوں ہی اپنا گلا گھونٹ کر اپنے آپ کو ہلاک بھی کر سکتا ہے یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے"۔ بولے" اگر یہ سچ ہے تو تم نرے بدھو آدمی ہو۔ میں دو چار نامی گرامی اہل قلم کو جانتا ہوں جن پر جب اُن کی حیات میں بعض ریسرچ اسکالروں نے پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالے لکھے تو ان مقالوں کا ایک ایک لفظ خود انہی نامی گرامی حضرات کا لکھا ہوا تھا مقالہ نگاروں کا نہیں۔ ان کی بڑائی صرف اتنی تھی کہ اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود انھوں نے مقالہ پر مقالہ نگار کی حیثیت سے اپنا نام نہیں لکھا بلکہ اُس مقالہ نگار کا لکھا جسے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری ملنی تھی۔ اللہ اللہ قربانی اور ایثار کی ایسی مثال کہاں دیکھنے کو ملتی ہے"۔

ہم نے ان کے خیال سے اختلاف کرتے ہوئے کہا" بھیا میں اس بات کو نہیں مانتا۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ مقالے مقالہ نگاروں نے نہیں بلکہ خود ان شخصیتوں نے لکھے تھے جن کے بارے میں یہ مقالے لکھے گئے تھے"۔

بولے" میاں! میں خود ایک ایسے مقالے کا ممتحن رہ چکا ہوں جس میں مقالہ نگار نے اپنے ممدوح سے بعض ایسے سوالات پوچھے تھے جو بخدا منکر نکیر بھی بعد مرنے کے ان سے پوچھنے کی جسارت نہیں کر پائیں گے۔ پھر لطف کی بات یہ کہ ان سوالات کے جواب میں مذکورہ شخصیت نے اپنا سینہ ٹھونک ٹھونک کر اپنے جو کارنامے مقالہ نگار سے بیان کئے تھے بخدا ان کی اطلاع ابھی تک کراماً کاتبین کو بھی نہ ہوگی۔ ایک عمر کے بعد آدمی جب اپنے آپ کو Glorify کرتا ہے تو ایسی ہی خیالی دنیا اپنے اطراف آباد کر لیتا ہے۔ مانا کہ اکثر مقالہ نگار جوان ہوتے ہیں اور ان کا علم ان حضرات کے مقابلہ میں ہو سکتا ہے کمتر ہوتا ہو، جن پر مقالے لکھے جاتے ہیں، لیکن اس مقالہ میں

جو باتیں لکھی گئی تھیں وہ کم علم سے کم علم مقالہ نگار بھی نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ ایسی باتیں یا تو پرائمری اسکول کا کوئی طالب علم ہی لکھ سکتا ہے یا پھر ضعف کا شکار کوئی ایسا عمر رسیدہ شخص جس کے پاس اب کرنے کو کوئی کام باقی نہ رہ گیا ہو۔ یوں بھی بچہ ہر دم اپنے مستقبل کو رنگین بنانے کی تمنا رکھتا ہے اور عمر رسیدہ شخص اپنے بے رنگ ماضی کو رنگین بنانے میں جی جان سے مصروف رہتا ہے۔ مجھے تو دونوں کے سوچنے کے انداز میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ یقین مانو اس مقالے کو پڑھتے ہوئے مجھے یکبارگی مقالہ نگار کے دماغی عدم توازن اور اس کی نااہلیت پر افسوس ہوا تھا لیکن اسی اثناء میں میری نظر مقالہ کے ایک ایسے باب پر پڑی جس میں صیغہ واحد متکلم کا جا بجا استعمال ہوا تھا۔ تب احساس ہوا کہ اس باب کو لکھتے ہوئے ممدوح کو یہ یاد نہیں رہا کہ وہ خود اپنے بارے میں مقالہ تو ضرور لکھ رہے ہیں لیکن اپنی طرف سے نہیں بلکہ مقالہ نگار کی طرف سے لکھ رہے ہیں۔ بس اسی بات پر ان کی چوری پکڑی گئی۔ بحیثیت ممتحن میں چاہتا تو اس مقالہ کو مسترد بھی کر سکتا تھا لیکن چونکہ یہ مقالہ اُردو کے ایک نامی گرامی پروفیسر نے بھیس بدل کر خود اپنے بارے میں لکھا تھا اس لئے میں نے 'ضرورت شعری' کی طرح 'ضرورت پروفیسری' کے تحت اس مقالہ کو ڈگری کے لئے قبول کرنے کی سفارش کر دی تھی''۔ ہم نے کہا ''حضور! اُردو کے پروفیسروں کی مصلحتوں کو آپ سے بہتر اور کون جان سکتا ہے لیکن جہاں تک ہمارے بارے میں افسر کاظمی کے مقالہ کا تعلق ہے اتنا ضرور عرض کریں گے کہ اُردو کے کسی ریسرچ اسکالر کو ہم جیسا موضوع اور ممدوح نہ ملا ہوگا۔ ہمیں یاد ہے اور برادرم افسر کاظمی کو بھی یاد ہوگا کہ چار پانچ سال پہلے جب انھوں نے اپنے مقالے کے سلسلہ میں ہم سے ملاقات کی تھی تو ہم نے انھیں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہم زندوں پر تحقیق کرنے کے قائل نہیں ہیں اور اگر وہ واقعی ہم پر ریسرچ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مرحوم مان کر ہی ریسرچ کا بیڑہ اٹھائیں اور ہم سے کسی تعاون کی امید نہ رکھیں۔ حد ہوگئی کہ ہم نے انھیں اپنی صحیح تاریخِ پیدائش تک یہ کہہ کر نہیں بتائی کہ جب ہم اس دنیا میں ہیں ہی نہیں تو اپنے پیدا ہونے کی تاریخ کس طرح بتا سکتے ہیں۔ ہم نے یہ احتیاط اس لئے بھی برتی کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک اور ریسرچ اسکالر ہم پر پی ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ لکھنے کی تیاری کر رہے تھے۔ دو ایک بار حیدرآباد میں موصوف جب ہم سے ملے تو احساس ہوا کہ ان کی ساری دلچسپی ہماری مزاح نگاری میں کم اور ان خواتین میں زیادہ ہے جن سے ہماری دوستی رہ چکی ہے۔ موصوف کا شخصی خیال تھا کہ اگر ان خواتین سے ہماری

دوستی نہ ہوتی تو ہماری مزاح نگاری کے تیور کچھ اور ہی ہوتے ۔ بہر حال ہم نے اس وقت طے کرلیا تھا کہ مستقبل میں کسی ریسرچ اسکالر سے تعاون کر کے اپنی ''فرضی حیات معاشقہ'' کو طشت ازبام نہ ہونے دیں گے ۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم افسر کاظمی کی ہمت، اہلیت اور صلاحیت کے قائل ہوگئے کہ ہمارے اتنے سارے منفی رویہ کے باوجود انہوں نے ہمارے بارے میں نہ صرف تحقیقی مقالہ لکھ لیا بلکہ اس پر پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کرلی ۔ سچ ہے ایک ہی ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ۔

اب آپ سے کیا چھپانا کہ شخصی طور پر ہمیں افسر کاظمی کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے ملنے کی بے پناہ خوشی ہے ۔ وہ اس لئے کہ جب بھی کوئی ہم سے ہماری اپنی تعلیمی قابلیت کے بارے میں پوچھتا ہے تو ہم اسے باتوں میں لگا کر کسی اور موضوع کی طرف لیجاتے ہیں ۔ پھر بھی وہ ہماری تعلیمی قابلیت کو جاننے پر اصرار کرتا ہے تو ہم اپنے بچوں کی تعلیمی قابلیت کے بارے میں بتانا شروع کر دیتے ہیں کہ ماشاء اللہ دو بیٹے انجینئر ہیں ۔ ایک بیٹی تاریخ کی لکچرار ہے اور جلد ہی ڈاکٹر بھی بننے والی ہے ۔ دوسری بیٹی بھی ماشاء اللہ اُستاد ہے ۔ پھر بھی وہ اصرار کرے تو ہم اپنی گاڑی کا نمبر اور اس عہدہ کا حوالہ دینے لگ جاتے ہیں جس سے ہم سبکدوش ہوئے ہیں ۔ ایسا کرنے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ۱۹۵۶ میں ہم نے عثمانیہ یونیورسٹی سے روتے بسورتے بی ۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی ۔ چنانچہ اس ڈگری کا پھٹا ہوا ایک چوتھائی حصہ اب بھی ہمارے پاس محفوظ ہے جس میں ہمارا نام اور رول نمبر تو درج نہیں ہے البتہ 'درجہ دوم' میں پاس ہونے کا ثبوت ضرور موجود ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں ہم نے کبھی علم سے کوئی مطلب نہیں رکھا ۔ علم کی اہمیت کا احساس تو ہمیں اس وقت ہوا جب ہم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر باہر نکلے ۔ اور لوگ تو یونیورسٹی سے ایک بار ڈگری لے کر باہر نکلتے ہیں تو پھر کبھی علم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن ہم نے یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد ہی، دوبارہ کسی یونیورسٹی میں ملوث ہوئے بغیر، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کیا جو آج تک جاری ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں اس اعلیٰ تعلیم کی کوئی ڈگری نہیں مل سکی ۔ یہ ضرور ہے کہ ۱۹۷۴ میں لوگوں کے بہکاوے میں آ کر ہم نے دہلی یونیورسٹی کی شام کی کلاسوں میں شرکت کرلی تھی تا کہ وہاں سے ایم ۔ اے کر کے اپنا شمار بھی پڑھے لکھے لوگوں میں کرا سکیں ۔ دو چار دن بعد ہی جب ہمیں نصاب کا علم ہوا تو دیکھا کہ اس میں طنز و مزاح کے پرچہ

میں خود ہماری مزاح نگاری کا جائزہ بھی شامل ہے۔ ہم اس صورتحال سے گھبرا گئے جہاں ہمیں خود اپنی ہی کتابیں پڑھنے پر مجبور کیا جارہا تھا۔ اس کے بعد ہم نے پھر کبھی دہلی یونیورسٹی کا رخ نہیں کیا۔ ہمیں وہ جہالت بدرجہا بہتر لگی جس میں کم از کم یہ پابندی تو نہیں تھی کہ ہم اپنی ہی تحریروں سے زبردستی علم اسی طرح حاصل کریں جس طرح ایک زیر تفتیش ملزم سے اقبال جرم کروایا جاتا ہے۔

تاہم اس کے بعد جب بھی بر سبیل تذکرہ کوئی ہم سے ہماری تعلیمی قابلیت کے بارے میں پوچھ لیتا تھا تو ہمیں کوئی معقول جواب دینے میں ہمیشہ دشواری ہی پیش آئی۔ مگر اب برادرم افسر کاظمی نے ہمیں اس سوال کا ایک معقول سا جواب فراہم کردیا ہے۔ ابھی پچھلے ہفتہ کی بات ہے۔ ایک ہندی رسالہ کے نمائندے نے ہم سے انٹرویو کے دوران میں یہ سوال ہم سے پوچھ لیا تو ہم نے ہنس کر کہا ''بھئی! اپنی تعلیمی قابلیت کے بارے میں آپ کو کیا بتائیں۔ من آنم کہ من دانم۔ رانچی یونیورسٹی میں ایک صاحب نے ہم پر ریسرچ کر کے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی دو اور خوش قسمت یونیورسٹیوں میں دو بدقسمت ریسرچ اسکالر ہماری علمی بصیرت پر اپنی ذہانت کو ضائع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ چاہیں تو ہم جھوٹ موٹ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے مگر پھر بھی ہماری وجہ سے کئی لوگوں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں مل رہی ہیں تو ایسے میں آپ ہماری تعلیمی قابلیت کے بارے میں کیا اندازہ قائم کریں گے؟''۔ ہمارے اس گول مول جواب سے وہ نمائندہ کچھ اتنا متاثر ہوا کہ جتنی دیر وہ ہمارا انٹرویو۔ لیتا رہا بار بار ہمیں ''ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب!'' کہہ کر ہی مخاطب کرتا رہا۔ اپنے نام کے ساتھ ''ڈاکٹر'' کی تکرار کو سن کر مسرت کا جو احساس ہوا اس کا اندازہ یا تو ہم ہی کر سکتے ہیں یا پھر ڈاکٹر افسر کاظمی جنھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل چکی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی 'ڈاکٹریٹ' کی آڑ میں ہم بھی ''ڈاکٹر'' کہلائے جانے لگے ہیں۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ آخر میں ہم اپنے نوجوان دوست ڈاکٹر افسر کاظمی کے شکر گزار ہیں کہ ان کی وجہ سے عمر کے آخری حصہ میں ہمارے درجات بلند ہوتے جارہے ہیں۔

روزنامہ ''سیاست'' (۳۱؍جنوری ۱۹۹۹ء)

☆☆

مرزا غالبؔ کا خط میرزا مجتبیٰ کے نام

(غالب کے یومِ وفات کے موقع پر مزارِ غالب کے احاطہ میں منعقدہ ایک تقریب میں یہ خط پڑھا گیا۔)

برخوردار سعادت اطوار میرزا مجتبیٰ ! دوشنبہ کا دن، پندرہویں تاریخ فروری کی، ڈیڑھ پہر دن گئے ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ تمہارا نامہ لایا۔ تمہارے نامہ کو پڑھا تو نہیں بلکہ لفافہ تک کو چاک نہیں کیا۔ البتہ فوراً جواب لکھنے کو بیٹھ گیا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم نے اپنے نامہ میں کیا لکھا ہوگا۔ میرا تو یہی شیوہ رہا کہ معشوق کو بھی خط لکھتا تھا تو قاصد کی معرفت جواب کے آنے سے پہلے ہی ایک اور نامہ لکھ کر تیار رکھ دیتا تھا۔ اس واسطے کہ میں جانتا تھا کہ کیا وہ لکھیں گے جواب میں۔ ساری زندگی ایسے ہی خطوں کے لکھنے میں گزار دی جنھیں تم جیسے لوگ اب بھی مزے لے لے کر پڑھتے ہو۔

کل چار پانچ اُردو دان حضرات ایک ساتھ مل کر ہندوستان سے خُلد آباد میں آئے ہیں۔ ان دنوں ہندستان سے اُردو دان حضرات کا ادھر آنا بہت بڑھ گیا ہے۔ ہر کوئی منہ اٹھائے دھڑا دھڑ چلا آ رہا ہے۔ بھائی میرے۔ انھیں یہاں آنے سے روکو۔ یہاں ان کا کوئی کام نہیں ہے۔ ویسے منشی ہر گوپال تفتہؔ نے مجھ کو بتایا ہے کہ اب اُن کا وہاں بھی کوئی قابلِ ذکر کام نہیں رہ گیا ہے۔ واللہ اعلم باالصواب۔ مگر مجھے ان کے یہاں جوق در جوق چلے آنے سے تشویش ہے۔ اس واسطے کہ اگر یہ سب کے سب ادھر آ گئے تو ہندوستان میں میرا نام لیوا کون باقی رہ جائے گا۔ ایک

صاحب تمہارا وہ کالم بھی اپنے ساتھ لے آئے ہیں جو تم نے "مست مولا شاعر۔مرزا غالبؔ" کے عنوان سے لکھا ہے۔بندۂ خدا! یہ تو بتاؤ کہ یہ کالم کیا بلا ہے۔میں تو ایک "عالم" کو ہی جانتا تھا جسے میں "حلقۂ دامِ خیال" میں رکھا کرتا تھا۔یہ کالم کوئی نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔کسی نے بتایا کہ لکھنے کے ذریعہ تم جو صفحے کے صفحے کالے کرتے ہو تو اسے "کالم" کہتے ہیں۔مطالعہ سے پتا چلا کہ میری دوصد سالہ سالگرہ تقاریب کی خبر کو نشر کرتے وقت ایک ٹیلی ویژن چینل نے مجھے "اُردو کا مست مولا شاعر" قرار دیا تھا۔بھائی میرے۔میری سمجھ میں تو کچھ نہ آیا۔اب یہ بھلا ٹیلی ویژن کیا بلا ہے۔کسی نے بتایا کہ گھر بیٹھے دنیا کا حال دکھائی دیتا ہے۔بٹن دباؤ تو باہر کے لوگ گھر میں گھسے چلے آتے ہیں۔اگر ایسا ہے تو گھر کی پردہ دار بیبیاں کہاں چلی جاتی ہیں۔کیا نامحرموں کے سامنے بے پردہ بیٹھی رہتی ہیں۔ہائے کیا زمانہ آگیا ہے۔یہ بھی معلوم ہوا کہ ٹیلی ویژن پر ایسی نازنینوں کے رقص بھی دکھائے جاتے ہیں جن کے بدن پر انگوٹھی، جھمکوں اور گھڑی کے سوائے کوئی قابلِ لحاظ لباس نہیں ہوتا۔میں تو لباسِ مجاز کو ہی دیکھتا رہ گیا۔کبھی لباسِ غیر مجاز کی طرف دھیان نہیں گیا۔افسوس کہ میرے زمانے میں یہ سہولت نہیں تھی ورنہ میں ڈومنی کے کوٹھے پر کیوں جاتا۔بٹن دبا کر اسے کوٹھے سمیت بہ نفس نفیس گھر میں ہی بلا لیتا۔اب اپنی قبل از وقت موت پر آنسو بہاتا ہوں۔

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

اور سناؤ وہاں کا کیا حال ہے۔تم حال نہ بتاؤ تو تب بھی مجھے معلوم ہو ہی جاتا ہے۔لو ایک واقعہ سنو۔پچھلے دنوں ایک صاحب جو مرنے سے پہلے دہلی میں رہا کرتے تھے عالم بالا میں آئے تو ان کے اعمال کے مطابق منکر نکیر نے انھیں دوزخ میں بھیج دیا۔دوزخ میں پہنچ کر وہ بہت خوش ہوئے۔کہنے لگے اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے مجھ گنہگار کو جنت میں بھیج دیا۔اس پر منکر نکیر نے کہا "بندۂ شیطان! یہ جنت نہیں دوزخ ہے دوزخ"۔بولے "اگر یہ سچ مچ دوزخ ہے تو تب بھی میں اسے جنت ہی سمجھوں گا کیونکہ مجھے تو یہاں کے حالات دہلی کے حالات سے بہتر نظر آتے ہیں۔" بس مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم وہاں کس حال میں ہو۔اور ہاں پچھلے دنوں ایک سیاسی رہنما بھی ہندستان سے آئے تھے۔دوزخ میں جانے سے پہلے دوزخ کے داروغہ سے بار بار کہہ رہے تھے کہ انھیں دوزخ کے ایرکنڈیشنڈ حصہ میں رکھا جائے۔ان کا کہنا تھا کہ وہ تو جیلوں میں بھی ایرکنڈیشنڈ کمروں میں رہنے کے عادی رہے ہیں۔مجھ کو ذرا یہ بتاؤ کہ یہ ایرکنڈیشننگ کیا بلا ہے۔

تاہم مجھے اس وقت اپنا ایک شعر یاد آ گیا۔ ؎

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

ایک دلچسپ بات اور سنو۔ تمہارے بچپن کے دنوں کے مشہور گلوکار عزیزی کے۔ ایل۔ سہگل بھی اکثر میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ بہت بھلے آدمی ہیں۔ میرے ہم مشرب نہ سہی 'ہم مشروب' تو ہیں۔ میرے نام لیوا اور عقیدت مند ہیں۔ بتا رہے تھے کہ نیچے کی دنیا میں میری شہرت میں دس بارہ چاند لگا کر آئے ہیں۔ اس واسطے کہ انھوں نے میری غزلوں کو اپنی مخصوص آواز میں گایا ہے۔ دو ایک بار نمونہ کے طور پر میری دو چار غزلیں گا کر بھی سنائی تھیں۔ آواز تو اچھی ہے مگر گلے میں خراش کا عنصر کچھ زیادہ ہے۔ منشی ہر گوپال تفتہ کہتے ہیں کہ ان کے گلے میں بڑا سوز اور بڑا درد ہے۔ ہو سکتا ہے منشی جی ٹھیک کہتے ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اگر کے۔ ایل۔ سہگل اپنے گلے کے درد کا علاج کرا لیتے تو اور بھی اچھا گا سکتے تھے۔ میں نے دو ایک شعروں پر داد دی تو یوں جھک جھک کر آداب کرنے لگے جیسے یہ غزل میں نے نہیں انھوں نے کہی ہو۔ اس سے اندازہ ہوا کہ بے حد مہذب اور شائستہ آدمی ہیں۔ اور ہاں یہ گانے کے بیچ میں کھانستے بھی ہیں۔ میں نے سمجھا کہ شاید کھانسی ہو گئی ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ہندوستان کی موسیقی میں اب کھانسی بھی موسیقی کا حصّہ بن گئی ہے۔ جب ہم 'ضرورت شعری' کے تحت شاعری میں دست درازی کرتے ہیں تو گانے والے 'ضرورت موسیقی' کے تحت کیوں نہ کھانسیں۔ مجھے تو بس اتنی شکایت ہے کہ کھانسی کے دوران میں میرے بعض شعر وزن سے گر جاتے ہیں۔ میں نے اس بات کی شکایت کی تو بڑی معصومیت سے بولے ''حضور! صرف شعر ہی تو گرا رہا ہوں۔ آپ کو تو نہیں گرا رہا ہوں۔'' اب ایسے معصوم شخص سے میں اور کیا بحث کرتا۔ اور ہاں ہندستانی کلاسیکی موسیقی کے ایک استاد بھی مجھ سے ملنے بطور خاص آئے تھے۔ ایک دن میری غزل ''نکتہ چیں ہے غم دل اُس کو سنائے نہ بنے'' گانے کے لیے بیٹھ گئے۔ ماشا اللہ آواز بہت اچھی پائی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ گلے میں اتنا درد نہیں ہے جتنا کہ سہگل کے ہاں پایا جاتا ہے۔ غزل بہت اچھی گائی لیکن خرابی یہ دیکھی کہ اچھا بھلا گاتے گاتے کسی ایک لفظ کو بار بار دوہرانے لگتے ہیں اور راگ الاپنا شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے تو انھوں نے شعر کے ''غمِ دل'' کو اچھی طرح اپنے گلے کی مٹھی میں جکڑ لیا۔ پھر ''غمِ دل'' کی گردان شروع کی تو کچھ اس

طرح کی اور اتنی مرتبہ کی کہ دل کا سارا غم نچوڑ کے رکھ دیا۔ پھر نچوڑے ہوئے دل کو پرے پھینکا تو اچانک ''نکتہ چیں'' پر ٹوٹ پڑے۔ پھر جی میں نہ جانے کیا آئی کہ نکتہ کو بھی ہٹا کر رکھ دیا اور ''چیں'' کے پیچھے پڑ گئے۔ اب جو انھوں نے ''چیں چیں چیں'' کا ورد شروع کیا تو بھیا میں بھی چیں بول گیا۔

میرزا مجتبیٰ! ذرا ادھر آؤ میرے پاس آن بیٹھو۔ دل لگی کا ایک قصہ اور سنو۔ قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی اور مالک رام رہتے تو یہیں خلد آباد میں ہیں لیکن تم حیرت کرو گے کہ آج تک ان ماہرین غالبیات سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ تینوں مجھ سے منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ ایک دن میں نے میر مہدی مجروحؔ کے ذریعہ پیغام بھجوایا کہ بندگان خدا کبھی تو آن ملو۔ تینوں نے بیک زبان ہو کر میاں مہدیؔ سے کہا ''ہم کیوں غالبؔ سے ملنے جائیں۔ ہم تو ماہرین غالبیات ہیں۔ کیا تم غالب اور ماہرین غالبیات کا فرق بھی نہیں جانتے۔ غالبؔ کو خود چل کر ہمارے پاس آنا چاہئے۔ غالبؔ نے جو بھی زندگی گزاری تھی وہ تو پندرہ فروری ۱۸۶۹ء کو ہی اس کی طبعی موت کے بعد ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد جس غالبؔ کو ہم نے دریافت کیا ہے یا دوبارہ پیدا کیا ہے وہ تو ہماری تخلیق ہے۔ غالبؔ جیسے شخص کی زندگی کی بازیافت کے لیے ہم تینوں نے اپنی بیش قیمت زندگیاں ضائع کی ہیں۔ ہمارے غالبؔ کا اُس غالبؔ سے کیا تعلق جو ۱۸۶۹ء سے پہلے اس دنیا میں زندہ تھا۔''

اس کے جواب میں میر مہدی مجروح نے کہا ''حضور والا! غالبؔ کی زندگی کی بازیافت کے لیے آپ حضرات بلاوجہ قدیم تذکروں اور مخطوطات وغیرہ کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ کیوں نہیں آپ خود چل کر غالبؔ سے پوچھ لیتے۔'' مولانا امتیاز علی عرشی بولے ''آپ بھی کس کا ذکر لے بیٹھے۔ غالبؔ کے قول اور فعل کا بھی کوئی بھروسہ ہے۔ اب یہی دیکھو کہ مذاق مذاق میں یہ بات اُڑا دی کہ اس کے فارسی کلام کے استاد کوئی ملا عبدالصمد تھے۔ ہم برسوں سے اس اُستاد کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ پچھلے دنوں خلد آباد میں کسی ملا عبدالصمد کی فارسی دانی سے متاثر ہو کر مالک رام یہ جاننے کے لئے اس کے پیچھے پڑ گئے کہ کہیں وہ تو غالبؔ کے فارسی کلام کا استاد نہیں ہے۔ ارے صاحب وہ تو اس بات پر اتنا مشتعل ہوا کہ ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ قاضی عبدالودود نے بیچ میں پڑ کر ملا عبدالصمد کو مالک رام سے الگ کیا۔ تب بھی یہ جعلی عبدالصمد،

جاتے جاتے مالک رام کی شیروانی کے اوپر کے دو بٹن لے گیا۔"

میر مہدی مجروح کی زبانی یہ واقعہ سن کر میں بہت ہنسا۔ واللہ باللہ مجھے ان ماہرین غالبیات سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ مجھ سے نہیں ملنا چاہتے تو نہ ملیں لیکن یہ مخطوطات کی گرد میں اپنے گز گز بھر کے ہاتھ کیوں اٹائے پھرتے ہیں۔ کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔ تم ہی بتاؤ مجھے ان سے کیا لینا دینا ہے۔ یوں بھی میرے کام تو چلتے ہی رہتے ہیں :

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

میں نے سنا ہے کہ تمہارے ہاں ماہرین غالبیات کی بڑی عزت ہے اور وہ میرے سیمیناروں میں شرکت کی خاطر ہوائی جہازوں میں اُڑتے پھرتے ہیں اور بھاری معاوضوں سے اپنی جیبیں بھرتے ہیں۔ ہر آدمی اپنا رزق اپنے اپنے ڈھنگ سے کماتا ہے۔ بھائی میرے! یہ تو بتاؤ کہ میں نے اپنی پنشن کے لیے جو عرضیاں دی تھیں اُن کا کیا ہوا؟۔ مجھے تو اپنی تنگدستی کی فکر کھائے جا رہی ہے۔

تمہارے کالم سے پتا چلا کہ عزیزی جگجیت سنگھ نے میری مشہور غزل "ہزاروں خواہشیں ایسی کی ہر خواہش پہ دم نکلے" کو گاتے ہوئے یہ شعر بھی مجھ سے منسوب کر دیا: ؎

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اُٹھا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

تم نے اپنے کالم میں اس شعر کے بارے میں شبہ ظاہر کیا کہ یہ شعر میرا نہیں ہوسکتا۔ اس پر کئی اصحاب نے حوالوں کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ شعر میرا ہی ہے۔ تم نے پریشان ہو کر اس معاملہ کو دو جید ماہرین غالبیات شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر نثار احمد فاروقی کے علاوہ "آج کل" کے مدیر محبوب الرحمٰن فاروقی سے رجوع کیا۔ میاں یہ تمہاری شرارت نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک ہی شعر کے پیچھے تین تین نامی گرامی "فاروقیوں" کو لگا دیا۔ خیر بعد میں عزیزی کالی داس گپتا رضا نے یہ کہہ کر تمہاری مشکل آسان کر دی کہ یہ شعر بہادر شاہ ظفر کا ہے۔ مگر سنا ہے کہ کچھ ستم ظریف مندرجہ ذیل شعر کو بھی مجھ سے منسوب کرنے پر اصرار کر رہے ہیں: ؎

ذرا دے زور سینہ پر کہ تیرِ پُرستم نکلے
جو یہ نکلے تو دل نکلے، جو دل نکلے تو دم نکلے

بھائی میرے! میں نے کبھی ایسے دفتری شعر نہیں کہے جن میں ہر کام ''تھرو پراپر چینل'' انجام پاتا ہو۔ یعنی پہلے تو سینے سے تیرِ پُرستم نکلے اور پھر تیرِ پُرستم نکلے تو پھر دل نکلے۔ اور اگر دل نکل جائے تو اس میں سے بالآخر دم نکلے۔ بھیا! یہ شعر ہے یا کسی دفتر کی فائیل۔ ایسے چونچلوں والے شعر داغؔ دہلوی یا نوحؔ ناروی وغیرہ کے تو ہو سکتے ہیں میرے نہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ میں نے دل کے معاملہ میں کبھی احتیاط نہیں برتی بلکہ میں تو بوقت ضرورت دل بھی بازار سے لے آتا تھا۔ اب اگر کوئی مجھے ''مست مولا شاعر'' کہتا ہے تو کہنے دو۔ تم کیوں ناحق پریشان ہوتے ہو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ مجھے شاعر تو تسلیم کرتا ہے۔ چاہے وہ مست مولا ہو یا بدمست مولا۔ اگر وہ مجھے شاعر بھی نہ مانے تو تم کیا کرلو گے۔ اور میں تو کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

میاں مجتبیٰ! بہت عرصہ پہلے میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر یہ شعر کہا تھا:۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

میں نے یہ شعر اس لیے کہا تھا کہ میرے مرنے کے بعد اگر کسی نے میرے مزار کی طرف توجہ نہ کی تو میرے مزار کی جو بے حرمتی ہونی ہے سو ہوگی، میری بھی کچھ کم نہ ہوگی۔ اس خیال سے غرق دریا ہونے کو بہتر جانا تھا۔ مگر خدا بھلا کرے بیگم حمیدہ سلطان کا کہ پچھلے چالیس برسوں سے ہر سال میرے یوم وفات پر میرے مزار کے احاطہ میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کرتی ہیں اور نامی گرامی عمائدین شہر کو بلاتی ہیں۔ یقین مانو جب سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے مجھے اپنے ''یوم وفات'' کا بڑی بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ تم سوچو گے بھلا کوئی اس طرح بھی اپنے ''یوم وفات'' کا انتظار کرتا ہے۔ مگر میں تو کرتا ہوں۔ اس لیے کہ یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے۔ سنا ہے کہ اس سال کی تقریب میں تین تین سابق گورنروں کو مہمانانِ خصوصی کے طور پر مدعو کر رکھا ہے۔ 'سابق' کی پابندی غالباً اس لیے رکھی ہے کہ میں بھی تو سابق شاعر ہوں۔ کیا کروں میرا سابقہ بھی تو ''سابقوں'' سے ہی پڑتا رہتا ہے۔ یوں بھی میرے معاملات میں اب ''لاحقے'' کم اور ''سابقے'' زیادہ نظر آتے ہیں۔ اگر زندہ ہوتا اور یہ تینوں گورنر برسر اقتدار ہوتے تو کیا مجال جو میرے قصیدوں کی زد میں آنے سے بچ رہتے۔ بیگم حمیدہ سلطان کو میرا سلام پہنچاؤ اور کہو کہ میرے یوم وفات پر میرے کسی مصرع طرح پر جو سالانہ مشاعرے منعقد ہوتے ہیں انہیں میں اپنے مزار میں پڑے

پڑے بہت غور سے سنتا ہوں۔ میری تو خیر مجبوری ہے کہ میں مزار سے اُٹھ کر بھاگ نہیں سکتا لیکن ان مظلوم سامعین کو کس نے روکا ہے۔ کیا فیوی کول سے چپکائے جاتے ہیں۔ شاعر سوچ سمجھ کر شعر نہ کہے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے لیکن سامع بھی سوچے سمجھے بغیر داد دے سکتا ہے یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ میں سخنوری کو اتنا اہم نہیں مانتا جتنا کہ سخن فہمی کو۔

میرزا مجتبیٰ! نامہ طویل ہوتا جارہا ہے اور ادھر حورانِ خُلد میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں کہ میں نامہ کو یہاں ختم کردوں۔ پوچھ رہی ہیں کہ کس نابکار کو اتنا طویل نامہ لکھا جارہا ہے۔ یہ حورانِ خُلد بھی عجیب وغریب مخلوق ہیں۔ ان کے حُسن کا عالم کیونکر بیاں کروں۔ بیچاری اُردو زبان میں یہ تاب اور یہ مجال کہاں کہ ان کے حُسن کا احاطہ کرسکے۔ مگر ایک راز کی بات سنو۔ حسن کی اتنی فراوانی اور افراط وتفریط کے باوجود حُورانِ خلد میں مجھے وہ صورت نظر نہیں آتی جس کے لیے میں شعر کہا کرتا تھا۔ یقین مانو ان کی صحبت میں میرا جی بالکل نہیں لگتا۔ ہر آن دسیوں حورانِ خُلد میرے آگے پیچھے منڈلاتی رہتی ہیں۔ میری ایک نگاہ التفات کے لیے ایک دوسرے پر گری پڑتی ہیں۔ تم جانتے ہو کہ میں ایسے وصل کا کبھی خوگر نہیں رہا جس کے پیچھے ہجر کی لمبی راتیں نہ ہوں، ٹھنڈی آہوں کا ہجوم نہ ہو، چاک کیے ہوئے گریبانوں کا ڈھیر نہ ہو، ظالم سماج کا آہنی شکنجہ نہ ہو، قاصد کا سہارا اور دربان کی لعن طعن نہ ہو، رقیب کی ریشہ دوانیاں اور ناصح کی لن ترانیاں نہ ہوں۔ سچ مانو میں تو یہاں آکر "وصل کی بدہضمی" کا شکار ہوگیا ہوں۔ ایسا وصل فرشتوں کے بس میں ہوتو ہو انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ طویل نامہ بھی تمہیں صرف اس خیال سے لکھ رہا ہوں کہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی "وصل کے عذاب" سے تو بچا رہوں۔ لو یہ دیکھو۔ حورانِ خُلد نے نامہ کو زبردستی مرے ہاتھ سے چھیننا شروع کردیا ہے۔ اب کیا خاک لکھوں:

نامے کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

تم سے نجات کا طالب

غالب

روزنامہ "سیاست" (۱۵رفروری ۱۹۹۹ء)

☆☆

اُردو اخبار خرید کر نہ پڑھیں

بیشتر اُردو اخباروں میں آپ کو اس قسم کی عبارتیں اکثر پڑھنے کا موقع ملا ہوگا۔

☆ اُردو اخبار خرید کر پڑھیں۔

☆ اُردو بولیے، اُردو لکھیے اور اُردو پڑھیے۔

☆ اُردو ہمارا قیمتی اثاثہ ہے۔

ایسی عبارتوں کو لکھنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اُردو اخبار خرید کر پڑھنے کی تلقین کرنے والی کسی ایسی عبارت کو پڑھتے وقت اگر آپ اتفاق سے مفت میں ملا ہوا اُردو اخبار پڑھنے میں مصروف ہوں تو اسے فوراً پرے پھینک دیں اور سچ مچ اُردو اخبار خرید کر لے آئیں اور اسے پڑھنا شروع کر دیں۔ اس کا مقصد یہ بھی نہیں ہوتا کہ آپ واقعی اُردو پڑھنا اور لکھنا شروع کر دیں یا اُردو کو اپنا قیمتی اثاثہ سمجھ کر کوئی اور اثاثہ جیسے مکان، کھیتی، اور موٹر وغیرہ اپنے پاس نہ رکھیں۔ یہ نہ سمجھیں کہ اگر آپ کے پاس اُردو جیسا قیمتی اثاثہ موجود ہے تو آپ کو کسی اور اثاثے کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل ایسی عبارتیں عموماً خود اخبار کا پیٹ بھرنے کے کام آتی ہیں (اور پیٹ تو بدکار رہتا ہی ہے)

ایسی عبارتیں اسی وقت لکھی جاتی ہیں جب معلوم ہو کہ اخبار کی کاپی پریس میں جانے کے لیے تیار ہے اور کسی صفحہ پر دو چار سطروں کی جگہ باقی رہ گئی ہے تو کاتب ایسی خالی جگہ کو اُردو کے اس قیمتی اثاثہ کی مدد سے پُر کرتا ہے جو اسے آسانی سے میسر آجاتا ہے یا پھر اس کام کے لیے اُردو کی تہذیبی شناخت کو زحمت دیتا ہے۔ بیشتر کاتب حضرات فطرتاً نہایت نیک، پاکباز، خداترس، ایماندار

وغیرہ ہوتے ہیں اور ''کتابت کی غلطی'' کے سوائے زندگی میں ان سے کوئی اور قابل لحاظ غلطی سرزد نہیں ہوسکتی۔ کتابت کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ اگر آدمی ایک بار اس پیشہ کو اختیار کرلے تو سدا کے لیے شرافت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ کوئی اور غیر شریفانہ کام (جو ہم میں سے اکثر کرتے رہتے ہیں) انجام دینے کے قابل نہیں رہ جاتا۔ ایسا شریف آدمی جب چوری، ڈکیتی، رہزنی، اغوا، قتل، غارتگری وغیرہ کی خبریں لکھتے لکھتے بیزار ہو جاتا ہے اور اتنے سارے فالتو جرائم کے ارتکاب کے بعد بھی اخبار میں تھوڑی سی جگہ باقی رہ جاتی ہے تو اس کی رگ شرافت پھڑک اٹھتی ہے اور وہ اسے پُر کرنے کے لیے بسا اوقات اخلاقی اور بعض اوقات دینی نعروں کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جیسے نیکی جنت کی کنجی ہے۔ قبر کے عذاب سے ڈرو اور اپنی عاقبت سنوارو وغیرہ۔ غرض جن باتوں پر عمل کرنا تو بہت دور کی بات ہے جنہیں ہم بالکلیہ فراموش کر چکے ہیں، انھیں نعروں کی شکل دے کر اخبار کی زینت بنا دیا جاتا ہے۔

رہی اُردو اخبار کو خرید کر پڑھنے کی بات تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ان دنوں کوئی بھی چیز (چاہے وہ انگریزی کا اخبار ہی کیوں نہ ہو) بھاؤ تاؤ اور مول تول کے بغیر خریدی نہیں جاتی۔ معاشیات کا یہ ادنیٰ سا اُصول ہے جس پر ہم جیسا کم علم روشنی ڈالے گا بھی تو کتنی ڈالے گا اور کتنی دور تک ڈالے گا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ گھریلو خواتین بازار سے سبزی خریدنے جاتی ہیں تو پچاس پیسہ کا دھنیا لیتے وقت بھی دکانداروں سے اچھی خاصی بحث کر لیتی ہیں۔ پھر اخبار تو دو روپے کا آتا ہے (چاہے وہ اُردو کا ہی کیوں نہ ہو)۔ اسے ویسے ہی کیسے خرید لیں۔ آپ یقین کریں کہ دہلی میں ہمارے ایک پڑوسی ہیں بی ایل شرما۔ انگریزی کا ایک مشہور روزنامہ ہر روز منگاتے ہیں لیکن روز کا اخبار روز ہی خریدتے ہیں اور ماشاء اللہ مول تول کے بعد خریدتے ہیں۔ ہر روز اخبار کے ہاکر سے قیمت کے معاملہ میں ان کی بحث ہو جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اخبار کے انتظامیہ نے اگر روز کے اخبار کی قیمت دو روپے مقرر کر دی ہے تو میں اسے آنکھ بند کر کے کیسے خرید لوں۔ جب تک یہ نہ دیکھ لوں کہ اس دن کے اخبار میں کتنی مالیت کی خبریں آئی ہیں۔ کہیں میرا نقصان تو نہیں ہو رہا ہے۔ اُنھوں نے اپنے حساب سے ہر خبر کے دام مقرر کر رکھے ہیں۔ اخبار میں دس کروڑ روپے کی مالیت والے گھوٹالے کی خبر ہو تو اس کے پچھتر پیسے دام لگاتے ہیں۔ زنا بالجبر کی خبر کے دس پیسے، قتل کی وارداتوں سے متعلق خبروں کے دام فی قتل کے حساب سے دس

پیسے ادا کرتے ہیں۔(اخباروں کی خوش بختی ہے کہ روزانہ پانچ چھ قتل تو ہو ہی جاتے ہیں)۔اغوا کی خبر کے پچیس پیسے، موسم کے حال کے دو پیسے اور کارٹون کے پانچ پیسے مقرر کر رکھے ہیں۔جب تک یہ ہاکر سے اخبار میں چھپی خبروں کی تفصیل نہیں جان لیتے تب تک اخبار کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ہم نے تو ایک دن یہاں تک دیکھا کہ ہاکر اپنے کمیشن کے پیسوں سے دستبردار ہو کر انھیں دو روپے کا اخبار ایک روپے پچھتر پیسے میں دے کر چلا گیا۔کہتے ہیں ''میں تو شمارے کے حساب سے اخبار نہیں خریدتا۔خبروں کے حساب سے خریدتا ہوں۔کسی دن اخبار میں واجبی خبریں نہ ہوں تو میں زائد دام کیوں ادا کروں۔میں تو پچیس پیسے کی ہری مرچ بھی بھاؤ تاؤ کے بغیر نہیں خریدتا۔ دو روپے کا اخبار آنکھ بند کر کے کیسے خرید لوں۔چیزوں کے دام تو روز ہی اترتے چڑھتے رہتے ہیں۔ پھر یہ اخبار والے کون ہوتے ہیں جو مہینہ بھر دو روپے کے حساب سے اپنا اخبار مجھے بیچتے ہیں۔ اخباروں کی قیمت ہر روز بدلنی چاہیے۔اخبار والوں نے معاشیات نہ پڑھی ہو تو نہ پڑھی ہو لیکن میں نے تو بی۔اے میں اختیاری مضمون کے طور پر پڑھی ہے۔اسے کیسے بھول جاؤں۔''

ویسے ہمارے شرماجی کی بات نہایت معقول ہے۔دور کیوں جائیں ہم خود بھی چیزوں کو خریدنے کے معاملے میں ہر روز بھاؤ تاؤ کرتے رہتے ہیں (یہ الگ بات ہے کہ اس کے باوجود مہنگے دام ادا کرتے ہیں) مول تول پر ہمیں وہ لطیفہ یاد آ گیا کہ ایک خان صاحب لاہور گئے تو انارکلی میں شاپنگ کے ارادے سے نکلے۔ان کے میزبان نے کہا انارکلی کے بیوپاریوں سے ہوشیار رہو۔اگر وہ کسی چیز کے دام پچاس روپے بتائیں تو تم اس کے دام پچیس روپے دینا۔خان صاحب نے موزے کی ایک جوڑی پسند کی تو دکاندار نے اس کے دام پچاس روپے بتائے۔خان صاحب نے کہا ''مگر میں تو اس کے صرف پچیس روپے دوں گا۔'' دکاندار تھا بڑے دل کا آدمی۔ اس نے کہا ''حضور آپ ہمارے مہمان ہیں۔پچیس روپے کی کیا اہمیت ہے۔آپ تو یہ جوڑی مجھ سے مفت میں لے جائیں۔'' اس پر خان صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد فرمایا ''اگر مفت میں دینے کی بات ہے تو میں تب بھی دو جوڑی سے کم نہ لوں گا۔'' ہمیں یہ لطیفہ اس لیے یاد آیا کہ مفت میں اُردو اخبار پڑھنے والوں کو اگر اس لطیفہ کا پتہ چل گیا تو کہیں وہ اخبار والوں سے یہ مطالبہ نہ کر بیٹھیں کہ میاں مفت میں اپنا اخبار پڑھوانا چاہتے ہو تو اخبار کی دو کاپیاں روانہ کیا کرو۔ایک کاپی کی مدد سے مفت میں اُردو اخبار پڑھنا یوں بھی دشوار ہوتا جا رہا ہے کیوں کہ اور لوگ بھی تو قطار باندھے

پیچھے کھڑے رہتے ہیں۔ لیجئے ہم بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ اس تحریر کو لکھنے کی ضرورت ہمیں اس لیے پیش آئی کہ کلکتہ کے اُردو اخبار ''مشرق'' میں ایک صاحب اے. جی نذر کا ایک درد بھرا مراسلہ کل ہی ہماری نظر سے گزرا ہے۔ (مخفی مباد کلکتہ کے دو اخبار ''آزاد ہند'' اور ''مشرق'' ان کے ایڈیٹروں احمد سعید ملیح آبادی اور وسیم الحق کی عنایت سے پچھلے کئی برسوں سے ہمارے پاس مفت آتے ہیں) جی اے نذر نے اظہار افسوس کیا ہے کہ بیشتر اُردو والے خرید کر اخبار نہیں پڑھتے۔ اگر خریدتے بھی ہیں تو ایک ہی اخبار کو اتنے سارے لوگ مل کر پڑھتے ہیں کہ اخبار کی سطریں تک دھندلی ہو جاتی ہیں۔ اُردو قارئین کی دیگر ضروریات کا خرچ تو آئے دن بڑھتا رہتا ہے اور وہ اس کی پابجائی بھی کرتے رہتے ہیں لیکن اُردو اخبار خریدنے کے لیے اُن کے بجٹ میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ یہ خاصا طویل مراسلہ ہے جس کا مقصد اُردو والوں کے ضمیر کو جھنجوڑنا ہے (بشرطیکہ یہ جھنجوڑا جا سکے)۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہم خود کو اس معاملہ میں رائے زنی کا اہل نہیں پاتے کیوں کہ خود ہمارے پاس ہندستان کے کئی اُردو اخبارات مفت میں آتے ہیں۔ کس منہ سے اُردو کے مفت خورے قارئین پر چوٹ کریں۔

جی اے نذر کی باتوں سے ہمیں صد فی صد اتفاق ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگ اب اُردو پڑھنے کو ہی کسرِ شان سمجھنے لگے ہیں۔ (مفت میں اُردو اخبار پڑھنے کی بات تو پھر بھی قابلِ قبول ہے)۔ ابھی پچھلے ہفتہ کی بات ہے، ہم نے اپنی نئی کتاب کا ایک اعزازی نسخہ اپنے ایک دوست کی خدمت میں پیش کیا تھا (اعزازی نسخہ اس کو کہتے ہیں جو بصد احترام مفت میں کسی کی خدمت میں پیش کیا جائے)۔ کل ہم اپنے دوست کے دفتر گئے تو دیکھا کہ اُروندھتی رائے کی انگریزی کتاب ''The God of Small Things'' کے مطالعہ میں غرق ہیں اور ہنستے چلے جا رہے ہیں۔ ہم نے کہا ''بھیا اروندھتی رائے کی یہ کتاب ہم نے بھی پڑھی ہے۔ ہمیں تو اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جس پر ہنسا جا سکے''۔ بولے ''بیوقوف آدمی! میں اروندھتی رائے کی باتوں پر کہاں ہنس رہا ہوں۔ میں تو تمہاری باتوں پر ہنس رہا ہوں۔'' ہم نے حیرت سے پوچھا ''کیا مطلب؟''۔ ہماری تازہ کتاب کو اروندھتی رائے کی کتاب کے سرورق کے برقعے میں سے باہر نکالتے ہوئے بولے۔ ''دیکھو یہ رہی تمہاری کتاب۔ میں نے اس پر اروندھی رائے کی کتاب کا سرورق مصلحتاً چڑھا رکھا ہے۔ تم جہاندیدہ آدمی ہو۔ جانتے ہو کہ میں گزیٹیڈ عہدیدار ہوں۔ دفتر میں میری بڑی عزّت ہے۔ اگر کسی

نے مجھے اُردو کتاب کو پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو میری کیا عزت رہ جائے گی۔"

اس واقعہ کی روشنی میں اگر کچھ اصحاب کھلم کھلا اُردو اخبار پڑھتے ہیں (چاہے وہ مفت میں ہی کیوں نہ ملا ہو) تو ایسے لوگوں کے خلاف کچھ کہنا نہ ہمیں زیب دیتا ہے اور نہ ہی جی اے نذر کو زیب دیتا ہے۔

ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

روزنامہ "سیاست" (نومبر ۱۹۹۹ء)

اعزازات برائے فروخت

جب مکان فروخت ہو سکتے ہیں، موٹریں، ریفریجریٹر اور پرانے صوفہ سیٹ بک سکتے ہیں اور جب آدمی کی عزت، عصمت اور ضمیر کا شمار بھی ''بکاؤ مال'' میں ہونے لگے تو اعزازات کیوں نہ فروخت ہوں۔ ایک زمانہ میں اعزازات بڑی مشکل سے ملتے تھے، اب کھلے عام ملتے ہیں۔ بازار جائیے اور ایک اعزاز خرید کر لے آئیے۔ اعزازات سے ہم یوں بھی بہت گھبراتے ہیں کیونکہ جس طرح کے اعزازات ان دنوں ملنے لگے ہیں انھیں پانے کے بعد آدمی کی عزّت میں اضافہ کی بجائے کمی واقع ہو جاتی ہے۔ پھر ان دنوں اعزازات بھی تو بہت ملنے لگے ہیں۔

ماہنامہ ''بیسوی صدی'' کے تازہ شمارے میں ہمارے دوست ملک زادہ منظور احمد نے اپنی سرگذشت ''رقصِ شرر'' میں ہمارے حوالے سے ایک بات لکھی ہے جسے آپ ان ہی کی زبانی سنیئے

''نیشنل کونسل فار پروموشن آف اُردو کی ایک میٹنگ میں مجتبیٰ حسین نے اپنے مخصوص طنزیہ و مزاحیہ انداز میں ایک بات کہی جو بہت معنیٰ خیز اور بلیغ تھی۔ میں نے ان سے کہا ''بہت دنوں کے بعد ملاقات ہو رہی ہے''

وہ بولے ''ہاں! میں بہت کم گھر سے نکلتا ہوں، ڈرنے لگا ہوں''

میں نے دریافت کیا ''کس چیز کا ڈر؟''

کہنے لگے ''ڈرتا ہوں کہ کہیں کوئی پکڑ کر مجھے ایوارڈ نہ دے دے۔''

سب کے سب جو وہاں موجود تھے ہنس پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو دنیا میں اب اتنے زیادہ ایوارڈ ہو چکے ہیں کہ اب ان کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے"

سچ پوچھیے تو ملک زادہ منظور احمد کو ہم اس خطرے کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتانا چاہتے تھے لیکن چونکہ یہ ایک سرکاری میٹنگ تھی اس لیے اختصار سے کام لیتے ہوئے دو جملوں میں اپنی بات کہہ دی۔

یہ ایک اتفاق ہے کہ پچھلے دنوں "سیاست" میں مرزا صفدر علی بیگ کا ایک مضمون "اعزازات کی خرید وفروخت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ اعزازات کی خرید وفروخت کا کام اب ایک عالمی وبا کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ چنانچہ کیمبرج کا ایک ادارہ "انٹرنیشنل بائیوگرافکل سینٹر" ہر سال پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کی لاتعداد شخصیتوں کو "بیسویں صدی کی اہم شخصیت" یا "سال کی ممتاز شخصیت" کا اعزاز دینے کی پیش کش کرتا ہے۔ جیسے ہی آپ اس اعزاز کو قبول کر لیتے ہیں، ادارہ کی طرف سے آپ کو دلی مبارکباد پیش کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ بھیا! اس صدی کی یا اس سال کی اہم شخصیت بننے کی خوشی میں فوراً ۱۵۰ یا ۱۵۰۰ امریکی ڈالر روانہ کرو۔ اب جو لوگ سستی شہرت کے لیے مہنگے دام دینے کے اہل ہوتے ہیں وہ فوراً یہ رقم روانہ کر دیتے ہیں۔ مرزا صفدر علی بیگ نے ہندستان کے نام نہاد دانشوروں سے اپیل بھی کی ہے کہ وہ ایسے نام نہاد اداروں سے دور رہیں۔ ادارہ بھلے ہی آپ کی خدمات سے واقف نہ ہو لیکن آپ تو اپنی خدمات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ انھیں شکایت بھی ہے کہ جو اصحاب ایسے اعزازات خرید لیتے ہیں، وہ بعد میں اخباروں میں اس اعزاز کی تشہیر بھی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ معصوم لوگ ان کے اعزاز میں دھڑا دھڑ خیر مقدمی جلسے منعقد کرتے ہیں۔ خود فریبی کی یہ ایک بھیانک مثال ہے۔ ہمیں صفدر علی بیگ کی شکایت سے اختلاف ہے کیونکہ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ "احمقوں کی جنت" بھی ایک جگہ ہوتی ہے جہاں ایسے ہی لوگوں کو رکھا جاتا ہے۔ اگر ایسے لوگ نہ ہوں تو یہ جنت خالی رہ جائے گی۔ اب آپ سے کیا چھپائیں کہ پچھلے پانچ چھ برسوں سے اس ادارہ کی جانب سے ہمیں بھی ہر سال بڑی پابندی کے ساتھ ایک خط آتا ہے کہ بھائی جان ڈیڑھ سو ڈالر بھیجیے اور جاریہ سال کے سب سے عظیم دانشور بن جائیے، سودا مہنگا نہیں ہے۔ مانا کہ ادارہ کے لیے سودا مہنگا نہیں ہے لیکن ہمارے لیے تو ہے۔ اگر ایک سال میں ہم نے دس بارہ ہزار روپے

صرف اعزاز خریدنے پر صرف کردیے تو گھر کی دال روٹی کا خرچ کیسے چلے گا۔ یہی نہیں ہمارے پاس امریکہ کے مقام نارتھ کیرولینا سے شائع ہونے والی بائیوگرافیکل ڈائرکٹری کے مینجنگ ایڈیٹر سنڈی وائیٹ کا خط بھی بڑی پابندی سے آتا ہے کہ میاں ہماری ڈائرکٹری میں اپنا نام شامل کرائیے اور صرف ۲۴۵ ڈالر بھیج کر نہ صرف یہ ڈائرکٹری حاصل کیجئے بلکہ اپنی عظمت کے بارے میں ایک توصیفی سند بھی حاصل کیجیے۔ ہمیں یہ لوگ خاصے شریف معلوم ہوتے ہیں کیونکہ اس ڈائرکٹری میں اپنا نام شامل کروانے کی کوئی فیس نہیں ہے البتہ آپ واقعی ڈائرکٹری کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہتے ہوں تو ۱۵۰ ڈالر بھیجئے اور اگر توصیفی سند بھی ساتھ میں رکھنا چاہتے ہوں تو مزید ۹۵ ڈالر بھیجئے ورنہ ڈائرکٹری میں آپ کا ذکر تو ضرور شامل رہے گا۔ آپ اس نسخہ کو نہ دیکھ سکیں، یہ ایک الگ بات ہے۔ جنگل میں مورناچا کس نے دیکھا۔ اس ادارہ کی جانب سے پچھلے ہفتہ پھر یاددہانی کا خط آیا ہے کہ حضور آپ نے اب تک تفصیلات نہیں بھیجیں۔ ڈائرکٹری کی اشاعت رُکی ہوئی ہے۔ اب میاں سنڈی وائٹ کو ہم کیسے بتائیں کہ ہم بے نیاز اور قلندر صفت آدمی ہیں۔ دو پیسہ کا دھنیہ بھی بھاؤ تاؤ کے بغیر نہیں خریدتے۔ اتنا بڑا اعزاز مول تول کے بنا کیسے خرید لیں۔ پھر ہمیں اب تک کسی کوشش کے بغیر ہی اتنے سارے اعزازات مل چکے ہیں کہ انھیں گھر میں رکھنا دشوار ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ آج کے زمانے میں جب کسی کو اعزاز ملتا ہے تو اس کی توصیفی سند گھر کی دیواروں پر اور اعزاز پانے والے کو سولی پر لٹکایا جاتا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک ادارہ نے ہمیں "ستارۂ مزاح" کے اعزاز کے طور پر جو توصیفی سند عطا کی تھی اسے ہم نے اپنے باتھ روم میں لگا رکھا ہے۔ کیا کریں دیوان خانہ، بیڈروم اور ایسے ہی سارے کمروں کی دیواریں ہمارے بیش بہا کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ حد ہوگئی کہ ہمارے ایک مشہور ادیب دوست نے دیواروں کی قلت اور اعزازات کی فراوانی سے نپٹنے کا ایک انوکھا طریقہ یہ نکالا ہے کہ ایسی توصیفی اسناد کو اپنی چھت میں جگہ جگہ آویزاں کر رکھا ہے۔ جب تک آپ زمین پر نہ لیٹ جائیں تب تک ہمارے دوست کے کارناموں سے واقف نہیں ہوسکتے۔ ہمارے ایک شاعر دوست نے تو برطانیہ سے ملنے والے ایک ایوارڈ کی فوٹو کاپیاں گھر میں جگہ جگہ لگا رکھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اُردو میں تو ان کا ذکر کہیں نہیں آئے گا۔ اب انگریزوں نے یہ اعزاز عطا کیا ہے تو کیوں نہ اس کی مناسب تشہیر کی جائے۔ تاہم اس بات کی خوشی ہے کہ ایسے انگریز بھی جو اُردو بالکل نہیں جانتے اب اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات

کااعتراف کرنے لگے ہیں۔ انگریز یہ تو نہیں جانتے کہ علم عروض کیا ہے۔ مصرعہ کب بحر سے خارج ہو جاتا ہے، ایطائے جلی اور ایطائے خفی کا فرق بھی وہ نہ جانیں لیکن اس کے باوجود وہ اُردو شاعروں اور ادیبوں کو اعزازات عطا کر رہے ہیں تو یہ بڑی بات ہے۔ دیکھا جائے تو خود اُردو میں بھی سوچ سمجھ کر انعامات کہاں دیے جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُردو میں انعامات اپنے آپ نہیں دیے جاتے بلکہ انھیں حاصل کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کو اردو کے اتنے سارے انعامات مل چکے ہیں کہ اب شاید ہی کوئی خوش قسمت انعام ایسا رہ گیا ہو جو انھیں نہ ملا ہو۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے ایک اُردو اکیڈمی کے سامنے یہ تجویز رکھی ہے کہ اب ایک انعام ان کے ''مجموعی انعامات'' پر بھی دیا جائے تو کیا برُا ہے۔ ہم نے تو مذاق میں یہ تجویز پیش کی تھی مگر سنا ہے کہ اس اکیڈمی کے ارباب مجاز ہماری تجویز پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ ان ہی دوست کا قصہ ہے کہ انھیں کسی سلسلہ میں ایک فارم کی خانہ پُری کر کے کہیں داخل کرنا تھا۔ اتفاق سے ہماری نظر خود ان کے ہاتھ سے بھرے ہوئے فارم پر پڑی تو دیکھا کہ اس میں ''ذریعہ آمدنی'' کے خانہ کے آگے ''انعامات اور اعزازات'' کو لکھا ہوا پایا۔ ظاہر ہے کہ جب انعامات اور اعزازات ''ذریعۂ عزّت'' نہیں بلکہ ''ذریعہ آمدنی'' بن جائیں تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انعامات کی کتنی بہتات ہوگئی ہے لیکن انعامات کو ''ذریعہ آمدنی'' بنانے والے ادیب تو دو چار ہی مل جائیں گے ورنہ یہ تو ہمیں گھاٹے کا سودا ہی نظر آتا ہے۔ کچھ برس پہلے اُردو کے ایک ادیب اور شاعر کو ایک سرکاری ادارے کا پچیس ہزار روپے کا انعام ملا تھا۔ ہم نے انھیں مبارکباد دی تو بولے ''مبارکباد کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ پچیس ہزار روپے کے اس انعام کو حاصل کرنے کے لیے میں نے پورے ساٹھ ہزار روپے خرچ کیے ہیں۔'' ادب میں زندہ رہنے کے لیے آدمی کو کیا نہیں کرنا پڑتا۔ ہمیں یاد ہے کہ انعامات کی اس افراط و تفریط میں ہمارے ایک ممتاز اہل قلم کو سچ مچ کا جنیوین انعام بھی ملا تھا۔ یوں تو انعامات کے معاملہ میں ہمیشہ ہی غلطی ہو جاتی ہے لیکن شاذ و نادر صحیح غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ جب اس ادیب کو پچیس ہزار روپے کا انعام ملنے کی خبر شائع ہوئی تو خود اس ادیب کو یقین نہ آیا کہ اسے پچیس ہزار روپے بھی مل سکتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ اس انعام کے ملنے پر ان کے اعزاز میں جو پہلی تہنیتی تقریب منعقد ہوئی تھی وہ کسی ادبی تنظیم کی طرف سے نہیں بلکہ اُن کے محلّہ کی ''انجمن تاجران'' کی طرف سے آراستہ کی گئی تھی۔ جن جن تاجروں سے

انھوں نے زندہ رہنے کے لیے اُدھار لے رکھا تھا سب نے ان کی خدمت میں اُدھار کی مالیت کے حساب سے سپاسنامے پیش کیے، تب بھی پچیس ہزار کی رقم ناکافی ثابت ہوئی۔ مگر ایسے اصلی انعام اب کہاں ملتے ہیں۔ ہر طرف نقلی انعاموں کی بھرمار ہے۔ اب تو برطانیہ اور امریکہ سے بھی ایوارڈ بن کر آنے لگے ہیں۔ آخر میں مرزا اصغر علی بیگ سے ہماری گزارش ہے کہ بھیا آپ انعام نہیں لیتے تو نہ لیں لیکن دوسروں کو تو منع نہ کریں۔ یوں بھی ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں کہاں برابر ہوتی ہیں۔ پھر ہم پانچ انگلیوں میں کہاں آتے ہیں کیونکہ ادب کے بیشتر سیاست دان ہم جیسوں کو ''انگشت ششم'' ہی سمجھتے آئے ہیں۔

روزنامہ ''سیاست'' (جنوری ۲۰۰۰ء)
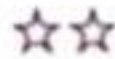
مخدوم ایوارڈ کی بقیہ رقم کا مطالبہ

صاحبو! یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم وہ آخری ادیب تھے (اگر آپ ہمیں ادیب مانیں تو) جسے ۱۹۹۵ء میں مخدوم ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ فطری طور پر ہم نے سوچا تھا کہ اس عرصہ میں چونکہ اُردو ادب میں کوئی بڑی شخصیت پیدا نہیں ہوئی اسی لئے کسی کو اس ایوارڈ کا مستحق قرار نہیں دیا گیا۔ کسی ایسے ویسے کو ایوارڈ دے کر ایوارڈ کو بے توقیر کرنے سے بہتر تو یہی ہے کہ کسی کو ایوارڈ ہی نہ دیا جائے۔ یہ تو ہماری سوچ تھی لیکن اغیار کا کہنا تھا کہ ہمیں مخدوم ایوارڈ کا ملنا کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ اس سے ایوارڈ کا مستقبل خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ لوگ اب ہمارے حوالہ سے اس ایوارڈ کو قبول ہی نہ کریں۔ اس لیے اس ایوارڈ کے اعلان میں کئی برس کی تاخیر ہوتی جارہی ہے لیکن کچھ لوگ ایماندار اور غیر جانبدار بھی ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ایوارڈ چونکہ مخدوم محی الدین سے منسوب ہے اسی لئے اس ایوارڈ میں بھی خود مخدوم محی الدین کی خصوصیات پیدا ہوتی جارہی ہیں۔ آپ کو پتہ ہوگا کہ مخدوم اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے بسا اوقات 'روپوش' ہوجایا کرتے تھے۔ اب ان کا ایوارڈ بھی ان کی تقلید میں بیٹھے بٹھائے روپوش ہوجاتا ہے بلکہ مخدوم محی الدین سے زیادہ روپوش رہنے لگا ہے۔ جیسا راجہ ویسی پرجا اسی کو کہتے ہیں۔

بہر حال یہ ایوارڈ پچھلے پانچ برسوں سے روپوش تھا اور ہم نے اس کی روپوشی کے بارے میں کبھی کوئی اظہارِ خیال نہیں کیا۔ یوں بھی ہمیں اس معاملہ میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ہمیں تو یہ ایوارڈ مل چکا تھا۔ وہ لوگ اس بارے میں فکر کریں جو اس ایوارڈ کے ملنے کی آس

لگائے بیٹھے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے جب یہ اطلاع آئی کہ مخدوم ایوارڈ کا سلسلہ پھر سے شروع ہونے والا ہے تو ہم خوش ہو گئے کہ چلو گلشن کا کاروبار پھر سے چلنے لگا ہے۔ لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اس ایوارڈ کی رقم بڑھا کر اب ایک لاکھ کر دی گئی ہے تو تب ہمیں اس سازش کا پتہ چلا جو ہمارے خلاف رچی گئی تھی۔ ہمیں جب یہ ایوارڈ دیا گیا تھا تو اس کی مالیت صرف پندرہ ہزار روپے تھی۔ اب اچانک اسے بڑھا کر ایک لاکھ روپیہ کر دیا گیا ہے۔ گویا ارباب مجاز اس تاک میں تھے کہ ہمیں تو صرف پندرہ ہزار روپئے پر ٹرخا دیا جائے اور بعد کے انعام یافتگان کو ایک لاکھ روپیہ دیا جائے۔ ہمارے ساتھ یہ سراسر ناانصافی ہے۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارے ادب میں ایسی کونسی کمی رہ گئی تھی جس کی بنا پر ہمارے ۸۵ ہزار روپے ہڑپ کر لئے گئے۔ اگر ہمیں پہلے سے پتہ ہوتا تو ہم اور بھی خراب ادب تخلیق کرنے کی کوشش کرتے تاکہ اُردو اکیڈمی کے معیار پر پورے اُتر سکیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ اس معاملہ میں ہمارا رویہ خود غرضانہ ہے۔ ہم ۸۵ ہزار روپے کا بقایا صرف اپنے لئے نہیں مانگ رہے ہیں بلکہ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ پیشرو ایوارڈ یافتگان کو بھی اس ایوارڈ کی بقیہ رقم ادا کی جائے۔ عصمت چغتائی، وحید اختر اور شاذ تمکنت تو خیر اس دنیا میں نہیں رہے لیکن خدا کے فضل سے قرۃ العین حیدر اور سردار جعفری تو ہمارے درمیان اب بھی موجود ہیں (ہمارے علاوہ)۔ ہم انصاف پسند آدمی ہیں اور سب کا بھلا چاہتے ہیں۔

جب سرکاری ملازموں کو اکثر اوقات بقایا جات (Arrears) ادا کئے جاتے ہیں تو ایوارڈ یافتگان کو کیوں نہ ادا ہوں۔ پھر مخدوم ایوارڈ بھی تو ایک سرکاری ایوارڈ ہے۔ اب اکیڈمی کو Arrears دینے میں کیا تکلیف ہو رہی ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو ادب کے معاملہ میں ہمارے ساتھ ہمیشہ زیادتی ہوتی آئی ہے۔ لوگ ہمیں ایوارڈ دینے کے بعد اس ایوارڈ کی رقم میں بالا بالا ہی اضافہ کر دیتے ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں جب ہمیں غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے طنز و مزاح کا پہلا غالب ایوارڈ ملا تھا تو تب بھی ہمیں صرف پانچ ہزار روپیوں پر ٹرخا دیا گیا تھا لیکن اب غالب انعامات کی مالیت پچیس ہزار روپے ہو گئی ہے۔ چلئے اس ایوارڈ کے سلسلہ میں بیس ہزار روپئے کے نقصان کو ہم یوں بھی برداشت کر لیں گے کیونکہ ہمارا دل کافی بڑا ہے۔ لیکن یہ اتنا بھی بڑا نہیں ہے کہ اچانک ۸۵ ہزار روپیے کے نقصان کو برداشت کر سکے۔ ظالمو! کچھ تو ہمارے 'پیمانہ صبر' کا اندازہ لگایا ہوتا۔ لگے ہاتھوں ہم یہ بھی عرض کر دیں کہ جب ہمیں غالب ایوارڈ دینے کا اعلان ہوا تھا تو ہم نے ایوارڈ

دینے والوں سے برملا کہا تھا کہ ہم یہ ایوارڈ قبول کرنا نہیں چاہتے کیونکہ اس وقت فکر تونسوی بقید حیات تھے اور ہم ان کی موجودگی میں اس ایوارڈ کو قبول کرنے کی گستاخی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر فکر تونسوی الگ مزاج کے آدمی تھے۔ چنانچہ ان کے پرزور اصرار پر ہمیں یہ ایوارڈ قبول کرنا پڑا تھا۔ آنجہانی کنور مندر سنگھ بیدی سحر نے اپنے ایک مضمون میں اس کا تفصیل سے ذکر بھی کیا ہے۔ یوں بھی غالب سے بے پناہ عقیدت کے باوجود اس ایوارڈ کے تعلق سے ہم سنجیدہ نہیں تھے۔ البتہ مخدوم ایوارڈ کی بات الگ تھی۔ مخدوم سے ذہنی اور جذباتی لگاؤ کی وجہ سے خود ہماری عین خواہش تھی کہ یہ ایوارڈ ہمیں ملے۔ سو یہ ہمیں مل گیا لیکن یہ نہ سوچا تھا کہ بعد میں ہمارے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ ہوگا۔ غالب ایوارڈ تو خیر ہمیں ۱۹۸۴ء میں ملا تھا۔ اس کے بعد اس کی مالیت میں اگر بیس ہزار روپے کا اضافہ ہو گیا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ گرانی کو دیکھئے کہ کتنی بڑھ گئی ہے۔ اس زمانہ کے پانچ ہزار روپے آج کے پچاس ہزار روپے کے برابر ہیں لیکن یہ پچاس ہزار روپیہ کا گھاٹا تو بہت زیادہ ہے۔

یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا لیکن بعد میں یہ اطلاع آئی کہ اکیڈمی کے ارباب مجاز میں اس ایوارڈ کے مسئلہ پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے۔ اور اکثریت کی رائے یہ ہے کہ یہ ایوارڈ کسی ایک شاعر یا ادیب کو نہ دیا جائے بلکہ اسے حیدرآباد کے پانچ بزرگ شاعروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس بارے میں اگر آپ ہماری رائے پوچھیں تو ہم بھی اکثریت کے ساتھ ہیں کیونکہ خود مخدوم محی الدین دولت کی مساویانہ تقسیم کے قائل تھے۔ چنانچہ انھوں نے ساٹھ ستر برس پہلے ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ایک دن ان سے منسوب ایوارڈ کی تقسیم کے مسئلہ پر ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ اس لئے انھوں نے اپنا معرکتہ الآرا شعر کہا تھا۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اس ایوارڈ کی تقسیم کے سلسلہ میں اگر مخدوم کے مندرجہ بالا شعر پر صدق دل سے عمل کرنے کی بات ہو تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ مخدوم نے اپنے شعر میں جس کائنات کا ذکر کیا ہے وہ صرف پانچ افراد سے مل کر نہیں بنتی۔ اس مسئلہ پر عوامی انداز میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ پورے آندھرا پردیش میں اُردو شاعروں کی تعداد کم از کم ایک لاکھ تو ضرور ہوگی

اور آپ نے بزرگ مزاح نگار یوسف ناظم کا وہ قول تو یقیناً سنا ہو گا کہ اُردو میں چھوٹا شاعر پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس قول کی تصدیق کے لئے ہم نے مذاق میں ایک کثیر الاشاعت ماہنامہ میں اس عبارت کا ایک اشتہار بھی چھپوا دیا تھا کہ ایک ضروری ادبی کام کے سلسلہ میں ہمیں اُردو کے ایک چھوٹے شاعر کی خدمات درکار ہیں۔ چھوٹے شاعر کو معقول معاوضہ بھی دیا جائے گا۔ آپ یقین مانیں کہ اس اشتہار کے جواب میں ہمارے پاس ایک بھی درخواست وصول نہیں ہوئی۔ گویا آندھرا پردیش میں اس وقت جتنے بھی شاعر ہیں وہ سب کے سب بڑے شاعر ہیں۔ اتنے سارے بڑے شاعروں کی موجودگی میں صرف پانچ شعراء کی تخصیص کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ کیوں نہ انعام کے ایک لاکھ روپیوں کو ایک لاکھ شاعروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ جب گھر گھر میں مخدوم ایوارڈ پہنچ جائے گا تو اس سے خود مخدوم محی الدین کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہو گا اور اس طرح پتہ چلے گا کہ حیات، کائنات اور زمانے کو ساتھ لے کر چلنے میں کتنا لطف آتا ہے۔ سب لوگ مل بانٹ کر مخدوم ایوارڈ کو ہضم کریں تو واقعی مزہ آجائے۔ عوامی سطح پر اس ایوارڈ کی تقسیم کے کئی فائدے بھی ہونگے۔ مثلاً آپ اپنے پڑوسی سے کہہ سکتے ہیں ''بھئی! آپ کے پاس اگر تھوڑا سا مخدوم ایوارڈ ہو تو بھجوا دیجئے۔'' اس پر وہ بولے گا ''بھائی! آپ نے مانگنے میں ذرا دیر کر دی۔ ابھی ابھی میں نے اپنے مخدوم ایوارڈ سے ماچس کی دو ڈبیاں خرید لی ہیں''۔

اس بجٹ کے پس منظر میں ہمارے ایک سنجیدہ دوست نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ ایوارڈ یافتگان کی تلاش میں سر کھپانے سے بہتر تو یہی ہے کہ کیوں نہ یہ ایوارڈ خود مخدوم محی الدین کو بعد از مرگ پیش کیا جائے۔ ہمارے ہاں بعد از مرگ ایوارڈ دینے کی ایک باضابطہ روایت بھی تو موجود ہے۔ مخدوم اس زمانہ میں دنیا سے رخصت ہو گئے تھے جب ملک میں اُردو اکیڈیمیاں قائم نہیں ہوئی تھیں اور ان کے انعامات کے جلوس نکلنے شروع نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ مخدوم کو ان کی زندگی میں کوئی قابل لحاظ ایوارڈ بھی نہیں ملا تھا۔ غالب نے اپنا آخری زمانہ تنگدستی اور مالی پریشانی میں گذارا تھا لیکن آج دیکھئے کہ غالب کے نام پر لاکھوں روپے خرچ کئے جا رہے ہیں۔ غالب نے کبھی سوچا بھی نہ ہو گا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے حالات زندگی اتنے بہتر ہو جائیں گے۔ اب اگر مخدوم محی الدین کے حالات زندگی کو بھی بہتر بنایا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ شاہد صدیقی کا ایک شعر ہے۔

پرستش اُن کی ہوتی ہے جو بت میں نے تراشے ہیں
مگر مجھ کو کمالِ بت گری سے کچھ نہیں ملتا

اُردو اکیڈمی کے ارباب مجاز اس سنجیدہ تجویز پر غور کریں تو زیادہ مناسب ہے (نصرت محی الدین بطور خاص توجہ فرمائیں)۔ اگر یہ تجویز قابل قبول نہ ہو تو پھر ہمیں سیدھے سیدھے مخدوم ایوارڈ کے Arrears ادا کردیں۔ اندھا کیا چاہے ایک لاٹھی۔

روزنامہ "سیاست" (۲۷/فروری ۲۰۰۰ء)

ایک ناقابلِ فراموش یاد

زندگی کے لمبے سفر کے بعد آدمی کی جھولی میں صرف یادیں باقی رہ جاتی ہیں اور یہی یادیں اس کی زندگی کا اصل سرمایہ بلکہ حاصل ہوتی ہیں۔ آدمی کی طرح یادوں کی بھی ایک عمر ہوتی ہے اور وہ اپنی عمر گزار کر یادوں کی جھولی میں سے غائب ہو جاتی ہیں اور یاد رکھنے والے کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ ان کا کیا حشر ہوا۔ بعض یادیں ایک خاص عمر کی دین ہوتی ہیں۔ یہ میٹھی میٹھی یادیں اسی مخصوص عمر کا عطیہ ہوتی ہیں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہمارا اشارہ کس عمر کی طرف ہے۔ تاہم جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے آدمی اپنی یادوں کی جھولی کو خالی کرتا چلا جاتا ہے۔ آخر وہ یادوں کا کتنا بوجھ اٹھائے۔ کیا یاد رکھے اور کیا بھول جائے۔ اب ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو یاد آتا ہے کہ کتنی ہی یادیں اور ان یادوں سے وابستہ کتنی ہی شخصیتیں ہم سے بچھڑ گئیں۔ تاہم ایک یاد ایسی ہے جسے ہم پچھلے چوالیس برسوں سے اپنے سینہ سے لگائے ہوئے ہیں اور جس کا نقش ہمارے حافظہ میں دھندلا نہ ہو سکا۔ آیئے اس یاد میں آپ کو شامل کرنے کے لیے ہم آپ کو ۱۹۵۵ء کی عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف لے چلتے ہیں۔ ہم عثمانیہ یونیورسٹی میں بی اے کے آخری سال کے طالب علم تھے۔ اگرچہ زندگی سے ابھی کچھ حاصل نہیں کیا تھا، حتیٰ کہ وہ علم بھی حاصل نہیں کیا تھا جس کی خاطر یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے۔ تاہم اس کنگالی اور تہی دامنی کے باوجود نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہم دنیا کے مالدار ترین انسان ہیں۔ ایسی مالا مال غربت ہمیں بعد کی زندگی میں کبھی میسر نہ آسکی۔ ہمارا سارا وقت دوستوں اور ان کے ہنگاموں میں گذرتا تھا۔ ان دنوں کی عثمانیہ یونیورسٹی

اُردو ماحول میں نہ صرف کمر کمر بلکہ گلے گلے ڈوبی ہوئی تھی۔ آئے دن شعری اور ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ حیدر آباد میں مخدوم محی الدین، علامہ حیرت بدایونی، شاہد صدیقی، سلیمان اریب، خورشید احمد جامی، عزیز قیسی، شاذ تمکنت اور وحید اختر جیسے شاعروں کی موجودگی کی وجہ سے شعرو ادب کا خوب چرچا تھا۔ اگرچہ اُس وقت تک ادب سے ہمارا براہ راست کوئی تعلق پیدا نہیں ہوا تھا لیکن اپنے احباب کی کثرت کی وجہ سے ہم آرٹس کالج کی بزم اُردو کے سکریٹری منتخب ہو گئے تھے۔ ان دنوں کی عثمانیہ یونیورسٹی میں بزم اُردو کا سکریٹری منتخب ہونا بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ آرٹس کالج میں آئے دن اس بزم کی طرف سے محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں لیکن ہمیں تو اس وقت اُس محفل کی یاد آرہی ہے جس کا نقش آج بھی ہمارے ذہن میں بالکل تازہ ہے۔ ۱۹۵۵ء میں حضرت جگر مرادآبادی کسی مشاعرہ میں شرکت کے لیے حیدر آباد آئے تھے اور ہم نے اس مشاعرہ میں انھیں پہلی بار دیکھا اور سنا تھا۔ جگر مرادآبادی کا طوطی سارے ملک میں بول رہا تھا۔ جب وہ اپنے مخصوص رنگ تغزل اور اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ کلام سناتے تو سماں باندھ دیتے تھے۔ جگر صاحب حیدر آباد آتے تو برازیل آپٹیکل پیلس کے مالک اعجاز صدیقی کے گھر میں قیام فرماتے تھے جو حیدر آباد کے محلہ ترپ بازار میں واقع تھا۔ اسی مناسبت سے جگر صاحب کے انتقال کے بعد اس محلہ کی سڑک کا نام جگر مرادآبادی روڈ رکھ دیا گیا تھا۔ (پتا نہیں اس سڑک کا یہ نام اب بھی باقی ہے یا نہیں) تاہم اس سڑک کے بارے میں ہمارے ایک مرادآبادی دوست کو شکایت تھی کہ مرادآباد میں سڑکوں کی حالت نہایت خراب ہے۔ ایسے میں مرادآباد کی ایک سڑک کو حیدر آباد میں بنانے کی کیا ضرورت تھی۔

بہر حال جگر صاحب کی حیدر آباد میں آمد کے پس منظر میں بزم اُردو کے ایک کارکن نے یہ تجویز رکھی کہ کیوں نہ جگر صاحب کو بزم اُردو کی جانب سے آرٹس کالج میں مدعو کیا جائے۔ ہم بزم کے جنرل سکریٹری تھے اور افضل محمد (جو اب امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں) ہمارے دوست اور ہم مکتب تھے۔ افضل محمد کے والد علامہ حیرت بدایونی سے جگر صاحب کے نہایت قریبی مراسم تھے۔ جب بھی حیدر آباد آتے تو علامہ حیرت بدایونی کے ساتھ ان کی خوب محفلیں بجتی تھیں۔ ہماری بزم کے صدر، غلام احمد تھے تو معاشیات کے طالب علم لیکن اُردو کے بہت اچھے مقرر تھے۔ کئی تقریری مقابلوں میں انعام حاصل کرنا اور اس طرح اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانا

ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ (افسوس کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے)۔ جب غلام احمد نے جگر صاحب کو مدعو کرنے کی ذمہ داری بحیثیت سکریٹری ہمیں سپرد کی تو ہم نے نوجوانی کے جوش میں کہہ دیا کہ یہ کونسا مشکل کام ہے۔ ہم افضل محمد کو کہہ دیں گے اور افضل محمد اپنے والد کو کہہ دیں گے اور آخر میں علامہ حیرت بدایونی جگر صاحب سے کہہ دیں گے، اور لیجئے یہ آگئے جگر صاحب۔ چنانچہ ہم نے افضل محمد سے کہہ دیا اور انھوں نے علامہ حیرت بدایونی سے بھی کہہ دیا۔ پھر علامہ حیرت نے جگر صاحب سے بھی کہہ دیا مگر غالباً بے خیالی میں تفصیلات بتانا بھول گئے کہ محفل شعر کس تاریخ کو اور کب ہوگی۔ اُس زمانہ میں ترسیل کے اتنے ذرائع موجود نہیں تھے غالباً اسی لئے ترسیل کی ناکامی کا المیہ نمودار ہو جاتا تھا۔ جب ہمیں پتہ چلا کہ جگر صاحب محفل شعر میں آنے کے لیے راضی ہو گئے ہیں تو ہم نے اپنی نوجوانی اور ناتجربہ کاری کے جوش میں آؤ دیکھا نہ تاؤ جگر صاحب کے اعزاز میں منعقد ہونے والی محفل کا اعلان کر دیا۔ یہ تک نہ کیا کہ جگر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور انھیں محفل کی تفصیلات سے آگاہ کرتے۔

ساری یونیورسٹی میں جگر صاحب کی آمد کی دھوم مچ گئی۔ محفل شعر کے دن معینہ وقت سے دو گھنٹے پہلے ہم موٹر لے کر جگر صاحب کو لانے کے لیے ترپ بازار میں ان کے میزبان کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ جگر صاحب احباب کے ساتھ بیٹھے تاش کھیلنے میں مصروف ہیں۔ مشہور شاعر اور کالم نگار شاہد صدیقی بھی وہاں موجود تھے۔ جب ہم نے اپنی آمد کا مدعا بیان کیا تو جگر صاحب نے بڑی روکھائی سے جواب دیا "محفل شعر کے بارے میں ہمیں بتایا تو گیا تھا لیکن تاریخ اور وقت کے بارے میں کچھ طے نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اس وقت تو ہم چلنے سے معذور ہیں۔" اب آپ سے کیا بتائیں کہ اس جواب کو سن کر ہم پر کیا بیتی۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہ تھا۔ طرح طرح کی منتیں کیں۔ اپنی کوتاہی اور غلطی کی معافیاں مانگیں لیکن کوئی حربہ کارگر نہ ہوا۔ شاہد صدیقی ہمیں محبوب حسین جگر کے بھائی کی حیثیت سے تھوڑا بہت جانتے تھے۔ انہوں نے ہم پر ترس کھا کر جگر صاحب سے کہا "قبلہ! ان نوجوانوں سے انجانے میں غلطی تو سرزد ہوگئی ہے۔ خدارا کچھ دیر کے لیے ہی سہی محفل میں چلے چلئے"۔ پھر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا "یہ نوجوان حیدرآباد کے جگر صاحب کا چھوٹا بھائی ہے۔" ایک لمحہ کے لیے جگر صاحب کے ہونٹوں پر ہنسی آئی اور پھر یکلخت غائب ہوگئی۔ بولے "اس کے باوجود یہ صاحبزادے اتنے غیر ذمہ دار ہیں

کہ ہمیں تاریخ اور وقت کے بارے میں پہلے سے کچھ نہ بتایا اور محفل کا اعلان کردیا۔ بہر حال ہم تو اس محفل میں بالکل نہیں جائیں گے۔'' انھیں منانے کا یہ آخری حربہ بھی ناکام ہوگیا تو ہم بے نیل مرام وہاں سے لوٹ آئے۔ اب ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ واپس جاکر جگر صاحب کے پرستاروں کو جو آرٹس کالج میں سینکڑوں کی تعداد میں جمع ہوگئے تھے کیا بتائیں گے کہ وہ محفل شعر میں کیوں نہ آسکے۔ اتنے برس گذر جانے کے بعد آج بھی ہم اس کیفیت کو یاد کرتے ہیں تو ہمارا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے لینڈ اسکیپ گارڈن کے پاس پہنچ کر، جہاں سے آرٹس کالج کا باب الداخلہ نظر آتا ہے، ہم نے گاڑی رکوائی۔ دیکھا کہ سینکڑوں طلبہ جگر صاحب کے منتظر ہیں۔ ہم نے بزم اُردو کے صدر غلام احمد کو کسی طرح باور کرایا کیا کہ حضور آپ شعلہ بیان مقرر ہیں۔ آپ ہی اپنی شعلہ بیانی کے ذریعہ اس صورت حال کو سنبھال سکتے ہیں۔ آپ آگے چلئے ہم پیچھے آتے ہیں۔ غلام احمد معصوم آدمی تھے۔ اپنی شعلہ بیانی کی ہم سے تعریف سنی تو آتش نمرود میں کود پڑنے کو تیار ہوگئے اور موٹر میں بیٹھ کر یونیورسٹی کی طرف نکل گئے۔ اب ہم اپنے دو دوستوں کے ساتھ کھڑے ہوگئے تاکہ یہاں سے غلام احمد کی جادو بیانی کا دور سے نظارہ کرسکیں۔ ابھی وہ یونیورسٹی کے باب الداخلہ تک بھی نہ پہنچے تھے کہ ہماری نظر ایک تیز رفتار ٹیکسی پر پڑی جس میں جگر صاحب، شاہد صدیقی کے ساتھ بیٹھے ہوئے یونیورسٹی کی طرف چلے جارہے تھے۔ اب آپ سے کیا بتائیں کہ انھیں یونیورسٹی کی طرف جاتا دیکھ کر ہم پر کیا بیتی۔ فوراً ایک دوست کی موٹر سائیکل پر ان کے تعاقب میں بھاگے۔ ابھی غلام احمد کی جادو بیانی شروع ہی ہوئی تھی کہ جگر صاحب وہاں بہ نفس نفیس پہنچ گئے۔ طلبہ نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور آرٹس کالج کے کمرہ نمبر ۵۷ کی طرف لے گئے جہاں محفل شعر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہم احساسِ ممنونیت سے مغلوب ہوکر ان کی طرف بڑھے تو بولے ''میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔ اس وقت میں یہاں تمہاری دعوت پر نہیں بلکہ اپنے آپ چلا آیا ہوں۔'' جگر صاحب نے آتے ہی شعر سنانے شروع کردیئے۔ خلاف توقع وہ بے حد خوشگوار موڈ میں تھے۔ ان کے پرستاروں کا ہجوم تھا۔ فرمائشیں ہونے لگیں اور انھوں نے کسی کی فرمائش رد نہیں کی۔ اس طرح جس محفل کو اصولاً ایک گھنٹہ چلنا تھا پورے دو گھنٹوں تک چلتی رہی۔ گویا جگر صاحب نے کلام نہیں سنایا بلکہ مجموعہ کلام سنایا۔ محفل کے بعد انھوں نے نہ تو بزم اُردو کی طرف سے وہ معاوضہ قبول کیا جو انھیں دیا جانا تھا اور نہ ہی ٹیکسی کا کرایہ لیا۔ البتہ جاتے ہوئے

ہمیں اپنے پاس بلا کر بڑی شفقت سے کہا ''میاں! مستقبل میں کبھی ایسی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ نہ کرنا''۔ تب سے ہم نے ان کی یہ بات کچھ اس طرح گرہ میں باندھ لی ہے کہ کسی کو کہیں بلانا ہو تو دس ڈھنگ سے اس سے رابطہ پیدا کرتے ہیں اور بار بار اسے یاد دلاتے ہیں۔ لوگ ہماری اس عادت سے عاجز آجاتے ہیں۔ لیکن ہم انھیں کیسے بتائیں کہ جگر صاحب ہمیں ایک ایسا درس دے گئے ہیں جسے ہم تاحیات نہیں بھول سکتے۔ چالیس برسوں میں نہیں بھولے تو اب کیا بھولیں گے۔

روزنامہ ''سیاست'' (جون ۲۰۰۰ء)

آر کے لکشمن کا عام آدمی

صدرِ جمہوریہ کے آر نارائنن نے پچھلے دنوں شہرہ آفاق کارٹونسٹ، آر کے لکشمن کے کارٹونوں میں پیش کیے جانے والے ''عام آدمی'' کے مشہور و معروف کردار کے آٹھ فیٹ اونچے مجسمے کی نقاب کشائی پونے میں انجام دی۔ یہ پہلا موقع ہے جب ایک کارٹونسٹ کے کردار پر مبنی ایک مجسمہ کی نقاب کشائی عمل میں آئی ہے۔ ہمارے ہاں سیاسی رہنماؤں اور ممتاز شخصیتوں کے مجسموں کی نقاب کشائی تو آئے دن ہوتی رہتی ہے لیکن آج تک کسی ''عام آدمی'' کے مجسمے کی نقاب کشائی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اسے آر کے لکشمن کے فن کا کمال نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ بالآخر ہمارے ''عام آدمی'' کو بھی ایک شکل وصورت عطا کی جارہی ہے اور اس کے خدوخال کو (چاہے وہ جیسے بھی ہوں) نمایاں کیا جارہا ہے۔ آر کے لکشمن کے اس عام آدمی کا کوئی نام نہیں ہے کیونکہ عام آدمی کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ خیر سے اب اس کی عمر پچاس برس کی ہوگئی ہے۔ پچاس برس پہلے وہ جیسا تھا آج بھی ویسا ہی ہے۔ ان پچاس برسوں میں ہمارے رہنما بدلے، ان کے کردار بدلے، ان کے لباس بدلے، ان کے حلیے بدلے، ان کے عہدے بدلے، ان کے نظریات بدلے، ان کی پارٹیاں بدلیں، ان کی اقدار بدلیں لیکن لکشمن کا ''عام آدمی'' جوں کا توں ہے۔ اس کا لباس بھی وہی ہے جو آج سے پچاس برس پہلے تھا۔ اس نے ایک سیدھی سادی دھوتی پہن رکھی ہے۔ اس دھوتی پر ایک کوٹ بھی پہن رکھا ہے جس کے اوپر کے بٹن تو لگے ہوئے ہیں لیکن نچلے بٹن کھلے ہوئے ہیں۔ جوتا بھی ایسا پہن رکھا ہے جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جوتیاں چٹخانا کس کو کہتے ہیں،

اس کے سر پر بال تو نہیں ہیں البتہ کنپٹی کے اوپر کچھ بال ضرور ہیں۔ بال اتنے کم ہیں کہ انھیں آسانی سے جمایا اور سجایا نہیں جاسکتا۔ اسی لئے ایک پریشان حال آدمی کے بالوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کی مونچھیں بھی ہیں جن کے بال زیادہ بکھرے ہوئے نہیں ہیں کیونکہ کوئی بھی آدمی (چاہے وہ عام آدمی ہی کیوں نہ ہو) اپنی مونچھوں کو نیچی ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا۔ لکشمن کے کارٹونوں کے عام آدمی کی ساری خوبیاں اس کے چہرے میں پوشیدہ ہیں۔ اس کی آنکھیں حیرت واستعجاب کا ایک عجیب وغریب منظر پیش کرتی ہیں۔ اس کا چہرہ عزم اور حوصلے کا آئینہ دار ہے۔ ہزاروں مشکلات اور مصائب کے باوجود اس کا چہرہ زندہ رہنے کی آرزو سے معمور نظر آتا ہے۔ مختلف کارٹونوں میں اس عام آدمی کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ میں فرق نظر آتا ہے لیکن اس کے ہونٹ ہمیشہ بند رہتے ہیں۔ پچاس برسوں میں لکشمن کے اس عام آدمی نے نہ تو اپنی زبان کھولی، نہ کسی بات پر مُسکرایا اور نہ ہی کبھی قہقہہ لگایا۔ اپنے اطراف پیش آنے والے مضحکہ خیز، سنگین، پرآشوب اور اول جلول واقعات کو اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا تو ضرور ہے لیکن کبھی اپنا منہ نہیں کھولتا۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے اطراف جو کردار دکھائی دیتے ہیں وہ سب کے سب بولتے ہیں۔ اس کی بیوی بولتی ہے (کیونکہ بیویوں کا کام ہی بولنا ہوتا ہے) سرکاری افسر بولتے ہیں (اس لئے کہ انھیں بولنے کی تنخواہ دی جاتی ہے) رہنما بولتے ہیں (اس لئے کہ انھیں جھوٹ بولنے کی عادت ہوتی ہے) دانشور بولتے ہیں (کیونکہ انھیں بلاوجہ بولنے کی مشق ہوتی ہے) کبھی کبھار مفلس، بے بس اور مظلوم آدمی بھی بولتا ہے (یہ اور بات ہے کہ کوئی اس کی بات کو نہیں سنتا)۔ جب اتنے سارے لوگ بول رہے ہوں تو ایسے میں لکشمن کا عام آدمی بالکل خاموش رہتا ہے۔ وہ اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں بولتا۔ گویا وہ متوسط طبقہ کے صبر وضبط، تحمل اور قوت برداشت کا آئینہ دار ہے۔ وہ ایک ایسا خاموش تماشائی ہے، جس کی خاموشی جب بولتی ہے تو لفظ تک کانپ جاتے ہیں۔

خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

لکشمن کا عام آدمی پچھلے پچاس برسوں سے خاموش ہے۔ اس کی بے نور اور بے بس آنکھوں نے پچاس برس میں کیا نہیں دیکھا۔ سیاستدانوں کی دھاندلیاں، جرائم پیشہ افراد کا بڑھتا ہوا اثر ورسوخ، سرکاری افسروں کی عدم کارکردگی اور رشوت ستانی، معیار تعلیم کا زوال، تاجروں کی منافع خوری، ملاوٹ اور بے ایمانی، غریبوں کی زبوں حالی۔ اتنا سب کچھ دیکھ کر بھی وہ خاموش ہے۔

اس لئے کہ اس کے اطراف جو کچھ ہو رہا ہے اس کی اجازت کے بغیر ہو رہا ہے۔ نہ وہ ان حالات کا ذمہ دار ہے اور نہ ہی حالات اس کے قابو میں ہیں۔ ایسے میں وہ بول کر کیا کرے۔ اپنے لفظوں کو کیوں ضائع کرے۔ بات بھی کھوئی التجا کر کے والا معاملہ ہے۔ اس لیے وہ چپ چاپ سب کچھ برداشت کر رہا ہے۔ زندگی اس کے سامنے جو مسائل بھی پیش کرتی ہے اس سے وہ نبرد آزما ہوتا چلا جاتا ہے۔ بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں، نیوکلیر جنگ کے بڑھتے ہوئے خطرات، انسانیت کے تاراج ہونے کے اندیشوں، سیاستدانوں کی بے عقیدگی، ان کی دھاندلیوں اور سرکاری افسروں کی بے حسی کو وہ خوب سمجھتا ہے۔ لیکن نجی طور پر اس کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بجلی بار بار کیوں فیل ہو جاتی ہے، پانی کی سربراہی کیوں بند ہو جاتی ہے، اشیاء کی قیمتیں کیوں بڑھ جاتی ہیں، اس کے گھر کے آگے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کیوں پڑے رہتے ہیں، ٹریفک جام کیوں ہو جاتا ہے، اس کے ان ہی چھوٹے موٹے مسئلوں کو لے کر لکشمن جب اپنے عام آدمی کے پسِ منظر میں اپنے نقطہ نظر کو پیش کرتا ہے تو عام آدمی تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی اپنے مسائل کی سنگینی کو بھول جاتا ہے۔ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ بے حسوں اور ظالموں کی اس بھیڑ میں لکشمن کی شکل میں اس کا ایک مونس و غمخوار موجود ہے۔ یہ مونس و غمخوار اس غم زدہ کے غم کا مداوا تو نہیں کر سکتا تاہم وہ اس کے غم کے بوجھ کو ہلکا ضرور کر سکتا ہے۔ اور لکشمن کا یہی سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

آر کے لکشمن کے کارٹونوں کو ہم پچھلے پچاس برسوں سے نہایت پابندی کے ساتھ دیکھ رہے ہیں اور وہ ہمارے پسندیدہ کارٹونسٹوں میں سے ہیں بلکہ ہم تو انھیں دنیا کا ایک عظیم کارٹونسٹ سمجھتے ہیں۔ ملک کے کئی اہم کارٹونسٹوں سے ہماری شخصی ملاقات رہی ہے۔ سدھیر دار، رنگا، سدھیر تلنگ، سوشیل کالرا، عزیز کارٹونسٹ مرحوم وغیرہ کے علاوہ عہد ساز کارٹونسٹ شنکر سے، ان کی عمر کے آخری زمانہ میں، ہمیں قربت حاصل رہی ہے۔ شنکر کے چلڈرنس بک ٹرسٹ میں ہمیں اپنے سرکاری کام کے سلسلہ میں اکثر جانا پڑتا تھا۔ وہ ہمیں بے حد عزیز رکھتے تھے اور انہوں نے اپنے کارٹونوں کا ایک بیش قیمت البم بھی اپنے آٹو گراف کے ساتھ ہمیں دیا تھا جو آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اپنے محبوب کارٹونسٹ لکشمن سے کبھی ہماری شخصی ملاقات نہیں ہوئی۔ تیس برس پہلے ایک بار انھیں حیدر آباد کے اورینٹ ہوٹل میں دیکھا تھا البتہ ان سے ملنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ تاہم ہمارے صحافی دوست اور ساتھی منور علی نے آر کے لکشمن سے نہ

صرف ملاقات کی تھی بلکہ ''سیاست'' کے لئے ایک انٹرویو بھی لیا تھا۔ لکشمن کا ایک اسکیچ بھی اس انٹرویو کے ساتھ ''سیاست'' میں چھپا تھا۔ لکشمن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور لوگوں سے کم ہی ملتے ہیں۔ یوں بھی وہ ہر دم اپنے ''عام آدمی'' کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ہم 'ٹائمس آف انڈیا' کو صرف لکشمن کے کارٹونوں کی وجہ سے خریدتے ہیں۔ لمبے عرصہ کے لئے ملک سے باہر بھی جاتے ہیں تو واپس آتے ہی لکشمن کے سارے پچھلے کارٹونوں کو دیکھتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ لکشمن کی ڈرائنگ میں وہ بات نہیں ہوتی جو کسی ماہر کارٹونسٹ کے ہاں پائی جانی چاہیے، وہ اپنی بات اس عبارت میں کہہ جاتا ہے جو کارٹون کے نیچے چھپتی ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو لکشمن نے اس ملک کے سیاستدانوں، سرکاری افسروں، دانشوروں، اسمگلروں اور تاجروں کو جتنا سمجھا ہے اتنا کسی نے نہیں سمجھا۔ ملک کی نبض لکشمن کے ہاتھوں میں دکھائی دیتی ہے۔

اگر ہمارے حکمرانوں کو وہ ادراک حاصل ہو جائے جو لکشمن کو حاصل ہے تو شاید اس ملک میں عام آدمی کے مسائل حل ہو جائیں۔ لکشمن کے لاتعداد کارٹونوں میں سے اب ہمیں اس کے کچھ کارٹون یاد آنے لگے ہیں۔ لکشمن کا عام آدمی اپنی بیوی کے ساتھ ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہا ہے، اتنے میں اس کے کھانے میں سے ایک مُردہ جھینگر نکل آتا ہے۔ اس پر اس کی بیوی تبصرہ کرتی ہے ''بیچارے جھینگر نے غالباً یہ کھانا کھالیا تھا تبھی تو مر گیا''۔ سرکاری ملازمین کا ایک احتجاجی جلوس جا رہا ہے۔ ملازمین کے ہاتھوں میں ''تنخواہ بڑھاؤ۔ مہنگائی الاونس بڑھاؤ، ہمارا بھتہ بڑھاؤ'' جیسی تختیاں ہیں۔ لکشمن کا عام آدمی سڑک کے کنارے کھڑا جلوس کو دیکھ رہا ہے۔ اس پر ایک احتجاجی ملازم اسے دیکھ کر کہتا ہے ''افسوس کہ یہ بیچارہ ہمارے جلوس میں شامل نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تو اب تک بیروزگار ہے''۔ ٹریفک کے مسئلہ پر لکشمن نے بے شمار کارٹون بنائے ہیں۔ ایک کارٹون میں ایک موٹر نشین شخص 'عام آدمی' سے کہتا ہے ''خدا کے فضل سے میرے پاس ایک موٹر ہے لیکن بدقسمتی سے میرے پاس وہ سڑک نہیں ہے جس پر میں یہ موٹر چلا سکوں''۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر بڑا طنز کرنا لکشمن کا خاصہ ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۶ر جنوری ۲۰۰۲ء)

☆☆

غالبؔ کی حویلی کے محافظ

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم غالبؔ کے سخن فہم نہیں بلکہ طرفدار ہیں۔اسی لئے ہم اپنا شمار غالبؔ کے ناقابلِ علاج بے لوث عقیدت مندوں میں کرتے ہیں۔اگر ہم سچ مچ غالبؔ کے سخن فہم ہوتے یا اگر ہمارا شمار بھی ماہرین غالبیات میں ہوتا تو یقین مانئے آج ہم بھی ایک خوش حال اورآسودہ حال زندگی گذار رہے ہوتے۔یقین نہ آئے تو بعض مشہورو معروف ماہرین غالبیات اورغالبؔ کے ناقدوں کی زندگی سے ہماری زندگی کا تقابل کر کے دیکھ لیجئے۔غالبؔ کی شخصیت اور فن پر دو ایک کتابیں یا مضامین کیا لکھ لیتے ہیں، زندگی بھر غالبؔ سمیناروں میں شرکت کی خاطر ہوائی جہازوں میں ادھر سے اُدھر اُڑتے پھرتے ہیں۔فائیو اسٹار ہوٹلوں میں قیام فرماتے ہیں اور اپنے مطبوعہ مقالوں کو (جوانھیں اب زبانی یاد ہوگئے ہیں) غالبؔ سمیناروں میں بار بار پڑھنے کا بھاری معاوضہ وصول کرتے ہیں۔یادش بخیر!پندرہ برس پہلے ہم نے غالبؔ کے ایک خط کی پیروڈی لکھی تھی اور اس خط کو جو ہمارے نام تھا، دہلی کی ایک ادبی محفل میں پڑھ کر سنایا تھا۔اس خط میں غالبؔ نے ایک جگہ لکھا تھا ''میاں! کبھی کبھار نیچے کی دنیا میں دوبارہ آنے کو جی چاہتا ہے۔ بارے کبھی آنا ہوا تو اس بار غالبؔ بن کر نہیں آؤں گا بلکہ ماہر غالبیات بن کر آؤں گا۔اس لئے کہ ماہر غالبیات بننے میں بڑے فائدے ہیں۔غالبؔ بننے میں نہیں''۔اس محفل میں حکیم عبدالحمید کے علاوہ مشہور ماہرِ غالبیات مالک رام بھی موجود تھے جنہوں نے اس جملہ پر بے پناہ داد دی تھی۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ غالبؔ کی زندگی اور ایک ماہرِ غالبیات کی زندگی میں کتنا فرق ہوتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ غالبؔ جب تک زندہ رہے اُن کے حالات زندگی کبھی بہتر نہیں ہوئے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ ان کی فاقہ مستی ایک دن ضرور رنگ لائے گی وہ قرض کی مئے پیتے رہے۔ صاحبانِ اقتدار کی شان میں قصیدے لکھتے رہے۔ اپنی معمولی سی پنشن کی بحالی کے لئے غیر معمولی عرضیاں لکھتے رہے۔ کرایہ کے مکانوں میں زندگی گذاری۔ ۱۸۵۷ کے واقعات کو جھیلا اور بدلتے ہوئے معاشرہ کی سنگینی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بہر حال ان کے جیتے جی ان کے حالات کبھی ٹھیک نہیں ہوئے لیکن جیسے ہی انہوں نے دنیا سے منہ موڑا اچانک ان کے حالات زندگی بہتر ہونے لگے اور ماشاء اللہ اب ان کے حالات اتنے بہتر ہوگئے ہیں کہ ان کی وجہ سے سینکڑوں افراد کے حالات زندگی بہتر ہوتے جارہے ہیں اور ان کی روٹی روزی کا دارومدار سراسر غالبؔ کی ذات پر ہے۔ غالبؔ کے نام سے کئی ادارے قائم ہیں جن کے پاس کروڑوں روپیوں کی مالیت کی جائیداد ہے جب کہ خود غالبؔ نے اپنی زندگی کا آخری زمانہ نہایت تنگدستی میں گذارا۔ آج ہمیں غالبؔ اور ان کے حالاتِ زندگی کا خیال اس لئے آیا کہ پچھلے دنوں غالبؔ کی اس حویلی کا ذکر اخباروں میں تفصیل سے آیا ہے جسے اب ایک قومی یادگار بنادیا گیا ہے۔ حکومت نے طویل مقدمہ بازی کے بعد بلّی ماران کی گلی قاسم جان میں واقع غالبؔ کی اس حویلی کا قبضہ ۱۹۹۹ میں حاصل کیا تھا اور اب اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری محکمہ آثارِ قدیمہ کو سونپ دی گئی ہے۔ غالبؔ نے اپنی زندگی کے آخری نو برس ۱۸۶۰ سے ۱۸۶۹ تک اس گھر میں گذارے تھے۔ حکومت نے اس پوری حویلی کو تو حاصل نہیں کیا البتہ اس کے ایک حصّہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا ہے۔ حکومت نے ضروری مرمت اور ترمیم کے بعد دسمبر ۲۰۰۰ء میں اس یادگار کو عوام کے لئے کھول دیا۔ غالبؔ کی اس حویلی کی دیکھ بھال کے لئے محکمہ آثارِ قدیمہ کی طرف سے چار پانچ محافظوں کو متعین کیا گیا ہے جو باری باری سے ڈیوٹی انجام دیتے ہیں اور عملہ کے دو تین ارکان رات کو بھی یہاں موجود رہتے ہیں۔ اب یہ شکایات آئی ہیں کہ شام میں پانچ بجے جب یہ عمارت عوام کے لئے بند کردی جاتی ہے تو بعض محافظین حویلی کے اندر ناؤ ونوش کی محفلیں آراستہ کرتے ہیں اور یہاں خاصا ہنگامہ ہوتا رہتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس طرح کی محفلوں سے اس یادگار کی بے حرمتی ہوتی ہے اور اس کے آس پاس رہنے والوں کے سکون میں بھی خلل پڑتا ہے۔ پتہ چلا ہے کہ ان شکایات کی روشنی میں غالبؔ کی حویلی کے بعض محافظوں کا تبادلہ کردیا گیا ہے۔

آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ غالبؔ اس حویلی میں ۱۳۳ برس پہلے رہا کرتے تھے۔اس وقت بھی وہ اپنے مکان سے مطمئن نہیں تھے بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ وہ سرے سے مکان کے ہی خلاف تھے۔وہ تو اصل میں بے درودیوار سا ایک گھر بنانا چاہتے تھے اور تہذیب وتمدن کی اتنی ترقی کے باوجود آج تک کسی آرکٹیکٹ کو ایسا گھر بنانے کی توفیق عطا نہیں ہوئی۔انسانی سماج نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ کسی کا گھر بے درودیوار ہو اور اس کے مکین اس میں اپنے سازوسامان کے ساتھ محفوظ رہ سکیں۔چور اُچکّے تو دیواروں کو پھاند کر یا نقب لگا کر ان گھروں میں داخل ہوجاتے ہیں۔اسی لئے غالبؔ جب بھی دشت کو دیکھتے تھے تو انہیں اپنا گھر یاد آجاتا تھا۔ غالبؔ نے اپنے شعروں اور خطوں میں جابجا اپنے جس گھر کا حال بیان کیا ہے وہ سروسامانی کا نہیں بلکہ بے سروسامانی کی تصویر پیش کرتا ہے۔غالبؔ نے ایک خط میں اپنے ایک گھر کے بارے میں فرمایا تھا کہ بارش اگر ایک گھنٹہ برستی ہے تو اس گھر کی چھت چوبیس گھنٹوں تک ٹپکتی رہتی ہے۔ ان کے ایسے ہی کسی گھر کے درودیوار پر سبزہ بھی اُگا کرتا تھا۔ہوسکتا ہے غالبؔ نے اپنی نوجوانی کے دن اچھے اور عالیشان مکانوں میں گذارے ہوں لیکن بعد میں وہ جن گھروں میں رہے وہ کچھ ایسے تھے کہ اگر یہاں اُن کا کوئی خاص مہمان چلا آتا تھا تو تڑپ کر کہہ دیتے تھے۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ان مکانوں کی ساخت سے قطع نظر ان مکانوں کے اندر جو سازوسامان ہوا کرتا تھا اس کے بارے میں خود غالبؔ نے ایک شعر میں کہا ہے

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اب غالبؔ کی حویلی کے محافظ اگر راتوں میں ناؤنوش کی محفلیں آراستہ کرتے ہیں اور شورشرابہ کرتے ہیں تو اس پر اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے۔بلکہ ایک صاحب تو یہاں تک کہہ رہے تھے کہ خود غالبؔ بھی تو اپنی اس حویلی میں یہی کچھ کیا کرتے تھے۔یہ اور بات ہے کہ ناؤنوش کے علاوہ یہاں شعروشاعری کا دور بھی چلا کرتا تھا۔مگر ان دنوں جس طرح کی شاعری ہورہی ہے اگر اس کا دور نہ چلے تو ہی اچھا ہے۔اس معاملہ میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ غالبؔ کے انتقال کے ۱۳۳

برس تک کسی نے اس حویلی کے بارے میں نہیں سوچا۔ ایک زمانہ تک یہ مکان گھوڑوں کا اصطبل رہا۔ بعد میں یہاں لکڑی کی ٹال رہی۔ پھر یہاں کوئلہ کا کاروبار ہوتا رہا۔ ان برسوں میں غالبؔ کی حویلی کی جو حالت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ اب اگر محکمہ آثارِ قدیمہ نے اس حویلی کو حاصل کرلیا ہے تو یہ کونسی اہم بات ہے۔ پھر آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں آثارِ قدیمہ کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ خود ہم نے ملک کے کئی آثارِ قدیمہ پر خود اپنے ہاتھ سے اپنا نام لکھ رکھا ہے کیونکہ یہی ہماری تہذیبی روایت ہے۔ دہلی میں رہتے ہوئے ہمیں تیس برس ہوگئے لیکن صرف ایک بار غالبؔ کی حویلی کو باہر سے دیکھا ہے۔ اس لئے کہ یہاں پہنچنا ایک دشوار امر ہے۔ موٹریں یہاں نہیں جاسکتیں۔ آٹو چلتے ہیں مگر آدمی کی جان کو خطرہ لگا رہتا ہے۔ ایسے میں غالبؔ کی حویلی کو محفوظ کر دیا گیا ہے تو اس کا کیا فائدہ ہوگا۔ لندن میں ہمیں ہیمپسٹیڈ کے علاقہ میں ڈکشنری والے ڈاکٹر جانسن اور انگریزی کے مشہور شاعر کیٹسؔ کی یادگاریں دیکھنے کا موقع مل چکا ہے۔ کیٹسؔ اور کیٹسؔ کی محبوبہ کے بالوں تک کو ان میں بڑے سلیقہ سے محفوظ رکھا گیا ہے اور ان کی کئی اشیاء اس طرح رکھی گئی ہیں جیسے کیٹسؔ ابھی آکر انھیں استعمال کریں گے۔ بیچارے غالبؔ کی اب کونسی چیز محفوظ رہی ہوگی۔ خود غالبؔ نے اپنے دیوان اور خطوط کو چھوڑ کر کوئی چیز محفوظ نہیں رکھی۔ خطوط بھی اس لئے محفوظ رہ گئے کہ دوسروں کو لکھے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ غالبؔ کے نام مشاہیر کے کئی خطوط بھی آئے ہونگے لیکن غالبؔ یا غالبؔ کے ورثاء نے انھیں محفوظ رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس خالی اور سنسان حویلی میں اگر کچھ محافظ رات کو شور مچاتے ہیں تو مچانے دیجئے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۰ر مارچ ۲۰۰۲ء)

فنکار کی عزّت مرنے کے بعد ہی ہوتی ہے

ہندی کے شہرہ آفاق شاعر مہاکوی سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا کو اس دنیا سے گذرے ہوئے چالیس برس بیت گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری اکتیس (۳۱) برس الہ آباد میں اپنے مصور دوست کملا شنکر سنگھ کے مکان کے ایک کمرہ میں کسم پرسی کے عالم میں گذارے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ یہ مکان خود کملا شنکر سنگھ کا نہیں تھا بلکہ وہ اس مکان میں کرایہ سے رہتے تھے اور مالک مکان یہ چاہتا تھا کہ وہ اس مکان کو خالی کر دیں۔ اسی اثناء میں نرالا جی کا انتقال ہوا تو کملا شنکر سنگھ نے اُس کمرہ کو بند کر دیا جس میں نرالا جی کا سامان تھا۔ طویل قانونی جنگ کے بعد کملا شنکر مقدمہ ہار گئے اور اب یہ مکان اس کے اصل مالک امبیکا پرشاد اوستھی کے قبضہ میں ہے۔ مقدمہ ہارنے کے بعد کملا شنکر تو بنارس چلے گئے اور جاتے ہوئے نرالا جی کا سامان ان کے کمرہ میں ہی چھوڑ گئے۔ چونکہ کملا شنکر نے مالک مکان کو پورا کرایہ ادا نہیں کیا تھا اس لئے مالک مکان نے نرالا جی کا ساز و سامان الہ آباد کے دارا گنج تھانے میں یہ کہہ کر جمع کروا دیا تھا کہ جب تک کملا شنکر بقائے کے ستر ہزار روپے نہ ادا کریں تب تک اس ساز و سامان کو پولیس تھانے میں محفوظ رکھا جائے۔ اس بات کو بھی ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں اچھے اور سچے فنکار کے "حالاتِ زندگی" اس کے مرنے کے بعد خاصے بہتر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ نرالا کے ساتھ بھی یہی

ہوا۔ اب ان کے چاہنے والوں اوران کے داماد کی یہ خواہش ہے کہ اس سازوسامان کو حاصل کر کے ایک میوزیم بنایا جائے۔ سنا ہے کہ اس میں وہ تخت بھی شامل ہے جس پر بیٹھ کر نرالا نے ارچنا، آرادھنا اور گیت گنج وغیرہ جیسی اہم کتابیں لکھی تھیں۔ ان کے چاہنے والوں اوران کے پوتے وویک نرالا نے جب اس سازوسامان کو حاصل کرنے کے لئے داراگنج تھانہ کے انچارج سے رابطہ پیدا کیا تو تھانہ کے انچارج نے ٹال مٹول کا رویہ اپنایا اور لاعلمی ظاہر کی۔ تھانیدار کے اس رویہ پر ہندی کے ادبی حلقوں میں تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس معاملہ میں ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہم لوگ اپنا غصہ ہمیشہ غلط آدمی پر اُتارتے ہیں۔ پنجابی میں ایک کہاوت ہے کہ چوری کرے مونچھوں والا، پکڑا جائے داڑھی والا۔

اول تو نرالا جی کا سازوسامان تھانہ میں رکھوانا ہی غلط تھا۔ یہاں آدمی کا سازوسامان تو گیا اس کی عزّت تک محفوظ نہیں رہ سکتی۔ ایسے میں نرالا جی کا سامان بھلا تھانہ میں کیونکر محفوظ رہ سکتا تھا۔ یہ تھانہ ہے ادیبوں اور شاعروں کی انجمن یا تنظیم نہیں کہ شاعر کی تخلیقات اور اُس کی باقیات کو سمیٹ سمیٹ کر محفوظ رکھا جا سکے۔ فنکاروں اور ادیبوں کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جب تک وہ زندہ رہتے ہیں لوگ ان کے فن پر داد تو بہت دیتے ہیں لیکن داد کے سوائے کچھ بھی نہیں دیتے۔ یوں بھی ہم لوگ مُردہ پرست ہیں۔ جب تک فنکار کی رحلت نہیں ہو جاتی تب تک اس کی عزّت اور توقیر میں اضافہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے ہمارے بیشتر فنکار زندہ رہ کر تکلیفیں اٹھانے کے مقابلہ میں مر کر امر ہو جانے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ نرالا جی نے مرنے سے پہلے اپنے کمرہ میں کیا سازوسامان چھوڑا تھا۔ ہوسکتا ہے کوئی سازوسامان ہی نہ چھوڑا ہو۔ ہمارے اُردو کے شاعروں اور ادیبوں کے سازوسامان کا حال بہت پہلے ایک شعر میں یوں بیان ہو چکا ہے۔

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے اکثر فنکار مال ومتاع، زروجواہر کے مقابلہ میں اس طرح کے سازوسامان کو نہ صرف بنیادی اہمیت دیتے رہے ہیں بلکہ اسے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ بھی سمجھتے رہے ہیں۔ ہمارے ایک شاعر دوست اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کے پاس

حسیناؤں کی ایسی تصویریں اوران کے ایسے خطوط ہیں جن کی مالیت لاکھوں روپیوں تک جا پہنچتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس طرح کی باتیں کرنے کے بعد جب محفل سے جانے لگتے تھے تو اگلے وقت کے کھانے کے لئے ہم سے دس بارہ روپے اُدھار ضرور مانگ لیا کرتے تھے۔ ہم نے انھیں کئی بار یہ مخلصانہ مشورہ دیا کہ اگر وہ لاکھوں روپیوں کی مالیت والے ان خطوط کو دس پندرہ ہزار روپے میں ہی بیچ دیں تو ان کے بہت سے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ اس کے جواب میں وہ یہ فرماتے تھے کہ وہ ان خطوط کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور ان کے مرنے سے پہلے کوئی ان خطوط کو حاصل نہیں کرسکتا۔ بد قسمتی سے وہ اس دنیا سے گذر گئے تو ہم نے ان کے لواحقین کو بہت سمجھایا کہ مرحوم کے چھوڑے ہوئے کاغذات میں بعض ایسے خطوط اور مخطوطات بھی ہیں جن کی مالیت لاکھوں روپیوں کی ہوسکتی ہے۔ مگر ہمیں یہ جان کر افسوس ہوا کہ مرحوم کی فاتحہ سویم کے دوسرے دن ہی ان کے لواحقین نے ان کے چھوڑے ہوئے ان بیش قیمت کاغذات کو رڈی سمجھ کر ایک رڈی والے کے ہاتھوں فروخت کردیا تھا۔ کیا عجب کہ ان کے نام آئے ہوئے حسیناؤں کے یہ لاقیمت خطوط کسی پنواڑی کی دکان پر سامان کو باندھ کر پڑیاں بنانے کے کام آرہے ہوں۔ ایسے قیمتی کاغذات کی ایسی بے عزّتی کو دیکھ کر ہمیں بے حد افسوس ہوا۔ بہرحال ادیبوں اور فنکاروں کے پاس ایسا ہی قیمتی مگر گھٹیا 'ساز و سامان' پایا جاتا ہے۔ ہمیں اس وقت ترکی کے ملا نصرالدین یاد آگئے جن کے گھر ایک بار ایک چور چوری کرنے آیا تو یہ شرم کے مارے اپنے ہی گھر کی ایک الماری میں چھپ کر کھڑے ہوگئے۔ چور نے گھر کی ساری تلاشی لی لیکن اسے ایک بھی ایسی شئے نہیں ملی جسے وہ چُرا کر لے جاسکے۔ بعد میں جب اس نے الماری کھولی تو دیکھا کہ ملا نصرالدین بہ نفس نفیس نظریں جھکائے کھڑے ہیں۔ چور نے ڈرتے ڈرتے جب ملا نصرالدین سے الماری میں چھپ جانے کی وجہ دریافت کی تو ملاّ نے دست بستہ عرض کی ''حضور! آپ اتنی امیدوں کے ساتھ میرے گھر میں چوری کرنے آئے تھے۔ مجھے شرمندگی ہے کہ میں آپ کی توقعات کو پورا نہ کرسکا۔ تاہم میں آپ کا شکرگذار ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ مرے گھر چوری کی جاسکے۔ آپ مجھے اپنا پتہ دیتے جائیے۔ اگر کبھی میرے پاس دولت آجائے تو میں خود اسے لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں گا۔ براہ کرم مستقبل میں آپ میری اجازت کے بغیر چوری کرنے نہ آئیں تو ممنون ہوں گا۔''

اب رہی بات نرالا جی کے سازوسامان کی جس کے بارے میں سمجھا جارہا ہے کہ یہ پولیس تھانے میں محفوظ ہے تو اس سلسلہ میں ہماری عرض یہ ہے کہ جو چیز ایک بار حوالات میں چلی جاتی ہے، چاہے وہ آدمی ہو یا سازوسامان، تو اس کی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ نرالا جی کو اس دنیا سے گذرے ہوئے چالیس برس بیت گئے۔ تھانہ میں جو چیز ایک دن پہلے آتی ہے وہ دوسرے دن تک محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اب اس تھانے میں چالیس برس پہلے رکھوائی ہوئی چیزوں کو تلاش کرنا بے سود ہے۔ اس اطلاع میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نرالا جی جس کمرہ میں رہتے تھے اسے حکومت نے اب ایک یادگار بنادیا ہے اور اس کمرہ کی دیواریں اتنی اونچی کردی گئی ہیں کہ کوئی اسے ڈھنگ سے دیکھ بھی نہیں سکتا۔ چونکہ نرالا جی اس مکان کے ایک کمرہ میں بطور کرایہ دار نہیں بلکہ اصل کرایہ دار کے مہمان کی حیثیت سے رہتے تھے اس لئے پورے مکان کو یادگار نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ اگر آپ ہمارا شمار بھی ادیبوں میں کریں تو ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ زندگی کے پچپن برس ہم نے بھی کرایہ کے مکانوں میں گذارے اور مختلف شہروں کے ان گنت مکانوں میں مقیم رہے۔ اگر خدانخواستہ ہمارے چاہنے والے ہمارے بعد ہمارے ''حالاتِ زندگی'' کو بہتر بنانے کا ارادہ رکھتے ہوں تو اُن سے ہماری گذارش ہے کہ وہ ہماری کوئی یادگار قائم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ نہ جانے کتنے ہی مکان ہماری یادگار قائم کرنے کے چکر میں برباد ہو جائیں گے۔ پھر یادگار قائم ہوگی تو اس میں ایک میوزیم بھی ہوگا جس میں ہمارے استعمال کی چیزیں رکھی جائیں گی۔ بخدا ہمارے پاس ایسی چیزیں نہیں ہیں جو کسی میوزیم میں بطور نمائش رکھی جاسکیں۔ لہٰذا ہمارے بہی خواہوں سے درخواست ہے کہ وہ ہماری زندگی میں ہی ہمارے ''حالات زندگی'' کو بہتر بنانے کی کوشش کریں تاکہ ہم ایسا سازوسامان جمع کرسکیں جسے بعد میں میوزیم میں رکھا جاسکے اور جو ہمارے شایانِ شان ہو۔

روزنامہ ''سیاست'' (۳۰؍جنوری ۲۰۰۲ء)

☆☆

باتیں شکیلہ بانو بھوپالی کی

پچھلے ہفتہ ہم نے ہندی کے شہرۂ آفاق شاعر سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا کے حوالہ سے ایک کالم لکھا تھا جس میں ہم نے ادیبوں اور فنکاروں کی ناقدری اور زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب تک فنکار زندہ رہتا ہے تب تک کسی کو اس کی زبوں حالی اور کسمپرسی کا خیال نہیں آتا لیکن جیسے ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو لوگوں کو اچانک اس کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ اس کے ''حالاتِ زندگی'' کو بہترین بنانے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ کسی دانشور نے کہا تھا کہ ایک اچھے اور سچے فنکار کی زندگی اُس کے مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ مردہ پرست معاشرہ ایسے اقوال کو اپنی گرہ میں اچھی طرح باندھ لیتا ہے اور فنکاروں کی عزّت کرنے کے لئے ان کے مرنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ ہم نے جب پچھلا کالم لکھا تھا تو عین اسی وقت ہمیں ''سیاست'' کے ذریعہ یہ اطلاع مل چکی تھی کہ اپنے زمانہ کی مشہور و معروف قوالہ شکیلہ بانو بھوپالی سخت علیل ہیں اور ان کے حالات کچھ اتنے خراب ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے علاج کے لئے مکان، زیور اور اپنی قیمتی اشیاء بیچنے پر مجبور ہو گئی ہیں اور اب وہ ممبئی کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں کسمپرسی کی حالت میں زندگی گذار رہی ہیں۔ اس اطلاع کے بعد ''سیاست'' میں ڈاکٹر م۔ق۔ سلیم کا مراسلہ ان کے بارے میں چھپا تھا جس میں انہوں نے حیدرآباد میں شکیلہ بانو بھوپالی کی بے پناہ مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ واقعہ لکھا تھا کہ ایک بار شاہد صدیقی نے باتوں باتوں میں شکیلہ بانو بھوپالی سے پوچھ لیا۔

تم شکیلہ ہو کہ بانو ہو کہ بھوپالی ہو

اس پر مخدوم محی الدین نے بے ساختہ مصرعہ ثانی کہہ کر شعر کو یوں مکمل کیا تھا۔

خیر کچھ بھی ہو مگر ماہرِ قوالی ہو

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب شکیلہ بانو بھوپالی کا فن اپنے عروج پر تھا۔ ۶۰ کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں شکیلہ بانو بھوپالی نے وہ شہرت حاصل کی جو بہت کم کے حصّہ میں آئی ہوگی۔ شکیلہ بانو بھوپالی کو ہم نے پہلے پہل حیدرآباد کے ''گاندھی بھوَن'' میں اپنا پروگرام پیش کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ زمانہ ''گاندھی بھون'' کے بھی عروج کا زمانہ تھا کیونکہ یہ آڈیٹوریم ان دنوں نیا بنا تھا اور اس کی حالت ابھی اتنی خستہ نہیں ہوئی تھی جتنی کہ آج دکھائی دیتی ہے۔ اُن دنوں حیدرآباد میں اُردو زبان وادب اور اُردو تہذیب کی روایات بھی خاصی مستحکم اور توانا تھیں۔ اُردو ادب کی کئی ممتاز ہستیاں حیدرآباد کے ادبی اُفق پر روشن اور تابندہ تھیں۔ شعر وادب کے قدر دانوں اور سخن فہموں کی بھی فراوانی تھی۔ آج اُردو ادب کی محفلوں میں زیادہ تر عمر رسیدہ لوگ ہی نظر آتے ہیں لیکن ان دنوں محفلیں شریر اور منچلے مگر شائستہ اور باذوق نوجوانوں سے بھری ہوتی تھیں۔ شکیلہ بانو بھوپالی کے پروگرام کو دیکھ کر بوڑھے بھی ''ضرورتِ شعری'' کے تحت اپنے آپ کو جوان محسوس کرنے لگتے تھے۔ ایسے میں اندازہ لگایئے کہ نوجوانوں کے دلوں پر کیا نہ گذرتی ہوگی۔ شکیلہ بانو کا فن حسن، نوجوانی، شعر ونغمہ اور ناز وادا کے خوبصورت امتزاج سے عبارت تھا۔ لگتا تھا غالبؔ نے برسوں پہلے شکیلہ بانو بھوپالی کے لئے ہی یہ شعر کہا تھا۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اُس کی ہر بات

عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

شکیلہ بانو بھوپالی کے پروگرام میں شرکت کرنے کے بعد ہم پر ایک عجیب سی سرشاری طاری ہوگئی تھی۔ اس لئے کہ اس طرح کا پروگرام ایک انوکھی بات تھی اور آج بھی ہے۔ ہم نے موسیقی کی بہت سی محفلوں میں شرکت کی ہے۔ رقص وسرود کی محفلوں سے بھی آشنا ہیں لیکن شکیلہ بانو بھوپالی کا فن ان سب سے مختلف تھا۔ انہوں نے شعر، نغمہ، طرزِ ادا، برجستگی، حاضر جوابی اور والہانہ پن کے امتزاج سے ایک ایسا فن ایجاد کیا تھا جو اُن کا اپنا تھا۔ بعد میں بہت سوں نے شکیلہ بانو کی تقلید کرنے کی کوشش کی لیکن وہ 'مولوی مدن کی سی بات' پیدا نہ ہوسکی۔ وہ اس فن کی موجد تھیں اور

یہی ان کی انفرادیت تھی۔ کسی بھی شعر کو پیش کرتے ہوئے وہ سراسر مجسم شعر بن جایا کرتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے شعر اُن کی ذات میں ڈھل کر تخلیق ہو رہا ہو۔ شعر میں انگڑائی کا ذکر ہوتا تو انگڑائی کے عمل کو اپنے جسم کے مختلف زاویوں سے مختلف انداز کے ساتھ پیش کرتی تھیں۔ معشوق کے انتظار کا بیان ہوتا تو ان کا جسم سراپا انتظار بن جاتا اور ان کا روم روم انتظار کی کیفیت میں ڈوب جاتا۔ بہار کی آمد کا بیان ہوتا تو ان کے وجود میں کلیاں سی چٹکنے لگ جاتیں اور یوں محسوس ہوتا جیسے بادِ صبا کے جھونکے سارے ماحول کو معطر کر رہے ہیں۔ لگتا تھا شاعر نے اپنے قلم سے نہیں بلکہ شکیلہ بانو بھوپالی کے سراپے کی مدد سے شعر کو تخلیق کیا ہے۔ شکیلہ بانو شعر و ادب کا بے حد اچھا ذوق رکھتی ہیں بلکہ خود شاعرہ بھی ہیں۔ اس لئے شعر کا مفہوم ان کے جسم میں ڈھل کر اور بھی معنی خیز اور تہہ دار ہو جاتا تھا۔ شکیلہ بانو بھوپالی اپنے فن کو کچھ اس طرح پیش کرتی تھیں کہ ان کے سامعین ایک منزل پر پہنچ کر خود پروگرام کا حصہ بن جاتے تھے، چاہے ان کی تعداد ہزاروں میں ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اپنی حاضر جوابی، ذہانت، فطانت اور بذلہ سنجی کو کچھ اس طرح بروئے کار لاتیں اور سامعین سے کچھ اس ادا سے مخاطب ہوتیں کہ لگتا تھا جیسے وہ سامعین نہیں بلکہ ان کے ہم نوا ہیں۔ شکیلہ بانو بھوپالی کے پہلے ہی پروگرام کے بعد حیدرآباد کی گلی گلی میں ان کی دھوم مچ گئی۔ مخدوم محی الدین نے شکیلہ بانو کے بارے میں شعر کہا تھا۔

شہر میں دھوم ہے اک شعلہ نوا کی مخدومؔ
تذکرے رستوں میں چرچے ہیں پری خانوں میں

پروگرام کے دوسرے دن شکیلہ بانو بھوپالی کو ہم نے ''سیاست'' کے دفتر میں دیکھا جہاں وہ عابد علی خاں، محبوب حسین جگر اور شاہد صدیقی سے ملنے کے لئے آئی تھیں، حُسن اور خوبصورتی اپنی جگہ لیکن ہمیں تو وہ رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے نہایت سیدھی سادی، قبول صورت سی خاتون نظر آئیں۔ ہم نے حیرت سے دل ہی دل میں اپنے آپ سے پوچھا تھا'' کیا یہی وہ محترمہ ہیں جو کل رات اسٹیج پر قیامت ڈھا رہی تھیں اور بجلیاں گرا رہی تھیں۔'' سچ ہے فنکار کو اس کے فن کے ساتھ دیکھنے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر کا وہ بہت احترام کرتی تھیں اور جب بھی حیدرآباد آتیں تو ایک طرح سے ان ہی کی مہمان ہوتیں۔ اسی حوالہ سے وہ ہمیں آج بھی بے حد عزیز رکھتی ہیں۔ اگرچہ ادھر ایک عرصہ سے اُن سے نہ ملاقات ہوئی اور نہ ہی

خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ کبھی ہمارا کوئی مضمون انھیں پسند آتا تو خوش ہو کر اظہار پسندیدگی کرتیں۔ ۱۹۶۸ء میں ہم مزاح نگاروں کے ایک جلسہ میں شرکت کے لئے ممبئی گئے تو وہ بطور خاص اس محفل میں آئیں اور دوسرے دن کھار کے علاقے میں اپنے گھر پر ہمارے لئے ایک ضیافت کا اہتمام کیا۔ حیدرآباد سے شکیلہ بانو بھوپالی کو بے حد لگاؤ رہا ہے۔ دنیا کے کئی ممالک جیسے افریقہ، امریکہ، کناڈا، برطانیہ، سوئیزرلینڈ، جرمنی، مصر، کویت اور دوبئی وغیرہ کے علاوہ ہندوستان کے بے شمار شہروں میں اپنے پروگرام پیش کر چکی ہیں لیکن حیدرآباد کا ذکر سب سے پہلے کریں گی۔ اُردو شعر و ادب سے انھیں بچپن ہی سے لگاؤ رہا ہے۔ ان کے والد اور نانا بھی شاعر رہ چکے ہیں۔ قوالی کے پروگراموں سے شکیلہ بانو کو جب بھی فرصت ملتی ہے تو وہ خود بھی شعر کہتی ہیں۔ ۱۹۹۴ میں ان کا شعری مجموعہ "ایک غزل اور" کے عنوان سے چھپا تھا جس کا ایک نسخہ انہوں نے ازراہ عنایت ہمیں بھی روانہ کیا تھا۔ کرشن چندر، اختر سعید خاں، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس جیسی نامور ہستیوں نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ خوشونت سنگھ جب "السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا" کے ایڈیٹر تھے تو انہوں نے "ویکلی" کے سرورق پر شکیلہ بانو بھوپالی کی تصویر چھاپی تھی اور ان کے فن پر اظہار خیال کیا تھا۔ شکیلہ بانو بھوپالی کی علالت اور ان کے موجودہ حالات کے بارے میں جان کر ہمیں بے حد دکھ ہوا۔ ہمارا معاشرہ آخر کب اپنے فنکاروں کی قدر کرنا سیکھے گا۔

ہم اس کالم کو شکیلہ بانو بھوپالی کے ہی ایک شعر پر ختم کرنا چاہیں گے۔

ہم جاگتے تو صبح تھی، سوتے تو رات تھی
اب ہم ہی روز و شب کے غلام و کنیز ہیں

روزنامہ "سیاست" (۷ رجولائی ۲۰۰۲ء)

☆☆

کرناٹک اُردو اکیڈمی کا ایوارڈ ملنے پر

صاحبو! اب جبکہ ہم اپنی تاریخِ پیدائش سے بہت دور اور اپنی تاریخِ وفات کے قریب پہنچنے والے ہیں تو ہمیں بالآخر وہ خطۂ ارض یا علاقہ مل گیا ہے جس سے ہم اب اپنے آپ کو بلا جھجک منسوب کر سکتے ہیں۔ آپ نے ''غیر مملوکہ زمین'' یعنی (No Man's Land) کے بارے میں تو بہت سنا ہوگا لیکن کسی ''فردِ بے ارض'' یا بے زمین انسان (No Land's Man) کو نہیں دیکھا ہوگا۔ اگر نہیں دیکھا ہے تو ہمیں دیکھ لیجئے۔ ہم ہی وہ بدنصیب انسان ہیں جس نے اپنی زندگی کے چھیاسٹھ سڑسٹھ برس بے زمینی کی کیفیت میں گزار دیے۔ اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں۔ سارا قصور اُس سابق ریاست حیدرآباد کا ہے جس میں ہم برسوں پہلے پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں جب اس ریاست کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو ہم بھی ٹکڑوں میں بٹ کر کہیں کے نہ رہے۔ ویسے تو ہمارا آبائی وطن عثمان آباد ہے جو اب مہاراشٹر میں شامل ہے لیکن ہم پیدا ضلع گلبرگہ کے مقام چنچولی میں ہوئے تھے۔ آدمی کو کہاں پیدا ہونا چاہیے اس کے بارے میں وہ خود تو کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اگر یہ فیصلہ ہمارے بس میں ہوتا تو ہم چنچولی جا کر وہاں کیوں پیدا ہوتے۔ سیدھے سیدھے امریکہ میں جا کر پیدا نہ ہو جاتے جہاں جانے یا پیدا ہونے کے لیے ان دنوں ساری دنیا مری جا رہی ہے۔ بچپن میں ہم نے اپنی والدہ سے ایک بار پوچھا تھا ''کیا آپ اور ابا جان بھی چنچولی میں پیدا ہوئے تھے؟'' بولیں ''میں تو تانڈور میں پیدا ہوئی تھی اور تمہارے ابا عثمان آباد میں پیدا ہوئے تھے۔'' اس پر ہم نے معصومیت سے پوچھا تھا ''پھر ہم لوگ آپس میں مل کیسے گئے؟''۔ کیا کریں قسمت آدمی کو

کہیں بھی پیدا کردیتی ہے۔ ہمارے ایک دوست ہم پر طعنہ کستے تھے کہ میاں چنچولی بھی کوئی مقام ہے پیدا ہونے کا۔ نام سے یوں لگتا ہے جیسے چنچولی کسی مقام کا نام نہیں بلکہ کسی جنگلی پھل کا نام ہے بلکہ کبھی کبھی تو یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ چولی کے پیچھے یا چنچولی کے پیچھے کیا ہے؟۔ اگرچہ ہم پیدا تو چنچولی میں ہوئے تھے لیکن ابھی چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں ہوئے تھے کہ وہاں سے چلے گئے۔ بچپن اور نوجوانی کے اٹھارہ برسوں کا کچھ عرصہ عثمان آباد میں اور زیادہ عرصہ گلبرگہ میں گزارا بلکہ وہیں سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی کامیاب کیا۔ چونکہ اس زمانے میں اس سے زیادہ تعلیم کا بندوبست گلبرگہ میں یعنی موجودہ ریاست کرناٹک میں نہیں تھا تو حیدرآباد چلے گئے اور لگ بھگ وہاں بھی اٹھارہ انیس برس گزارے۔ یہ اور بات ہے کہ پچھلے انتیس برسوں سے ہم دہلی میں مقیم ہیں۔ ایک عرصے تک ہم اپنے آپ کو حیدرآبادی ہی سمجھتے رہے کیونکہ ہمارے نزدیک حیدرآباد کسی علاقے کا نہیں بلکہ ایک تہذیب اور ایک تمدن کا نام ہے۔ ۱۹۵۶ء میں جب سابق ریاست حیدرآباد کی تقسیم عمل میں آئی تو ہم کہیں کے نہ رہے۔ مہاراشٹر والوں نے ہمیں کرناٹک کا سمجھا اور کرناٹک والوں نے ہمیں حیدرآباد کا جانا۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ حیدرآبادی ہمیں دہلی والا سمجھتے ہیں اور دہلی والے ہمیں حیدرآباد کے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔ گویا ہم ایک بے زمین انسان بن کر رہ گئے ہیں۔ خدا بھلا کرے کرناٹک اُردو اکیڈمی کا کہ اس نے آخری وقت ہی سہی (یہاں آخری وقت سے مراد ہمارے آخری وقت سے ہے، کرناٹک اُردو اکیڈمی کے آخری وقت سے نہیں) ہمیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور ہماری مجموعی خدمات پر اپنی ریاست کا انعام دینے کا اعلان کرکے یہ ثابت کردیا کہ ہم لنڈورے نہیں بلکہ ہمارا بھی اپنا ایک علاقہ ہے۔ جس دن اس ایوارڈ کی اطلاع اخباروں میں چھپی اُس دن ہمارے ایک دوست نے کہا ''یار انعام تو بڑا ہے لیکن انعام کی رقم چھوٹی ہے۔'' اس تبصرے کو سننے کے بعد ہم ہنس کر خاموش ہوگئے۔ ہمارے اس طرح ہنسنے اور خاموش رہنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ایوارڈ وہی بڑا ہوتا ہے جو محبت اور خلوص کے جذبے کے ساتھ ملے۔ زیادہ مالیت رکھنے والا ایوارڈ ان دنوں یوں ہی کسی کو نہیں مل جاتا بلکہ اسے حاصل کیا جاتا ہے۔ ایسے ایوارڈ کے ذریعے انعام یافتہ ادیب کی عزّت افزائی نہیں کی جاتی بلکہ اسے ذلیل کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوڑتوڑ اور دھاندلیوں کے ذریعے حاصل کیے جانے والے ایوارڈ اب بے توقیر اور بے وقعت ہوتے جارہے ہیں اور انھیں حاصل کرنے کے بعد ادیب انعام یافتہ

کم اور سزایافتہ زیادہ نظر آنے لگتا ہے۔ ہم نے ایسے ایوارڈوں کو قبول کرنے سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ مانا کہ کرناٹک اُردو اکیڈمی کی طرف سے ملنے والا ایوارڈ مالیت کے اعتبار سے بھلے ہی چھوٹا ہے لیکن ذرا سوچیے کہ اس ایوارڈ کے وسیلے سے ہمیں کتنا بڑا علاقہ مل گیا ہے۔ آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر اپنی عمر کے آخری حصے میں یہ تمنا کرتے رہ گئے کہ انھیں کوئے یار میں دو گز زمین ہی مل جائے۔ وہ اُنہیں نہیں ملی۔ ہمیں تو بیٹھے بٹھائے اتنا بڑا علاقہ مل گیا۔ کیا یہ کوئی معمولی اعزاز ہے کہ ہم فردِ بے ارض سے فردِ باارض بن گئے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں یہ انعام مجموعی خدمات کے لیے ملا ہے۔ ہم کرناٹک اُردو اکیڈمی کی بصارت کے قائل ہو گئے کہ اکیڈمی کے ارباب حل وعقد کو ہماری مجموعی خدمات نظر آ گئیں۔ اب پیچھے پلٹ کر دیکھتے ہیں تو بخدا ہمیں اپنی ایک بھی ایسی خدمت یاد نہیں آرہی ہے جس کا اعتراف آپ کر سکیں۔ اس ایوارڈ کے استحقاق کے لیے ہمیں اپنی جو واحد خدمت نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ چھیاسٹھ سڑسٹھ برس پہلے ہم اتفاقاً چنچولی میں پیدا ہو گئے تھے۔ ہماری بس اتنی ہی خطا تھی اور سچ پوچھیے تو اس خطا پر ہمارا کوئی اختیار نہیں تھا اور یہ خطا بھی ہم سے نہیں بلکہ ہمارے والدین سے سرزد ہوئی تھی۔ اتنی چھوٹی سی خطا پر بھلا کوئی اتنا بڑا اعزاز دیتا ہے۔ ذرا سوچنے والی بات ہے۔ اگر آپ ہماری رائے پوچھیں تو یہ ایوارڈ اُس اجنبی شخص کو ملنا چاہیے جس نے ۱۹۴۸ء کے چنچولی کے فرقہ وارانہ فساد میں ہماری جان بچائی تھی۔ اس فساد کے وقت ہم اتفاقاً پھر چنچولی میں تھے جہاں بلوائیوں نے پہلے تو ہمارے ماموں کو قتل کیا۔ پھر جب ایک بلوائی نے ہمیں ہلاک کرنے کی خاطر ہمارے گلے پر بھالا رکھ دیا تو کسی بھلے بلوائی نے اس کا بھالا یہ کہہ کر کھینچ لیا کہ ''میاں ایک بچّے کو قتل کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ اسے چھوڑ دو۔'' اور یوں چنچولی میں ہی ہمیں دوبارہ حیاتِ نو ملی یا یوں کہیے کہ ہمیں وہاں دوبارہ پیدا ہونے کا موقع مل گیا۔ شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جسے ایک ہی مقام پر دو مرتبہ پیدا ہونے کا اعزاز حاصل ہوا ہو۔ خدا کا شکر ادا کیجیے کہ اس زمانے کے فسادات نے گجرات کے حالیہ فسادات کی طرح اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کو بھی قتل کیا جا سکے۔ اگر آج ہمیں اس اجنبی شخص کا پتا معلوم ہوتا تو یہ ایوارڈ اسے ضرور دے دیتے کہ میاں یہ رہا تمہارا ایوارڈ اور یہ رہی تمہاری چنچولی۔

اب ہم گلبرگہ میں گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرنے بیٹھے ہیں تو ہمیں باتیں تو بہت سی

یاد آ رہی ہیں لیکن ایسی کوئی خدمت یاد نہیں آ رہی ہے جس کی بناپر ہمیں یہ ایوارڈ دیا جاسکے۔ کالج کے زمانے میں شرارتیں کرنے کے سوائے ہم نے کچھ نہ کیا۔ گلبرگہ میں ہمارے کتنے ہی دوست تھے جن میں سے کچھ تو اب بھی موجود ہیں اور کچھ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ وقت کا دریا اسی طرح بہتا ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دہائیوں میں گلبرگہ اُردو علم وادب کے نقشے میں نمایاں ہوتا چلا گیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ طنز ومزاح سے گلبرگہ کو خصوصی نسبت رہی ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ جیسے منفرد انشا پرداز اور مزاح نگار کا یہاں برسوں قیام رہا۔ ابراہیم جلیسؔ اور سلیمان خطیب کا تعلق تو خود گلبرگہ سے ہی تھا اور اُنھوں نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ ہمارے بڑے بھائی محبوب حسین جگر نے قدم قدم پر ہماری رہنمائی اور جناب محمد علی، سابق وزیر ٹرانسپورٹ کرناٹک نے ہماری ہمت افزائی فرمائی۔ آج یہ شخصیتیں ہمیں بے پناہ یاد آ رہی ہیں کیونکہ ہم ان ہی ہستیوں کی ذہنی تربیت کا نتیجہ ہیں۔ اُردو شاعروں اور ادیبوں کو عموماً وہ گلیاں بہت یاد آتی ہیں جن میں وہ اپنی جوانی وغیرہ کھوتے رہے ہیں۔ اگرچہ ہم نے گلبرگہ میں اپنی جوانی بالکل نہیں کھوئی لیکن اس کے باوجود وہاں کی گلیاں ہمیں بہت یاد آتی ہیں کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے ہم نے سیرِ جہاں کا آغاز کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم گلبرگہ سے حیدرآباد آئے تو یہاں بھی گلبرگہ سے اپنے تعلق کو برقرار رکھا۔ وہ اس طرح کہ یہاں بھی ہم نے دو سال تک ''گلبرگہ کاٹیج'' میں قیام کیا۔ اس کاٹیج کے سربراہ ہمارے دیرینہ کرم فرما اور دوست وہاب عندلیب تھے جنھوں نے امداد باہمی کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے گلبرگہ سے آنے والے طلبہ کے حیدرآباد میں قیام کے لیے ایک ہوسٹل قایم کیا تھا۔ آج اگر ہمیں کرناٹک اُردو اکیڈمی کا مجموعی خدمات والا یہ ایوارڈ مل رہا ہے تو اس خصوص میں ہماری واحد خدمت یہ نظر آتی ہے کہ برسوں پہلے ہم نے اُس گلبرگہ کاٹیج میں قیام کیا تھا جس کے سربراہ وہاب عندلیب تھے اور جو آج اتفاقاً کرناٹک اُردو اکیڈمی کے سربراہ بن گئے ہیں۔ جس دن ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ وہاب عندلیب کرناٹک اُردو اکیڈمی کے صدرنشین بن گئے ہیں تو اسی دن ہمیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ ایک نہ ایک دن ہمیں اس اکیڈمی کا مجموعی خدمات والا ایوارڈ ضرور ملے گا کیونکہ وہاب عندلیب اچھی طرح جانتے ہیں کہ گلبرگہ کاٹیج کے معاملات میں رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کرنے میں ہماری خدمات کتنی اہم رہی ہیں۔ گلبرگہ کاٹیج میں وہاب عندلیب کی حیثیت گاندھی جی کی سی تھی جو سب کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش میں ہمارے

بے جا اعتراضات کو ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرلیا کرتے تھے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ گلبرگہ کالج کو جب ہم نے چھوڑا تھا تو حساب فہمی کے بعد پتا چلا تھا کہ ہم پر کالج کے پورے دس روپے واجب الادا ہیں۔ اُس زمانے میں دس روپے بہت ہوتے تھے اور ہم اس قابل نہیں تھے کہ وہاب عندلیب کو یہ بھاری رقم ادا کرسکیں۔ لہٰذا ایک رات چپ چاپ اپنا سامان لے کر گلبرگہ کالج سے فرار ہوگئے تھے۔ بعد میں وہاب عندلیب نے ہماری غربت پر ترس کھا کر اپنی جیب سے اس رقم کو ادا کر کے معاملے کو رفع دفع کر دیا تھا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ آج وہ ان دس روپوں کے حصول کی خاطر ہمیں کرناٹک اُردو اکیڈمی کا دس ہزار روپے کا انعام دلوا دیں گے۔

حضرات! ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ہم اُردو کے ایک ادنیٰ مزاح نگار ہیں اور اس میدان میں ہماری کوئی خدمات نہیں ہیں۔ اگر ہم سچ مچ کے مزاح نگار ہوتے تو ہمیں لگاتار چالیس برسوں تک مزاح نگاری کرنے کی حاجت نہ پیش آتی۔ اُردو کے عظیم مزاح نگار پطرس بخاری کو دیکھیے کہ چار پانچ برسوں تک ہی مزاح نگاری کی اور اُردو ادب کو اپنی ایک بے مثال اور لازوال کتاب ''مضامینِ پطرس'' دے گئے جسے اُردو ادب میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ہم نہ تو خود کسی خوش فہمی میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں اور نہ ہی آپ کو خوش فہمی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، اس لیے یہ اعتراف کر رہے ہیں۔ تاہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ ہم ایک بڑی زبان کے چھوٹے مزاح نگار ہیں اور ہماری دعا ہے کہ یہ زبان اور اس سے وابستہ کلچر سدا پھلتا پھولتا رہے اور خاص طور پر اس علاقے میں تو یہ زبان اور بھی ترقی کرے جو اب ہم سے منسوب ہو چکا ہے۔ کرناٹک اُردو اکیڈمی کے اربابِ اختیار کا دلی شکریہ کہ انھوں نے بہرحال ہمیں ٹھکانے لگا دیا۔

روزنامہ ''سیاست'' (جون ۲۰۰۲ء)

ذکرِ قاضی سلیم کا

پچھلے دنوں راجیہ سبھا کے جو ذیلی انتخابات ہوئے اُن میں ہمارے بعض دوست جیسے اودے پرتاپ سنگھ، اُردو کے صحافی شاہد صدیقی اور سیف الدین سوزؔ پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوگئے۔ ان دوستوں کو ہم فون پر مبارکباد دینے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ شکوہ آباد (اتر پردیش) سے خود اودے پرتاپ سنگھ کا فون آ گیا۔ بولے "جناب! کل سے میرے پاس مبارکباد دینے والوں کے ٹیلی فون کالس کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ مگر تین شخصیتیں ایسی ہیں جن سے میں خود فون کر کے مبارکباد وصول کرنا چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک آپ بھی ہیں"۔ ہم نے پوچھا "ذرا ہم بھی تو سنیں کہ باقی دو شخصیتیں کونسی ہیں؟"۔ اس پر انہوں نے ان شخصیتوں کے نام بتائے (قارئین کو ہم بوجوہ ان کے نام نہیں بتائیں گے۔ بڑی نامی گرامی ہستیاں ہیں)۔ ہم نے کہا "اودے پرتاپ جی! آپ نے ہمیں کس صف میں کھڑا کر دیا؟"۔ بولے "آپ ان سے کم تھوڑے ہی ہیں"۔ ہم نے ہنس کر کہا "حضور! ہم تو آپ سے یہ شکایت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے ہماری حیثیت اتنی کم کیوں کر دی"۔ زوردار قہقہہ لگا کر بولے "دو تین دن بعد دہلی آؤں گا تو آپ سے ملاقات ہوگی"۔ ہم نے کہا "ملاقات تو خیر ہوگی ہی مگر آپ ہم سے مبارکباد کچھ اس طرح وصول کر رہے ہیں جیسے ایک سود خور پٹھان سود وصول کرتا ہے۔"

اودے پرتاپ سنگھ ہمارے پُرانے دوستوں میں سے ہیں۔ سماج وادی پارٹی کے اہم قائد تو ہیں ہی مگر ہمیں اس لئے پسند ہیں کہ ہندی کے صاحب طرز، منفرد اور البیلے شاعر ہیں۔

انگریزی کے استاد ہونے کے علاوہ اتر پردیش کے ایک کالج کے پرنسپل بھی رہ چکے ہیں۔ ملائم سنگھ یادو بھی ان کے شاگرد رہے ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ کیسی تعلیم دیتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی وہ پارلیمنٹ کے رکن رہ چکے ہیں۔ بے حد محبت کرنے والے، مخلص اور بے ساختہ آدمی ہیں۔ جب سے ہمارے گھٹنوں کا درد پیچیدہ ہوا ہے تب سے ہمارا دل رکھنے کے لئے خود بھی لنگڑا کر چلنے لگے ہیں۔ دوستوں کے دکھ درد میں شریک رہنے کی ایسی کوئی اور مثال آپ کو نہیں ملے گی۔ اودے پرتاپ سنگھ کے بارے میں ہم پھر کبھی تفصیل سے لکھیں گے۔ اس وقت تو ہم ایک اور سابق رکن پارلیمنٹ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جن کی یاد پچھلے چند دنوں سے ہمیں بے ساختہ آرہی ہے۔ ہماری مراد قاضی سلیم سے ہے جو اُردو کے بے حد اہم اور سربرآوردہ شاعر ہیں۔ بیس برس پہلے وہ پارلیمنٹ کے رکن تھے اور اورنگ آباد کی نمائندگی کرنے کا شرف انھیں حاصل رہا ہے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو جب ہمیں قاضی سلیم کی یاد نہ آتی ہو۔ ادھر دس بارہ برسوں سے ہماری پارلیمنٹ میں جو ہنگامے ہمیں دیکھنے کو مل رہے ہیں اور ارکان پارلیمنٹ کے نام پر جو "مخلوق" منظر عام پر آئی ہے، اس کی سرگرمیوں کو دیکھ دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ قاضی سلیم جیسا شریف، مخلص، خوددار، بے نیاز اور قلندر صفت آدمی بھی کبھی ہماری پارلیمنٹ کا رکن رہ چکا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہم بلا وجہ ہی بے حد فعاّل ہوا کرتے تھے اور اس زمانہ میں کتنے ہی ارکان پارلیمنٹ اور وزراء سے ہمارے شخصی مراسم تھے۔ لیکن بعد میں جب ملک کی عملی سیاست کا معیار تیزی سے گرنے لگا تو قاضی سلیم نے سیاست سے اور ہم نے سیاستدانوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

قاضی سلیم ہم سے چھ سات برس سینئر ہیں، لہٰذا عثمانیہ یونیورسٹی میں وہ کبھی ہمارے ہم عصر نہیں رہے۔ یوں بھی گریجویشن کی تکمیل انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے کی اور عثمانیہ یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ اور بات ہے کہ قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے باوجود کبھی وکالت کے پیشہ کو نہیں اپنایا۔ اتنا ضرور ہوا کہ خود کبھی کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔ قاضی سلیم کو ہم نے سب سے پہلے ۵۰ کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں مجرد گاہ کے کمرہ نمبر ۷ اے پر دیکھا تھا جہاں سلیمان اریب کے رسالہ "صبا" کا دفتر تھا۔ ان دنوں وہ جوان تھے اور ہم نوجوان۔ وہ جب بھی اورنگ آباد سے حیدر آباد آتے تو حیدر آباد کے شاعروں اور ادیبوں کی محفل میں نظر آجایا کرتے تھے۔ نہ صرف اپنی جامہ زیبی اور وجاہت کی بنا پر بلکہ اپنی شاعری کے مخصوص

لب ولہجہ کی وجہ سے بھی ان شعراء میں الگ سے پہچانے جاتے تھے۔ اور آج بھی ان کی زندگی بھر کی کمائی ان کی یہی انفرادیت ہے۔ سلیمان اریب، عزیز قیسی، انور معظم، وحید اختر، مغنی تبسم، شاذ تمکنت اور اقبال متین سے ان کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ اُن دنوں ہماری ان سے ویسی بے تکلفی تو نہ تھی تاہم وہ ہمیں دور ہی سے عزیز رکھا کرتے تھے۔ ان سے ہمارے بے تکلفانہ مراسم کی بنیاد اُس وقت پڑی جب وہ ۱۹۸۰ء کے عام انتخابات میں اورنگ آباد کے پارلیمانی حلقہ انتخاب سے کانگریس کے ٹکٹ پر بھاری اکثریت سے منتخب ہو کر دہلی آئے۔ یہ پہلا موقع تھا (بلکہ اب بھی ہے) جب اُردو کا ایک شاعر کسی ایوان زیریں میں راست مقابلے کے ذریعہ داخل ہوا تھا ورنہ اُردو کے شاعر بالعموم براہ ایوان بالا ہی عملی سیاست میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ ہمیں ۱۹۸۰ء کی وہ شام اب بھی یاد ہے جب قاضی سلیم انتخابات میں جیتنے کے بعد پہلی بار دہلی آئے تھے۔ کڑاکے کی سردی کے دن تھے۔ دہلی کے مہارشٹرا سدن میں ہم انھیں مبارکباد دینے گئے تو دیکھا کہ سوٹ میں تو ملبوس ہیں لیکن پاؤں میں چپل پہن رکھی ہے۔ ہم نے کہا" دہلی کی سردی سے یہ مذاق نہ کیجئے۔ سوٹ پہنا ہے تو بوٹ بھی پہنئے"۔ بولے" میں تو عوامی آدمی ہوں۔ ایسے چونچلوں میں نہیں پڑتا"۔ ہم نے کہا" مگر دہلی کی سردیوں میں عوامی آدمی کے لئے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ بھلے ہی وہ اپنی جیب کو گرم نہ رکھے لیکن اپنے پاؤں کو ضرور گرم رکھے"۔ وہ بہت اچھے موڈ میں تھے لہذا ہمارا مشورہ مان لیا۔ بعد میں دہلی میں ان سے کچھ ایسا ربط ضبط بڑھا کہ اگلے پانچ برسوں تک پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں شرکت کے لئے وہ جب بھی دہلی آتے تو ان سے ملے بغیر نہ تو ہمیں چین آتا تھا اور نہ ہی اُنھیں۔ ایک سچے انسان اور اچھے شاعر ہونے کے ناتے وہ عملی سیاست کی مصلحت پسندیوں، ریشہ دوانیوں، سازشوں اور دھاندلیوں سے بالکل ناواقف تھے۔ لہٰذا پارلیمنٹ کی رکنیت کا اپنا پانچ سالہ دور انہوں نے اپنی قلندرانہ شان کے ساتھ گذارا۔ ہر ضرورتمند کی مدد کے لئے ہمیشہ تیار اور ہر پریشان حال کی مشکل کشائی کے لئے ہر دم آمادہ۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ۔ ساؤتھ ایونیو میں ان کے فلیٹ کے دروازے ہمیشہ سب کے لئے کُھلے رہتے تھے بلکہ جب وہ دہلی میں نہیں رہتے تھے تو تب بھی شاموں میں یہ دروازے کھلے ہی رہتے تھے کیونکہ اس فلیٹ کی چابی ہمارے پاس رہتی تھی۔ کبھی کبھار قاضی سلیم اور ہمارے مشترک دوست جیسے وحید اختر، شہریار، شاذ تمکنت وغیرہ دہلی آتے تو ہم سے چابی مانگ کر اس فلیٹ میں فروکش ہو جاتے تھے۔

دن بھر تو قاضی سلیم پارلیمنٹ کے کاموں اور خدمت خلق میں مصروف رہتے تھے لیکن شاموں میں پھر سے شاعر بن جاتے تھے۔ دہلی کے بیشتر شاعر اور ادیب ان کے ہاں آتے اور بڑی خوبصورت محفلیں سجتیں۔ اس وقت تک قاضی سلیم کا ایک ہی شعری مجموعہ ''نجات سے پہلے'' شائع ہوا تھا۔ (بعد میں اگرچہ انہوں نے بہت کچھ کہا لیکن آج تک بھی ان کا دوسرا شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا)۔ ہر شام ان کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے ہمیں نہ صرف ان کا سارا کلام زبانی یاد ہوگیا تھا بلکہ انھیں ہماری داد بھی زبانی یاد ہوگئی تھی۔ انھیں یاد رہتا تھا کہ ان کی کونسی نظم کے کونسے مصرعے پر ہم ''سبحان اللہ'' کہتے ہیں۔ کہاں ''مکرر ارشاد'' کہتے ہیں اور کہاں صرف واہ واہ پر اکتفا کرجاتے ہیں۔ کبھی ہماری داد میں ردوبدل کی صورت پیدا ہو جاتی تو ہنس کر ٹوک دیا کرتے تھے کہ آج تمہاری داد بحر سے خارج کیوں ہو رہی ہے۔ جہاں ''مکرر ارشاد'' کہتے ہو وہاں صرف واہ واہ کہہ کر کیوں خاموش ہوگئے۔ قاضی سلیم کی حسِ مزاح بہت تیز ہے۔ جب وہ کھلے دل کے ساتھ قہقہہ لگاتے ہیں تو ان کا روم روم ہنستا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی آواز ایسی پاٹ دار اور گرجدار ہے کہ اگر وہ اچانک اپنی نظم سنانا شروع کردیں تو لوگ چونک اُٹھیں۔ مرغ کو دیکھئے کہ معمولی جسامت کا پرندہ ہے لیکن جب بانگ دیتا ہے تو میلوں تک اپنی آواز کو پہنچا دیتا ہے۔ یہی حال قاضی سلیم کا بھی ہے۔ یقین ہی نہیں آتا کہ اس دھان پان سی شخصیت میں آواز کا اتنا اسٹاک پوشیدہ ہے۔

قاضی سلیم جہاں بے ساختہ قہقہہ لگانا جانتے ہیں وہیں اپنے غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جانے کی زبردست صلاحیت رکھتے ہیں اور کسی کو اپنے غم کی گہرائی تک آنے نہیں دیتے۔ ان کی شاعری میں جس غم اور کرب کا تخلیقی اظہار ہوا ہے ان کے قارئین کی رسائی بس اسی حد تک ہے۔ اُن کا وہ غم، اُن کی وہ مایوسی اور یاسیت جو تنہائی میں ان کے سارے وجود پر طاری ہو جاتی ہے اس کا سراغ لگانا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ شاید ان کے بس کی بات بھی نہ ہو۔ قاضی سلیم نے اپنے ادبی سفر میں کبھی بھی روش عام پر چلنا گوارا نہیں کیا۔ یک زمانہ میں ترقی پسندی سے متاثر ضرور رہے لیکن بعد میں جدیدیت کے اولین علمبرداروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ یہ اور بات ہے کہ جدید شاعری کرنے کے باوجود کبھی اپنی علامتوں اور اپنے طرزِ اظہار کو گنجلک اور پیچیدہ نہ ہونے دیا۔ قاضی سلیم فطرتاً نہایت بے نیاز آدمی واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے ادب میں اپنے مقام اور مرتبے کی دوڑ میں کبھی شامل نہیں ہوئے۔ لیکن ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ادب کے تدریسی نقادوں

نے اُن کی شاعری کا اس طرح جائزہ نہیں لیا اور اس کی وہ قدر نہ کی جس کی وہ مستحق ہے۔

سنا ہے کہ قاضی سلیم ان دنوں بیمار چل رہے ہیں۔ ان کے دوست بہاری لال اور دیگر احباب کے ذریعہ ان کی صحت کے بارے میں اطلاع ملتی رہتی ہیں۔ قاضی سلیم کے ساتھ گذاری ہوئی سینکڑوں محفلوں کی یاد ہمارے ذہن میں تازہ ہے جن کا ذکر کرنے پر اتر آئیں تو دفتر کھل جائے۔ مگر آج کے پر آشوب دور کے سنگین سیاسی حالات میں کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ کیا ہماری پارلیمنٹ کو کبھی پھر سے قاضی سلیم جیسا بے لوث، بے ریا اور قلندر صفت رکن میسر آسکے گا۔

روزنامہ ''سیاست'' (۲۳ اکتوبر ۲۰۰۲ء)

کچھ ادبی سرقوں کے بارے میں

اُردو کے ممتاز محقق، اسکالر اور دکن کے مایہ ناز سپوت ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (جن کی چالیسویں برسی ابھی حال ہی میں منائی گئی ہے) کے فرزند سید رفیع الدین قادری نے اپنے ایک مراسلے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ ایک مضمون نگار نے ان کے نامی گرامی والد ڈاکٹر زور کے دو مضامین ''مشک محل'' اور '' مکہ مسجد، جس کی بنیاد زہد و تقویٰ پر رکھی گئی'' کا سرقہ کر کے انھیں اپنے نام سے اخبار میں شائع کروایا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ڈاکٹر زور کے یہ مضامین ان کی کتاب ''سیرِ گولکنڈہ'' میں شامل ہیں جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی تھی اور بعد میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ان دنوں چوری چکاری، ڈکیتی اور لوٹ مار وغیرہ کی وارداتوں میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لاکھوں کی مالیت کے زیورات اور قیمتی سامان وغیرہ دن دہاڑے سرقہ ہونے لگا ہے۔ ایسے میں اگر ادبی سرقوں کی وارداتوں میں بھی اضافہ ہونے لگا ہے تو اس میں اتنے تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ادب بھی تو بالآخر سماج کا ہی آئینہ دار ہوتا ہے۔ تاہم مضمون نگار نے ڈاکٹر زور کے مضامین کو اگر جوں کا توں بغیر کسی تبدیلی، تصرف یا تحریف کے اپنے نام سے شائع کرایا ہے تو یہ غلط بات ہے۔ اگرچہ مضمون نگار نے ان مضامین میں کہیں بھی اپنی شخصی مضمون نگاری کے جوہر نہیں دکھائے ہیں تب بھی ہم اُنھیں مضمون نگار لکھ رہے ہیں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ ہمارے بیشتر صاحبانِ اقتدار کو دیکھئے جن کے کردار مشکوک اور جن کی کارستانیاں اظہر من الشمس ہیں لیکن پھر بھی آپ انھیں ''عزت مآب'' کہہ کر ہی مخاطب کرتے

ہیں۔ایمان کی بات یہ ہے کہ اس ادبی سرقہ کو ہم کوئی بڑی واردات تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں کیونکہ مضمون نگار سے صرف دو چھوٹی سی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔مضمون نگار کو چاہئے تھا کہ ان مضامین کے آغاز میں واوین (Inverted Commas) کی سیدھی علامت ("") لگادیتے اور ان کے آخر میں واوین کی الٹی علامت ("") لگادیتے تو معاملہ اپنے آپ ہی رفع دفع ہو جاتا اور اخباری بیان بازی کی نوبت نہ آتی۔یہ پہلی غلطی تھی۔دوسری غلطی جوان سے سرزد ہوئی وہ یہ کہ جہاں انہوں نے ڈاکٹر زور کے دو سالم مضامین کا سرقہ کیا وہیں اگر وہ ان مضامین کے ساتھ ساتھ ان کے نام کا بھی سرقہ کر لیتے یعنی اپنا نام ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ہی رکھ لیتے تو یہ ہنگامہ نہ کھڑا ہوتا۔سرقہ کی واردات میں عموماً گھبراہٹ، عجلت، خوف اور ہراسانی وغیرہ میں ایسی چھوٹی موٹی غلطیاں سرزد ہو جایا کرتی ہیں جو بعد میں بلاوجہ "فاش" بن جاتی ہیں۔اکثر لوگ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہم از راہ تفنن اپنی باتوں کو بڑھا چڑھا کر یا مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اب یہ جو ہم نے ڈاکٹر زور کے مضامین کے سرقہ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے نام کے سرقہ کی تجویز پیش کی ہے تو اس میں سراسر کوئی مبالغہ نہیں ہے۔آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جن دنوں ہم عثمانیہ یونیورسٹی کے آرٹس کالج میں پڑھا کرتے تھے تو ہمارے ایک دوست ہوا کرتے تھے جن کا نام "اسد اللہ خاں غالب" تھا (پتہ نہیں اب کہاں رہتے ہیں)۔ قارئین نوٹ فرمالیں کہ یہ قطعاً مذاق نہیں ہے۔اگر چہ ہمارے اُس زمانہ کے بیشتر ساتھی اب دنیا کے مختلف ملکوں میں بکھر چکے ہیں یا اس دنیا کو ہی چھوڑ کر چلے گئے ہیں، تاہم ہمارے پرانے ہم جماعت منیر احمد صدیقی اب بھی حیدر آباد میں موجود ہیں جن سے اس نام کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ہمارے ان دوست اسد اللہ خاں غالب کے نام کی وجہ سے ہمیشہ گڑبڑ ہو جاتی تھی۔ہم آرٹس کالج کی بزم اُردو کے سکریٹری تھے۔ایک بار موصوف نے بزم اُردو کی ایک محفل میں غزل سنائی جس کا مطلع تھا۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

سامعین نے تو خیر حسبِ استطاعت ہوٹنگ کی لیکن بعد میں جب ہم نے ان سے باز پرس کی تو ہمیں پکڑ کر شعبۂ اُردو کی لائبریری میں لے گئے۔الماری میں سے ایک دیوان کے

سرورق پر شاعر کے نام کی طرف اشارہ کرکے کہا "پڑھو یہ کیا نام ہے؟"۔ہم نے پڑھا "اسداللہ خاں غالب"۔ پھر پوچھا "میرا کیا نام ہے؟"۔ہم نے کہا "اسداللہ خاں غالب"۔اطمینان سے بولے "اتنے بڑے دستاویزی ثبوت کے بعد بھی تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ غزل میری نہیں ہے"۔

یہ بات بڑی پرانی ہے لگ بھگ نصف صدی پہلے کی۔اس واقعہ کے تین برس بعد دہلی میں ہماری ملاقات ایک اور دوست سے ہوئی جن کا نام الطاف حسین حالی ہے جو دہلی ڈیری ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے دفتر میں کام کرتے ہیں اور جن سے ہماری گاہے ماہے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ادب سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہے۔البتہ سنا ہے کہ ان کے والد نہ صرف ادب گزیدہ تھے بلکہ "حالی گزیدہ" بھی تھے۔مولانا الطاف حسین حالی سے ایسی گہری عقیدت رکھتے تھے کہ انھوں نے اپنے بیٹے یعنی ہمارے ان دوست کا نام ہی الطاف حسین حالی رکھ دیا۔دہلی میں دودھ سپلائی کرنے والے دفتر میں کام کرنے کی وجہ سے چونکہ وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے کے قائل ہیں اسی لئے الطاف حسین حالی کے کلام کی ملاوٹ اپنے نام کے ساتھ نہیں کرتے۔کہتے ہیں کہ میرے والد نے اگر الطاف حسین حالی کے نام کا سرقہ کیا تھا تو یہ کیا ضروری ہے کہ میں الطاف حسین حالی کے کلام کا سرقہ کروں۔تاہم انھیں الطاف حسین حالی کی نظم "بیوہ کی مناجات" بہت پسند ہے جسے وہ اکثر بیواؤں کو سنا کر پہلے تو ان سے داد لوٹتے ہیں اور بعد میں موقع پاتے ہی خود بیواؤں کو بھی لوٹ لیتے ہیں۔ایک دن ہم نے ان سے کہا "یار! اگر تمہارے والد کو بربنائے عقیدت الطاف حسین حالی کے نام کا سرقہ کرنا ہی تھا تو اس نام میں تھوڑی سی تحریف ہی کر لیتے۔حالی کے بجائے تمہیں 'بدحالی' پکارتے 'پریشان حالی' یا 'مفلوک الحالی' ہی کہتے۔بولے "بھیا! ایسا نہیں ہے۔میرے والد نے میرے نام میں الطاف حسین حالی کے نام کی تحریف تو کردی ہے"۔ہم نے پوچھا "وہ کیسے؟"۔نظریں نیچی کرکے بولے "میرے نام میں 'مولانا' کا سابقہ نہیں ہے، میں نرا الطاف حسین حالی ہوں۔مولانا الطاف حسین حالی نہیں ہوں"۔ذرا دیکھئے کہ موصوف نے نام کے سرقہ میں بھی کیا بات پیدا کی ہے۔پچیس برس پہلے بہار کے ایک وزیر ہوا کرتے تھے جن کا نام "محمد حسین آزاد" تھا۔ان سے ہماری دوستی تھی۔وہ "آبِ حیات" والے محمد حسین آزاد تو نہیں تھے لیکن "شربتِ روح افزاء" کثرت سے استعمال کرتے تھے۔آپ کہیں گے ہم بات کو طول دے رہے ہیں۔لگے ہاتھوں آپ کی معلومات میں ایک اور اضافہ یہ کردیں کہ

برطانیہ میں ہمارے ایک اور دوست ہیں جن کا نام شیخ ابراہیم ذوق ہے۔اصلی ابراہیم ذوق تو خیر بادشاہِ وقت کے مصاحب تھے۔انگلستان والے شیخ ابراہیم ذوق کو یہ سہولت کہاں سے میسر آتی ،لہٰذا آنجہانی پرنسس ڈائنا کے بے پناہ مداح بن گئے۔

بہر حال ادبی سرقوں کے تعلق سے ہمیں یہ کہنا ہے کہ ادبی سرقے کوئی نئی بات نہیں ہیں۔ادبی سرقہ اگر مہارت، چوکسی اور ہوشیاری کے ساتھ کیا جائے تو اسے سرقہ نہیں بلکہ توارد کہتے ہیں۔توارد میں فنکار کو اصلی مضمون یا خیال میں تھوڑی بہت تبدیلی یا ترمیم کرنی پڑتی ہے۔اسے استفادے کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔یہ نہیں ہونا چاہئے کہ سارا مضمون ہو بہو (فل اسٹاپ اور کاموں کے ساتھ) نقل کر دیا جائے۔یوں بھی ہزاروں برس پرانی دنیا میں آج کوئی ایسی بات نہیں رہ گئی ہے جو پہلے نہ کہی گئی ہو۔دیکھا جائے تو ہمارے پیشرو بھی بڑے اہتمام کے ساتھ پرانی باتیں ہی دوہراتے آئے ہیں مگر نئے انداز کے ساتھ۔اسی کو تو استفادہ کہتے ہیں۔یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ادب اور آرٹ کے میدان میں چراغ سے چراغ جلتا ہے بشرطیکہ چراغ سے چراغ ہی جلے۔یہ نہیں ہونا چاہئے کہ چراغ سے سارے ادب کو ہی جلا کر رکھ دیا جائے۔

اب آپ سے کیا چھپانا کہ اپنی مزاح نگاری کے ابتدائی دنوں میں ہم سے بھی سرقہ کی وارداتیں سرزد ہوئی ہیں لیکن ہم نے یہ کام کچھ ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ لوگوں نے اسے ''توارد'' یا ''استفادہ'' ہی سمجھا سرقہ نہیں سمجھا۔ہاتھ کی صفائی اسی کو تو کہتے ہیں۔ہر آدمی زندگی میں کبھی نہ کبھی سرقہ تو کرتا ہی ہے۔بابائے قوم مہاتما گاندھی نے بھی اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ بچپن میں انہوں نے بھی چوری کی تھی لیکن اس کا انکشاف انہوں نے اُس وقت تک نہیں کیا جب تک کہ وہ بابائے قوم نہیں بن گئے۔اگر وہ بابائے قوم بننے سے پہلے اس کا انکشاف کر دیتے تو ہوسکتا ہے قوم انھیں بابائے قوم نہ بننے دیتی۔سرقہ اگر چالاکی اور چابکدستی کے ساتھ کیا جائے تو سرقہ باقی نہیں رہتا بلکہ آرٹ بن جاتا ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۰ر نومبر ۲۰۰۲ء)

☆☆

ہم ''شقی القلب'' بن گئے

کچھ عرصہ پہلے ہم نے لکھا تھا کہ اُردو اس اعتبار سے نہایت خطرناک زبان ہے کہ کبھی کبھار اس کے استعمال سے آدمی حوالات میں بھی پہنچ جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ مہینے پہلے رام پور کے بعض اُردوداں نوجوان اپنے ایک استاد کے استقبال کے لئے دہلی کے پالم ہوائی اڈے پر گئے تھے۔ ان کے استاد کے باہر نکلنے میں دیر ہونے لگی تو ایک نوجوان نے کہا ''پتہ نہیں کیا مسائل ہیں کہ ان کے باہر نکلنے میں دیر ہوتی چلی جارہی ہے''۔ اس پر دوسرے نوجوان نے کہا ''ہمارے ہاں مسائل کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔ ہمارے پاس تو مسائل ہی مسائل ہیں''۔ برابر میں کھڑے ہوئے شخص نے جب نوجوان کے منہ سے ''مسائل'' کا لفظ سنا تو اس نے سمجھا کہ نوجوان کہنا چاہ رہا ہے کہ اس کے پاس ''میزائل'' کی کوئی کمی نہیں ہے۔ بس اتنی سی بات پر وہاں پولیس آگئی اور نوجوانوں کو چوبیس گھنٹوں تک حوالات میں بند رہنا پڑا۔ بعد میں نوجوانوں کو پتہ چل گیا کہ مسائل کا لفظ کتنی ''سمسیائیں'' پیدا کرسکتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس واقعہ کے بعد ان نوجوانوں نے قسم کھالی ہوگی کہ وہ اُردو زبان کا لفظ ''مسائل'' کبھی اپنی زبان پر نہیں لائیں گے۔ چاہے مسائل کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوجائیں۔ یوں بھی ہمارے ہاں مسائل کا حل اسی طرح توڈھونڈا جاتا ہے۔

ہم نے سوچا تھا کہ اس واقعہ کے بعد عوام النّاس اُردو زبان کے الفاظ کو اپنی زبان پر لانے سے حتی الامکان گریز کریں گے لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوتا جارہا ہے۔ اکثر اصحاب

کو یہ خوش فہمی ہے کہ اُردو مہذب اور شائستہ لوگوں کی زبان ہے۔لہٰذا وہ اپنے آپ کو بھی مہذب ثابت کرنے کی کوشش میں اپنی بات چیت میں اُردو الفاظ کا بے دریغ استعمال کرنے لگے ہیں۔حد ہوگئی کہ اکثر ٹیلی ویژن چینلوں کے سیریلس اور خبروں میں بھی اُردو الفاظ دھڑلے سے استعمال ہونے لگے ہیں۔دھڑلے سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہاں حالات کی جمع ''حالاتوں''، جذبات کی جمع ''جذباتوں'' اوراحساسات کی جمع ''احساساتوں'' بنائی جانے لگی ہے۔ہم نے ایک دن جمع کی جمع بنانے کے اس قاعدے پر اعتراض کیا تو اُردو کے ایک سچے ہمدرد نے ہم سے کہا ''میاں! کیوں اس معاملہ میں اپنا منہ کھولتے ہو۔ان دنوں ملک کی معیشت کا حال یہ ہے کہ لوگ جمع بنانے کا قاعدہ بھولتے جارہے ہیں۔سارے کاروبار تفریق کے قاعدہ پر چل رہے ہیں، تمہارے ہاں آمدنی جمع نہیں ہوتی خرچ ہوجاتی ہے۔بینک سے پیسہ نکالتے ہو مگر جمع نہیں کرپاتے۔ایسے میں اگر ٹیلی ویژن چینل اُردو الفاظ کی جمع کی جمع بنانے لگے ہیں اور حالات کو 'حالاتوں' اور جذبات کو 'جذباتوں' کہنے لگے ہیں تو کہنے دو اس طرح ہمارے معاشرہ میں کہیں تو جمع کا قاعدہ چل رہا ہے۔اسے چلنے دو کیونکہ یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔'' اس پر ہمارے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا ''مگر اس سے میرے احساساتوں کو دھکا پہنچنے لگا ہے''۔

آپ کچھ بھی کہیں ان دنوں بیشتر اصحاب فیشن کے طور پر اُردو الفاظ کا استعمال کرنے لگے ہیں۔ہمارے ایک بنگالی دوست سیسر بنرجی ہیں جو اُردو بہت کم جانتے ہیں۔ایک دن ہم ان کے گھر گئے تو ہمیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے اور اپنے گھر کا دروازہ کھولتے ہوئے بولے ''خدا حافظ خدا حافظ! کیسے آنا ہوا؟''۔ہم نے کہا ''یار! خدا حافظ اُس وقت کہا جاتا ہے جب تم کسی مہمان کو گھر سے رخصت کرنے لگو۔تم نے تو یہاں آتے ہی ہمارے الٹے پاؤں لوٹ جانے کی صورت پیدا کردی''۔بولے ''مجھے کیا معلوم کہ یہ لفظ کب بولا جاتا ہے مگر 'خدا حافظ' مجھے بہت اچھا لگتا ہے اس لئے استعمال کررہا ہوں۔پھر تم میرے ایسے دوست ہو جسے میں چاہے کچھ بھی کہوں وہ واپس نہیں جاسکتا۔اسی بات پر اندر آؤ۔خدا حافظ''۔

آج ہمیں اُردو اور اُردو الفاظ کا خیال اس لئے آ گیا کہ کل ہمیں ایک صاحب کا خط ملا ہے جو ہمیں نہ صرف جانتے ہیں بلکہ اُردو کو بھی جانتے ہیں۔یہ اور بات ہے کہ جتنا ہمیں جانتے ہیں اُردو بھی اتنی ہی جانتے ہیں۔اور آپ تو جانتے ہیں کہ ان دنوں بھلے ہی اُردو بولنے کا چلن عام

ہوا ہو لیکن اسے لکھنے اور پڑھنے کا چلن اتنا عام نہیں رہا۔ یہ صاحب ہمارے مدّاح ہیں اور انھوں نے ہماری تعریف میں جو خط لکھا ہے اس کے چند جملے آپ کی خدمت میں پیش ہیں۔ ''محترمی! آپ کی تحریریں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں جو قابل تعریف ہوتی ہیں۔ آپ ایک بے مثال شقی القلب انسان ہیں اور سماج میں جب کبھی کوئی دلخراش منظر آپ کو دکھائی دیتا ہے تو آپ کا قلب شق ہو جاتا ہے۔ آپ کی یہی شقی القلبی آپ کی تحریروں میں جان پیدا کر دیتی ہے''۔ اس خط کی وجہ سے ہمیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ہم ایک شقی القلب انسان ہیں۔ لیکن اس میں قصور ہمارا نہیں بلکہ ہمارے مدّاح کی اُردو کا ہے۔ ہم نے سوچا کہ بیچارے یہاں اصل میں ''وسیع القلب'' لکھنا چاہتے تھے لیکن ''شقی القلب'' کا لفظ چونکہ انھیں بھاری بھرکم نظر آیا لہٰذا اس کی مدد سے ہمیں سنگسار کرنے کو ضروری سمجھا۔ اس خط کو پڑھ کر ہمیں ایک بھولی بسری یاد آ گئی۔ پاکستان کے مشہور شاعر اور ادیب امجد اسلام امجد نے لاہور میں ہمیں ایک قصہ سنایا تھا کہ ایک بار احمد ندیم قاسمی کے ایک شناسا نے اپنے بیٹے کے کسی کام کے سلسلہ میں احمد ندیم قاسمی سے خواہش کی کہ وہ کسی عہدیدار کو، جسے قاسمی صاحب جانتے تھے، ایک سفارشی خط لکھ دیں۔ قاسمی صاحب نے یہ خط لکھ دیا اور ان کے بیٹے کا کام ہو گیا۔ اس کے جواب میں ان صاحب نے احمد ندیم قاسمی کو شکریہ کا جو لمبا چوڑا خط لکھا اس میں ایک جملہ یہ بھی تھا ''قاسمی صاحب! آپ کی مہربانی، عنایت اور آپ کی ریشہ دوانیوں کی بدولت میرے بیٹے کا کام ہو گیا۔ آپ کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں''۔

قاسمی صاحب تو خیر سمجھ گئے کہ یہاں ان کی ''ریشہ دوانیوں'' سے کیا مراد ہے۔ تاہم قاسمی صاحب کے مخالفین کو کون سمجھاتا جو آئے دن اُن کی ''ریشہ دوانیوں'' کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ اصل میں اُردو والے اس زبان کے شائستہ مزاج کی وجہ سے لفظی جمع خرچ بہت کرتے ہیں۔ قاسمی صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ان کی مہربانی اور عنایت کا ذکر کافی تھا لیکن لکھنے والے کا کلیجہ چونکہ ان دو سیدھے سادے الفاظ کے استعمال کے باوجود ٹھنڈا نہیں ہو پارہا تھا تو وہ احمد ندیم قاسمی کی ''ریشہ دوانیوں'' تک پہنچ گیا۔ جیسے ہمارے مدّاح نے جب تک ہمیں ''شقی القلب'' نہیں بنا دیا تب تک اسے ''قلبی سکون'' حاصل نہیں ہوا۔ یوں بھی اُردو کلچر میں لفظوں کے طوطا مینا بنانے کا چلن عام رہا ہے۔ پچھلے دنوں ہمیں ایک جلسہ میں ایک ممتاز عالم کی تقریر سننے کا موقع ملا تھا جس میں ان کے منہ سے عربی اور فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ یوں گر رہے تھے جیسے

خزاں کے موسم میں پیڑوں سے پتے۔ جلسہ کے بعد موصوف نے اپنی تقریر کے بارے میں ہماری رائے پوچھی تو ہم نے کہا" ہم نے آپ کی تقریر کہاں سنی۔ آپ کی اُردو کو ہی سنتے رہ گئے۔ اب یہ بھی یاد نہیں رہا کہ آپ نے کس موضوع پر تقریر کی کیونکہ آپ کی تقریر میں تقریر کم اور اُردو زیادہ تھی۔ ماشاء اللہ آپ بہت اچھی اُردو بولتے ہیں۔ اللہ کرے زورِ زباں اور زیادہ"۔ ہماری اس تعریف کے جواب میں اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر بولے" یہ سب اوپر والے کا کرم ہے"۔ یہ تو ان صاحب کا ذکر تھا جو زبان پر گہری قدرت رکھنے کے باعث الفاظ کی فضول خرچی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بعض اصحاب ایسے ہوتے ہیں جو اُردو دان تو ہوتے ہیں لیکن بعض الفاظ کے معنی نہیں جاننے کے باوجود انہیں استعمال کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ کچھ برس پہلے کی بات ہے امروہہ میں ایک تقریب ہو رہی تھی جس کی صدارت مولانا اسحاق سنبھلی کو کرنی تھی۔ اسحاق سنبھلی اپنی کسی مصروفیت کی وجہ سے مقررہ وقت پر تقریب میں نہ آسکے تو منتظمین نے کافی انتظار کے بعد ایک کارگذار صدر کو کرسیٔ صدارت پر بٹھا دیا لیکن جیسے ہی کام چلاؤ صدر نے کرسیٔ صدارت سنبھالی مولانا سنبھلی جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ اس پر محفل کے کنوینر نے اعلان کیا "حضرات! شومیٔ قسمت سے مولانا اسحاق سنبھلی تشریف لا چکے ہیں۔ اب وہی اس جلسہ کی صدارت کریں گے"۔ مولانا اسحاق سنبھلی تو سمجھ گئے کہ کنوینر نے غلطی سے "شومیٔ قسمت" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس لفظ کا غلط استعمال قطعاً نہیں ہوا تھا کیونکہ اس کے استعمال کا اصل مقصد کارگذار صدر محفل کی "شومیٔ قسمت" کی طرف اشارہ کرنا تھا۔ اگر مولانا نہ آتے تو بیچارے محفل کی صدارت کر لیتے اور مولانا کے حق میں دعا دیتے۔ ہمیں ایک اور محفل کی یاد آ رہی ہے جس کے مہمان خصوصی ہم ہی تھے۔ کنوینر محفل ہمیں غالباً" آنجناب" کہہ کر مخاطب کرنا چاہتے تھے لیکن صرف" آنجناب" سے چونکہ ان کی تشفی نہیں ہو سکتی تھی تو اُنھوں نے ہمیں" آنجہانی" کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ کسی نے اُنھیں ٹوکا تو بولے" جناب! یہ دنیا آنی جانی اور فانی ہے۔ آج اگر یہ آنجناب ہیں تو کیا ہوا۔ اللہ نے چاہا تو ایک نہ ایک دن 'آنجہانی' بن ہی جائیں گے"۔ یوں ہم نے اس دن جیتے جی اپنے 'آنجہانی' ہونے کا مزہ لوٹا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے برسرِ اقتدار رہنماؤں کو اکثر لوگ "عزت مآب" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ایک رہنما سے جب ان کے اقتدار کی کرسی چھن گئی اور وہ ایک جلسہ کی صدارت کرنے پہنچے تو جلسہ کے کنوینر نے

انھیں بار بار ''سابق عزت مآب'' کہہ کر مخاطب کرنا شروع کردیا۔ ہمارے ایک دوست کے ذہن میں ''طوائف الملوکی'' کا مطلب یہ تھا کہ جب حکمران طوائفوں کے چکر میں پھنس جاتے ہیں اور ان کے اشاروں پر ناچنا شروع کردیتے ہیں تو ملک میں ایک ایسی بدنظمی اورافراتفری پھیل جاتی ہے، جسے ''طوائف الملوکی'' کہا جاتا ہے۔ بہرحال جن صاحب نے ہمیں ''شق القلب'' بنایا ہے یا ایسے اصحاب جو احمد ندیم قاسمی کی ''ریشہ دوانیوں'' کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں اُن سے ہماری گذارش ہے کہ وہ مطلب جانے بغیر بھاری بھرکم اُردو الفاظ کا بے دریغ استعمال نہ کریں کیونکہ اس طرح ہمارے ''جذباتوں'' کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اُردو میں بے شمار سیدھے سادے مگر پُراثر لفظ موجود ہیں جو کسی کے دل کا مطلب آسانی سے ادا کردیتے ہیں۔ اپنی ماں کو ماں کہنے میں جو لطف آتا ہے وہ اسے ''والدۂ معظمہ ومحترمہ'' کہنے میں نہیں آسکتا۔ یوں بھی فضول خرچی اچھی چیز نہیں ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۲۲؍دسمبر ۲۰۰۲ء)

مزاحِ نگار کی بیوی

کچھ عرصہ پہلے ہم نے حیدرآباد میں خواتین اہلِ قلم کے بارے میں ایک بے ضرر سا کالم لکھا تھا، جس میں ہم نے حیدرآباد میں لکھنے والیوں کی بڑھتی ہوئی آبادی پر اپنے انداز میں تبصرہ کیا تھا، بلکہ خیر مقدم کیا تھا۔ اس کے جواب میں ہمارے پاس حیدرآباد کی بعض لکھنے والیوں کے تاثرات بلکہ تعصبات موصول ہوئے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ادبی معاملات میں اس طرح کے تاثرات کو ہم ہمیشہ ہی خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے آئے ہیں، کیونکہ ادب میں جب تک اختلاف کی گنجائش نہیں ہوگی اور مختلف نقاط نظر سامنے نہیں آئیں گے، تب تک ادب اور وہ بھی اُردو ادب بالکل ترقی نہیں کرسکتا۔ ایک خاتون اہلِ قلم نے ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ ہم پر قدامت پرست ہونے کا الزام عائد کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم آزادیٔ نسواں کے قائل نہیں ہیں اور عورتوں پر مردوں کی بالادستی اور فوقیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں (کاتب صاحب! مردوں کے ''م'' پر پیش نہ لگائیں، اگرچہ خاتون افسانہ نگار نے مردوں کو مُردوں ہی لکھا ہے) ان کا کہنا ہے کہ ''ادب مُردوں کی اجارہ داری نہیں ہے۔ اب اگر خواتین ادب کے میدان میں آگے بڑھ رہی ہیں تو آپ کیوں خواہ مخواہ پریشان ہورہے ہیں؟'' نعوذ باللہ! یہ ہم پر سراسر تہمت ہے۔ ہم تو ابتدا ہی سے مردوں اور عورتوں کی مساوات کے قائل ہیں اور ہماری عین خواہش یہ رہی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ چلنا چاہیے۔ اس طرح زندگی کے کسی شعبے میں ترقی ہو یا نہ ہو، شانہ بشانہ چلنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ یوں بھی زندگی میں سفر کی اتنی

اہمیت نہیں ہوتی جتنی کہ ہمسفر کی ہوتی ہے۔آزادیٔ نسواں کو ہم نہایت ضروری سمجھتے ہیں، کیونکہ ہمارے حساب سے آزادیٔ نسواں کا فائدہ عورتوں کے مقابلے میں بالآخر مردوں کو ہی زیادہ پہنچتا ہے۔ہم پر قدامت پرست ہونے کا الزام بھی بے وقت کی راگنی سا لگتا ہے۔ہم عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں نہ صرف قدامت پسندی اور دقیانوسیت بلکہ ترقی پسندی اور روشن خیالی بھی ہمارے حق میں بے معنی سی اصطلاحات بن چکی ہیں۔فقر وفاقہ، استغناو توکل اور دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی یہ وہ منزل ہوتی ہے جہاں آدمی جبلتوں، جذبوں، لذتوں اور محسوسات سے اوپر اُٹھ کر سادھوسنت بن جاتا ہے۔کچھ لوگ اسے عرفان کی منزل بھی کہتے ہیں۔خدارا کم از کم ان حالات میں ہماری تپسیا کو بھنگ نہ کریں اور ہم پر ایسے بے بنیاد الزامات عائد نہ کریں۔آج ہم اصل میں اس کالم کے حوالے سے خود اپنے ہی ایک گھریلو مسئلے کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔ہم نے اپنے کالم میں ایک جگہ اپنی نصف بہتر کے بارے لکھا تھا کہ موصوفہ پڑھی لکھی تو ضرور ہیں، لیکن ان کا لکھنا پڑھنا صرف دھوبی کا حساب کتاب لکھنے یا مہینے بھر کے گھریلو سامان کی فہرست مرتب کرنے تک محدود ہے۔ہمارے دوستوں کے جب ٹیلی فون آتے ہیں اور ہم گھر پر نہیں ہوتے تو وہ ہمارے دوستوں کے نام اور ٹیلی فون نمبر بھی لکھ لیتی ہیں۔یہ اور بات ہے کہ بسا اوقات غلط لکھتی ہیں۔ارے صاحب! اتنی سی بات پر وہ اتنی برہم ہیں کہ ہماری ساری لکھائی پڑھائی کو چولھے میں جھونک دینے پر تُل گئی ہیں۔انھوں نے جو کچھ کہا اسے ہم من وعن یہاں نقل کر رہے ہیں۔

''اگر ایک بار تمہارے کسی دوست کا نام یا ٹیلی فون نمبر غلط لکھ دیا تو ایسی کون سی آفت آگئی۔ادب کو تخلیق کرنے کے نام پر تم جو کچھ لکھتے ہو وہ من گھڑت، فرضی بلکہ سراسر غلط ہوتا ہے۔رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہو۔تین کو تیرہ اور دو کو دو سو بنا دیتے ہو۔دھوبی کا حساب لکھتے ہوئے میں کبھی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتی۔تمہاری دو پھٹی ہوئی بنیانیں دھوبی کو دھونے کے لیے دیتی ہوں تو دو ہی لکھتی ہوں۔تمہاری چار بوسیدہ پتلونوں کو کبھی چالیس نہیں لکھا یا تمہارے چار پاجاموں کو دو نہیں لکھا۔دھوبی کا حساب لکھتے ہوئے اگر میں بھی تمہاری طرح مبالغہ آمیزی سے کام لیتی تو آج تم ننگے ہوتے۔مہینہ بھر کے سامان کی فہرست میں اگر کبھی غلطی سے کوئی چیز زیادہ لکھ دوں تو یہ بیکار تھوڑی جاتی ہے۔اگلے مہینے کام آجاتی ہے۔جیسے ایک بار میں نے ایک کلوگرام نمک لکھنے کے بجائے غلطی سے ایک کے ہندسے کے آگے صفر لگا دیا تھا۔بس اتنی سی غلطی پر تم دس کلوگرام نمک اٹھا کر

لے آئے، مگر یہ ضائع تو نہیں ہوا۔ سال بھر کام آیا اور تم نے اتنی ہی نمک حرامی کی جتنی کہ فی کلوگرام کرتے ہو۔ نہ کم نہ زیادہ۔ تم اپنی تحریروں میں من گھڑت اور مبالغہ آمیز باتیں لکھنے کے لیے ادب کی کسی نہ کسی تحریک یا رجحان کا حوالہ دے کر اپنے لیے اچھا سا جواز پیدا کر لیتے ہو۔ کبھی کہتے ہو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ایسا لکھا ہے، کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ یہ تحریر جدیدیت سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ حد ہوگئی کہ اپنی شخصی کوتاہیوں کا الزام اب مابعد جدیدیت پر بھی عائد کرنے لگے ہو۔ میں نے اپنے گھریلو کام کاج میں کبھی ایسا بہانہ تراشا؟ کبھی تم نے میرے ہاتھ کا بنا ہوا ترقی پسند پلاؤ کھایا؟ کبھی جدید بگھارے بیگن کھائے؟ کبھی مابعد جدید کھچڑی کھائی؟ پینتالیس برس پہلے اپنے میکے سے جو پکوان سیکھ کر آئی تھی اب تک وہی کھلا رہی ہوں اور ماشاء اللہ تم اب تک صحیح وسالم اور زندہ ہو۔''

ہماری بیوی کی شکایت (جسے ہم ڈانٹ کہتے ہیں) آپ نے سن لی۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ محترمہ کا اصل غصہ اس بات پر ہے کہ ہم اپنے مضامین میں اکثر اُن کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس مسئلہ پر پہلے بھی ان سے ہماری اَن بن ہوتی رہی ہے بلکہ یہ تو روز کا معمول ہے، مگر ان کے غصے میں اب جو نیا اُبال آیا ہے اس کا سبب اُردو کی ممتاز افسانہ نگار رضیہ فصیح احمد کا وہ حالیہ مضمون ہے جس میں انھوں نے از راہ شفقت و ہمت افزائی ہماری مزاح نگاری کی تعریف تو بہت کی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا ہے کہ مزاح نگار اپنی بیویوں کا اکثر مذاق اڑاتے ہیں۔ انھوں نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا ہے اسے بھی پڑھ لیجیے۔

''بچاری بیوی کیا کرے گی جو مزاح نگاروں کا نشانہ بنتی رہتی ہے۔ اگر مزاح نگاروں کے تعلقات بیوی سے اچھے بھی ہوں تو غلط فہمی ہوتی ہے کہ اچھے نہیں ہیں اور ایسے مضامین پڑھنے کے بعد بھی اچھے رہیں تو اس میں تعریف بیوی کے ظرف کی ہے نہ کہ میاں کی ظرافت کی۔''

ہم نے اپنی بیوی کو سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ رضیہ فصیح احمد نے اپنی اس رائے میں ہماری ظرافت نگاری کی نہیں بلکہ تمہارے اعلیٰ ظرف کی تعریف کی ہے۔ اس پر تو تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ تم اپنے ظرف کو بڑا بناتی رہو اور ہم اپنی ظرافت میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ مزاح نگار کی بیوی ہونے کا اتنا خطرہ تو تمھیں مول لینا چاہیے۔ انھیں معلوم ہے کہ ہماری گرہستی کا سارا دارومدار ہماری مزاح نگاری پر ہی ہے۔ ہم مزاح نگاری نہ کریں تو دال روٹی کیسے چلے؟۔ میاں بیوی میں

جب تک ذہنی ہم آہنگی اور آپسی تعاون نہ ہو، گھر کیسے چل سکتا ہے۔ شروع شروع میں جب ہماری بیوی کو پتہ چلا تھا کہ ہم اپنے مضامین میں ان کا مذاق اُڑاتے ہیں تو وہ بہت بگڑی تھیں، مگر ہم نے ان سے یہ شریفانہ معاہدہ کرلیا تھا کہ جس مضمون میں بھی ہم اُن کا مذاق اُڑائیں گے تو اس مضمون سے ملنے والے معاوضے کی مناسب رقم بلحاظ مذاق انھیں ادا کردیں گے۔ ایک عرصے تک اس معاہدے پر عمل بھی ہوتا رہا مگر بعد میں ہماری بیوی نے بڑھتی ہوئی مہنگائی کے پس منظر میں معاوضے کی رقم میں بلحاظ مذاق اور بہ تناسب مہنگائی اضافہ کرنے کا مطالبہ شروع کردیا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ جس طرح حکومت اپنے ملازمین کے مہنگائی بھتّے میں وقفہ وقفہ سے اضافہ کرتی رہتی ہے تم بھی میرے مذاق کے بھتّے میں اضافہ کرتے جاؤ۔ یہ مطالبہ ہمارے لیے ناقابل قبول تھا کیونکہ ہم حکومت تو ہیں نہیں کہ کسی اچھے عنوان کے تحت عالمی بینک سے قرضہ حاصل کریں اور اس رقم میں سے چوری چھپے اپنے ملازمین کو بھتّہ ادا کردیں۔ جب مطالبہ نے طول پکڑا اور ہم دونوں کے بیچ مصالحت کی کوئی گنجایش نظر نہیں آنے لگی تو ہم نے تھک ہار کے اپنی بیوی کے آگے یہ مخلصانہ تجویز رکھی کہ وہ ہمیں دوسری شادی کرنے کی اجازت دیں تاکہ ہم اپنے مضامین میں جی کھول کر اپنی دوسری بیوی کا مذاق اڑاتے رہیں اور وہ بحیثیت پہلی بیوی باقی کی زندگی ہمارے ساتھ ہنسی خوشی گزاریں۔ ہماری اس معصوم اور بے ضرر پیش کش کے جواب میں محترمہ نے اپنا مطالبہ واپس لے لیا۔ مگر اس کے بعد سے وہ ہم پر شبہ کرنے لگی ہیں کہ کہیں ہم نے واقعی چوری چھپے دوسری شادی تو نہیں کرلی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تم اپنے مضامین میں جس طرح کی بیوی کا مذاق اڑاتے ہو اور جو باتیں اس سے منسوب کرتے ہو اس سے یوں لگتا ہے جیسے میں تمہاری بیوی نہیں ہوں۔ ہم نے انھیں ٹھنڈے دل سے سمجھایا کہ ان مضامین میں تمہیں جو بیوی نظر آتی ہے وہ تم ہی ہو، بس ذرا زیب داستان کی خاطر کچھ من گھڑت باتیں تم سے منسوب کردیتے ہیں۔ بولیں "تمہارے مضامین میں داستان اتنی چھوٹی اور زیب اتنا بڑا کیوں ہوتا ہے۔؟"

ہماری بیوی کے اس تبصرے کو سن کر ہمیں ہنسی بھی آئی اور رونا بھی۔ رونا اس لیے کہ پیٹ بڑا بدکار ہے۔ آدمی کو جینے کے لئے کیا کیا نہیں کرنا پڑتا۔

روزنامہ "سیاست" (دسمبر ۲۰۰۲ء)

☆☆

صاحبِ ویب سائیٹ اُردو شاعر

پچھلے مہینہ ہم حیدرآباد میں تھے تو وہاں کے اُردو اخبارات میں حیدرآباد کے اُردو شاعروں کے بارے میں ایسی اطلاعات پڑھنے کو ملیں کہ فلاں شاعر کا کلام فلاں ویب سائیٹ پر دستیاب ہے اور اسے دنیا بھر میں گھر بیٹھے دیکھا جاسکتا ہے۔ پہلے تو دو تین شاعروں کے بارے میں یہ اطلاع آئی۔ اس کے بعد ویب سائیٹ یافتہ اُردو شاعروں کے سلسلہ میں خبروں کے جلوس تصویروں کے ساتھ نکلنے لگے۔ شاعروں کی سوانحی تفصیلات کے ساتھ ان کے ادبی کارناموں یا کارستانیوں کا حال تفصیل سے بیان کیا جانے لگا اور آخر میں یہ مژدہ بھی سنایا جانے لگا کہ اب ان کا کلامِ بلاغت نظام ویب سائیٹ پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے شاعروں کے درمیان ویب سائیٹ پر سبقت لے جانے کی ایک دوڑ شروع ہوگئی ہے۔ بعض تو ایسے بھی تھے جن کے شاعر ہونے کا علم ہمیں پہلی بار ایسی ہی اطلاعات کے ذریعہ ہوا۔ ایک دن ایک اُردو شاعر راستہ میں مل گئے تو ہم سے فخریہ انداز میں کہنے لگے ''حضور! اب تک تو میں صرف 'صاحب دیوان شاعر' تھا لیکن اب 'صاحب ویب سائیٹ' بھی بن گیا ہوں''۔

اُردو شاعروں سے ہماری بڑی پرانی راہ ورسم ہے۔ وہ ہمیں عزیز رکھتے ہیں اور ہم انھیں نہ صرف عزیز رکھتے ہیں بلکہ ان سے دلی ہمدردی بھی رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ بنیادی طور پر یہ نہایت معصوم لوگ ہوتے ہیں جو صرف داد پر گذارا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ایک عام آدمی کی بنیادی ضروریات بھلے ہی روٹی، کپڑا اور مکان ہوتی ہوں لیکن اُردو شاعروں کی بنیادی ضروریات

''سبحان اللہ'' ''ماشاء اللہ'' اور ''مکرر ارشاد'' سے آگے نہیں بڑھتیں۔ توکل اور فقر و فاقہ میں زندگی گذارنے کی اس سے بہتر کوئی اور مثال آپ کو نہیں ملے گی۔ اسی لئے جب یہ خوش ہوتے ہیں یا کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں تو ہم ان کی خوشی میں بادھا نہیں ڈالتے کہ یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے۔ آج اُردو کے حالات چاہے جیسے بھی ہوں، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اُردو میں آج تک کوئی چھوٹا شاعر پیدا ہی نہیں ہوا۔ ہمارے ہاں کوئی شاعر اپنی پہلی غزل کا پہلا شعر ہی کہتا ہے تو وہ اچانک بڑا بن جاتا ہے۔ شاعر کے اسی رویہ کی وجہ سے ساری گڑبڑ ہو جاتی ہے اور ہر شاعر اس جستجو میں لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی دوسرا شاعر اس سے بڑا نہ بن جائے۔ اسے ہمارے ہاں ادبی اصطلاح میں ''معاصرانہ چشمک'' کہا جاتا ہے۔ (ہندی کے ایک مشہور ادیب ہمارے دوست ہیں جنھیں جا و بیجا، موقع بے موقع اُردو الفاظ کو استعمال کرنے کا جنون ہے۔ وہ اپنی مخصوص اُردو دانی کی وجہ سے معاصرانہ چشمک کو ہمیشہ ''چشمکانہ معاصرک'' ہی کہتے ہیں)۔ یہ اور بات ہے کہ اپنی بات چیت میں اس اصطلاح کا استعمال صحیح سیاق و سباق کے ساتھ نہایت برمحل اور برموقع انداز میں کرتے ہیں۔ اسی معاصرانہ چشمک یا ''چشمکانہ معاصرک'' کا نتیجہ ہے کہ اُردو کا ہر شاعر اپنی شاعری کے لئے کوئی نہ کوئی صداقت نامہ یا خود اپنے لئے کوئی نہ کوئی اعزاز حاصل کرنے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ برسوں پرانی بات ہے۔ سنا ہے کہ شاہ جہاں پور میں ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہوا کرتے تھے جو ادب کا واجبی سا ذوق رکھتے تھے۔ ایک بار انھیں غلطی سے کسی شاعر کی کوئی غزل پسند آئی اور انہوں نے اس پر اظہارِ پسندیدگی فرمایا تو شاعر موصوف نے ہر محفل میں اس غزل کو یہ کہہ کر سنانا شروع کر دیا کہ یہ وہ غزل ہے جسے شاہ جہاں پور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پسند فرمایا تھا۔ بعد میں حالت یہ ہو گئی تھی کہ اگر کسی محفل میں وہ اس غزل کو نہ سناتے تو لوگ خود اُن سے فرمائش کرتے تھے کہ حضور! وہ شاہ جہاں پور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ والی غزل سنایئے۔ ایسی صورت میں ان کے معاصرین بھلا کب خاموش رہنے والے۔ انہوں نے شاعر موصوف سے اپنی ''معاصرانہ چشمک'' کو جاری رکھنے کا یہ راستہ نکالا کہ اپنے اپنے علاقوں کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو مجبور کرنے لگے کہ وہ بھی ان کی غزلوں کو پسند فرمانے لگیں۔ چنانچہ بیشتر شاعر اپنے اپنے علاقوں کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے حوالہ سے اپنی غزلیں مشاعروں میں سنانے لگے۔ گویا مشاعروں میں شاعروں کی اتنی اہمیت نہیں رہ گئی تھی جتنی کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو حاصل ہو گئی تھی۔

جب یہ معاملہ یکسانیت کی صورت اختیار کرنے لگا تو ایک شاعر کو اپنا اعزاز بلند کرنے کی ایک نئی ترکیب سوجھی۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں غزل سنانے سے پہلے اُس نے اعلان کر دیا کہ یہ غزل اُس کے علاقہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو نہ صرف پسند آئی تھی بلکہ انہوں نے خوش ہو کر خالص گھی سے بنی ہوئی ایک کیلوگرام برفی بھی اس کی خدمت میں پیش کر دی تھی۔ اس کے جواب میں دیگر شعراء بھی قسم قسم کی لذیذ اور مہنگی مٹھائیوں کے تحفوں کے ذریعہ ''معاصرانہ چشمک'' کی اس آگ کو ہوا دینے لگے۔ بعض نے اس معاملہ میں مٹھائیوں کی مقدار میں بھی اضافہ کر دیا۔ گویا ان کی شاعری تو کہیں پس پشت رہ گئی تھی اور مٹھائیوں کا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا تھا۔ اسی لئے تو ہم کہتے ہیں کہ ''معاصرانہ چشمک'' بڑی بُری بلا ہے اور بڑا شاعر بھلے ہی اس میں مبتلا ہو جائے لیکن ایک اچھے اور سچے شاعر کو اس میں مبتلا ہونے سے حتیٰ الامکان گریز کرنا چاہئے۔

شاہ جہاں پور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی یاد ہمیں اس لئے آگئی کہ اُردو شاعروں کے ویب سائیٹ میں محفوظ ہو جانے کی دوڑ بھی کم و بیش اسی نوعیت کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی سخن فہمی کا تعلق پھر بھی ''اُردو کلچر'' سے پیدا کیا جاسکتا ہے کیونکہ بعض عہدیدار بھلے ہی نااہل ہوں لیکن سخن فہم تو ہو سکتے ہیں جب کہ ویب سائیٹ کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ موجودہ دور انفارمیشن ٹکنالوجی کے عروج کا دور ہے۔ آپ اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے دنیا کے کسی بھی گھر میں (جہاں کمپیوٹر ہو) داخل ہو کر اس گھر میں رہنے والوں کے سکون کو درہم برہم کر سکتے ہیں۔ اچھی بُری، ضروری غیر ضروری ساری معلومات کو ویب سائیٹ کے ذریعہ ساری دنیا میں پھیلایا جاسکتا ہے، لیکن ویب سائیٹ کا اُردو کلچر اور خاص طور پر اُردو شاعری سے کوئی تعلق پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ شعر خوانی اُسی وقت بھلی معلوم ہوتی ہے جب خود شاعر کو یہ پتہ چلے کہ سننے والے پر اس کے کلام کا کیا اثر ہو رہا ہے۔ شاعر کو اُس وقت تک سکونِ قلب حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ سننے والا اس کے کلام پر سبحان اللہ، ماشاء اللہ، جزاک اللہ، بہت خوب بلکہ مکرر ارشاد تک کی تحسین آمیز صدائیں بلند نہ کرے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس تحسین کے جواب میں شاعر دوہرا ہو ہو کر سلام عرض کرتا چلا جائے اور سامع کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر مزید داد کا طلبگار ہو۔ افسوس کہ ویب سائیٹ پر یہ سارا ڈرامہ نہیں ہو سکتا۔ نہ داد دی جاسکتی ہے اور نہ ہی ہوٹنگ کی جاسکتی ہے۔ ویب سائیٹ پر کسی شاعر کا کلام پڑھنے والا اپنی داد کے ذریعہ ویب سائیٹ کے اندر

یا باہر کوئی سماں نہیں باندھ سکتا۔ ویب سائیٹ پر کسی کے کلام سے لطف اندوز ہونا ایسا ہی ہے جیسے 'جنگل میں مورناچا کس نے دیکھا'۔ بھلا بتایئے ویب سائیٹ کا اُردو کلچر سے کس طرح تعلق پیدا کیا جاسکتا ہے۔

سچ بات تو یہ ہے کہ ہم اس موضوع پر کوئی اظہار خیال نہیں کرنا چاہتے تھے کیوں کہ اُردو شاعروں کی ''معاصرانہ چشمکوں'' سے ہم خوب واقف ہیں بلکہ یہ تو ہمارے روزمرہ میں شامل ہیں۔ اس کالم کو لکھنے کی ضرورت ہمیں اس لئے پیش آئی کہ پچھلے دنوں ''سیاست'' کے ایک شمارے میں ایک مراسلہ ہماری نظر سے گذرا تھا جس کا عنوان تھا ''ویب سائیٹ پر شعراء کا کلام اعزاز نہیں''۔ اس مراسلہ کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ مراسلہ نگار نے قدیم آصفیہ لائبریری کے دفتر میں جا کر اس معاملہ کی خاصی چھان بین کی تو اُنھیں معلوم ہوا کہ شعراء حضرات کو ایک رسمی سا خط اس خصوص میں لائبریری کی طرف سے روانہ کیا گیا تھا کہ کیا وہ اپنا کلام ویب سائیٹ پر دکھانے کی اجازت دیں گے؟۔ یہ ایک بے ضرر سا رسمی خط تھا جس کے ملتے ہی شاعروں نے اخباروں میں آسمان سر پر اٹھالیا۔ مراسلہ نگار نے لکھا ہے کہ اُردو شاعروں نے اس ضمن میں جس طرح اخباروں میں خبریں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ویب سائیٹ پر ان کے کلام کی نمائش ان کے لئے ایک اعلیٰ ترین اعزاز ہے جب کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ انفارمیشن ٹکنالوجی کے موجودہ دور میں معلومات فراہم کرنے کا یہ ایک عام اور سادہ سا طریقہ ہے۔ ویب سائیٹ پر کلام کو دکھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا کے سارے لوگ اپنے ضروری کام چھوڑ کر ان کے کلام کے مطالعہ میں غرق ہو جائیں گے۔ مراسلہ نگار موصوف کے اس مراسلے کو پڑھ کر ہمیں احساس ہوا کہ خود موصوف کی نیت اس معاملہ میں اچھی نہیں ہے۔ انھیں کیا پڑی تھی کہ اپنے سارے کام چھوڑ کر اس معاملہ کی تحقیق کرنے کے لئے آصفیہ لائبریری چلے جائیں اور چھان بین کر کے اس نتیجہ پر پہنچیں کہ یہ ایک رسمی اور معمولی سی بات ہے۔ ہمیں تو کسی چھان بین، دوڑ دھوپ، تحقیق اور جستجو کے بغیر ہی اس حقیقت کا علم ہو گیا تھا اسی لئے خاموش رہے۔ آدمی کو ایسے کاموں میں اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کرنا چاہئے۔ اُردو شاعروں کی بات دوسری ہے۔ ان کا تو سارا وقت ایسے ہی کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ اگر وہ ڈھنگ کا کوئی کام کرنے کے اہل ہوتے تو شاعری ہی کیوں کرتے۔ کوئی شریفانہ پیشہ اختیار نہ کر لیتے؟۔ یہ بڑے معصوم لوگ ہوتے ہیں۔ کسی

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی داد پر بھی بھروسہ کر لیتے ہیں۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

اُردو شاعر اگر ایسی باتوں سے خوش ہو لیتے ہیں تو مراسلہ نگار کو کیوں تکلیف ہو رہی ہے۔ سارا کالم لکھ دینے کے بعد اب ہمیں مراسلہ نگار سے یہ پوچھنے کا اچانک خیال آیا ہے کہ حضور کہیں آپ خود تو شاعر نہیں ہیں اور کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کو لائبریری کی طرف سے یہ رسمی خط نہ ملا ہو؟۔ اگر ایسا ہے تو سمجھئے کہ ہماری بھی محنت اکارت گئی۔

روزنامہ ''سیاست'' (جنوری ۲۰۰۳ء)

ایک خط حمایت اللہ کے نام

حمایت بھائی! جئے زندہ دلان حیدر آباد

آپ کو شاید یاد ہو کہ اس سے پہلے میں نے اس کالم میں مرزا غالبؔ، خواجہ حسنؔ نظامی اور صندل کے مایہ ناز، منفرد اور صاحب طرز اسمگلر ویرپنؔ کے نام خطوط لکھے تھے اور اب آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ گویا

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

مگر آپ کے نام اس خط کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔ اس لئے کہ پہلے جن اصحاب کے نام خط لکھے گئے تھے انہوں نے ان خطوں کو بالکل نہیں پڑھا بلکہ یہ لکھے ہی اس لئے گئے تھے کہ ایرے غیرے تو ان خطوں کو ضرور پڑھیں مگر مکتوب الیہ انہیں نہ پڑھے۔ آپ کے نام اس خط کی خصوصیت یہ ہوگی کہ آپ پہلے مکتوب الیہ ہونگے جنہیں ہمارے کھلے خط کو پڑھنے کا شرف حاصل ہوگا۔ اس لئے کہ شاعر ہونے کے باوجود آپ ایک پڑھے لکھے انسان بھی ہیں۔ کل حیدر آباد سے محمد تقی کا فون آیا تو معلوم ہوا کہ بالآخر آپ کے دکنی کلام کے پہلے مجموعہ ''دھن مڑی'' کی رسم اجراء ۱۴ رجون کو حیدر آباد میں مقرر رہے۔ اس اطلاع نے میرے دل مغموم کو باغ باغ کر دیا۔ ہم گھر میں ہیں اور بیاباں میں بہار آئی ہے والا معاملہ ہے۔ ماشاء اللہ اس کتاب کو چھپے ہوئے بھی ڈیڑھ برس کا عرصہ بیت گیا۔ آپ کسی قیمت پر اس کتاب کی رسم اجراء کی تقریب منعقد کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس اعتبار سے اُردو ادب کی یہ پہلی کتاب ہوگی جس کی رسم اجراء اس کی اصل اشاعت

کے ڈیڑھ برس بعد منعقد ہو رہی ہے حالانکہ بیشتر صاحبانِ کتب پہلے رسم اجراء کی تاریخ مقرر کرتے ہیں اور بعد میں کتابیں چھپواتے ہیں۔ میں اس عرصہ میں تین مرتبہ اس اُمید کے ساتھ حیدرآباد آیا کہ شاید آپ دیرینہ اور دوستانہ مراسم کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھ سے اس کتاب کی رسم اجراء انجام دینے یا اس تقریب کا صدر یا مہمان خصوصی وغیرہ بننے کی عاجزانہ درخواست کریں گے اور میں تھوڑے سے رسمی ٹال مٹول کے بعد آپ کی مودبانہ درخواست کو شرف قبولیت بخشوں گا اور یوں آپ کو میرا ممنون و مشکور ہونے کا نادر موقع بھی عطا کرونگا۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ آپ نے ہر بار یہ کہہ کر مجھے ٹال دیا کہ میں اپنی ہی کتاب کی رسم اجراء کے لئے خود ہی کس طرح ایک تقریب آراستہ کرسکتا ہوں۔ فنکار کی بھی ایک انا ہوتی ہے۔ اس پر میں نے آپ سے کہا تھا ''بے شک ایک زمانہ میں فنکار کی انا ہوتی تھی لیکن اَب نہیں ہوتی۔ آپ بھی کیسی دقیانوسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ آئے دن شاعر اور ادیب کس ذوق و شوق اور لگن کے ساتھ بلکہ بسا اوقات مقروض ہو کر خود اپنی کتابیں چھپواتے ہیں اور رسم اجراء کے عالیشان جلسے منعقد کرواتے ہیں تا کہ بھری محفل میں ان کے احباب ان کے منہ پر اُن کی تعریف کریں اور خود وہ اس تعریف کو کچھ ایسی بے نیازی کے ساتھ سنیں جیسے یہ تعریف اُن کی نہیں کسی اور کی ہو رہی ہو۔ دیکھا جائے تو رسم اجراء کے جلسوں کا ہر کردار، اداکاری کے فن کا ماہر ہوتا ہے۔ یہ کئی برس پرانی بات ہے جب رسم اجراء کے جلسوں کی وباء ابھی اتنی عام نہیں ہوئی تھی۔ حیدرآباد کے بزرگ مگر سادہ لوح شاعر ابوالخیر صہباؔ نے دوستوں کے بے حد اصرار پر اپنا مجموعہ کلام ''جامِ صہبا'' کے عنوان سے شائع کرایا تھا۔ پھر دوستوں کے ہی اصرار پر انہوں نے ''جامِ صہبا'' کے اجراء کی ایک تقریب اُردو ہال میں منعقد کی تھی۔ صہبا صاحب میرے پڑوسی تھے۔ رسم اجراء کے دن بھری دوپہر میں وہ ایک رکشا میں بیٹھے میرے گھر کے سامنے سے گزرے تو دیکھا کہ رکشا میں ایک بھاری بنڈل بھی ہے جسے لنگی میں باندھا گیا تھا۔ علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا ''صہباؔ صاحب! اس چلچلاتی دھوپ میں آپ لنگی میں کیا باندھ کر لے جا رہے ہیں؟''۔ بڑی معصومیت سے بولے ''میاں! لنگی میں جامِ صہبا ہے۔'' ان کے اس بلاغت اور بلوغت سے لبریز جواب کو سن کر میں ہنسنے لگا تو مزید معصومیت کے ساتھ بولے ''میاں! تمہیں تو ہمیشہ ہنسنے کی عادت پڑگئی ہے۔ تمہیں غالباً یقین نہیں آرہا ہے کہ لنگی میں جامِ صہبا موجود ہے۔ کھول کر دکھاؤں؟''۔ قبل اس کے کہ وہ

بنڈل کی لنگی کھول کر مجھے جامِ صہبا کا دیدار کراتے میں نے خود اپنے گھر کا دروازہ بند کرلیا۔ حمایت بھائی! کتاب کی رسم اجراء کا اہتمام کرو تو ایسی باتیں تو ہوتی ہی ہیں۔''

میری طویل بات کو سن کر آپ نے کہا'' کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی اپنی ''دھن مڑی'' کو لنگی میں باندھ لوں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میری زندگی کھلی کتاب کی طرح ہے اور میں اپنی کتاب زندگی کو چھپانے کا قائل نہیں ہوں۔'' آپ سے مایوس ہونے کے بعد ایک دن میں نے ڈاکٹر رشید موسوی سے کہا'' ڈاکٹر صاحب! جب حمایت بھائی کی 'دھن مڑی' چھپ گئی ہے تو اس کی رسم اجراء کیوں نہیں ہو رہی ہے تاکہ ہمیں بھی مہمان خصوصی وغیرہ بننے کا اعزاز حاصل ہو۔'' ڈاکٹر رشید موسوی نے کہا'' تم بھی کیا ذکر لے کر بیٹھ گئے۔ ان کی کتاب کن مشکل مرحلوں سے گزر کر چھپی ہے تمہیں کیا معلوم''۔ یہ کہہ کر وہ اپنے اسٹڈی روم سے محبوب علی پاشا کے زمانہ کا ایک بھاری بھرکم چوبی قلمدان اٹھا کر لے آئیں۔ پوچھا'' تم نے حمایت کے مجموعۂ کلام کا اصل مسودہ یا مخطوطہ کبھی دیکھا ہے۔ نہیں دیکھا تو اب دیکھ لو''۔ یہ کہہ کر انہوں نے قلم دان کا ڈھکن کھولا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو انواع واقسام کے بوسیدہ کاغذوں، سگریٹ کی ڈبیوں کے مُڑے تڑے پرزوں، مختلف ہوٹلوں کے نیپکنوں، ٹرین کے استعمال شدہ ٹکٹوں، سڑکوں پر تقسیم ہونے والے اشتہاروں اور دس دس روپیوں کی مالیت کے دو تین کرنسی نوٹوں کے علاوہ ہر رنگ ونسل کے پرزے نظر آئے۔ بولیں۔'' تمہیں تعجب ہوگا کہ میں نے ان پلندوں میں سے حمایت کی دھن مڑی نکالی ہے۔ حمایت نے کبھی اچھے کاغذ پر اپنا کلام نہیں لکھا۔ جب بھی اچانک کوئی شعر ہوگیا تو جو بھی کاغذ موقع واردات پر انہیں مل گیا اُسی پر لکھ لیا۔ پچھلے تیس برسوں میں ان پلندوں کو میں نے سینت سینت کے جمع کیا ہے۔ حمایت نے کبھی اپنے کلام کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں نے کتنی مشکل سے ان کے کلام کو کتابی شکل دی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان کے قیمتی کلام کا کچھ حصہ غلطی سے دودھ والے اور اخبار والے کے حوالے ہوگیا''۔ میں نے حیرت سے پوچھا'' وہ کیسے؟''۔ بولیں'' دودھ والا ایک بار مہینہ بھر کا بل مانگنے آیا تو میں نے غفلت میں حمایت کے پرس میں سے دس دس روپئے کے نوٹ نکال کر دیدیئے۔ بعد میں حمایت نے بتایا کہ ان میں سے چار کرنسی نوٹوں پر ان کی ایک تازہ اور غیر مطبوعہ نظم لکھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے میں نے یہ معمول بنا لیا ہے کہ ان کے گھر آتے ہی میں ان کے پرس پر قبضہ کرلیتی ہوں (خیر ایسا کرنا تو بیویوں کا

پیدائشی حق ہے)۔ایک بار تو حد ہوگئی کہ حمایت صبح صبح ڈائیننگ ہال میں سے غصہ کے عالم میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکلے۔ میں نے غصہ کا سبب پوچھا تو بولے ''کل رات آندھی کی وجہ سے ڈائیننگ ٹیبل پر گرد جم گئی تھی اور میں نے اپنی اُنگلی کی مدد سے بطور یادداشت اپنی ایک فی البدیہہ رباعی ڈائننگ ٹیبل پر لکھ دی تھی۔سوچا تھا کہ صبح اُٹھ کر اسے گولکنڈہ سگریٹ کی ڈبیا پر نقل کرلوں گا۔ اب جاکر دیکھا تو تمہاری نوکرانی نے ڈائننگ ٹیبل کی صفائی اور میری شاعری کا صفایا کردیا ہے۔ اس گھر میں میری شاعری کی قدر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔یوں بھی جس گھر میں صفائی کا اتنا خیال رکھا جاتا ہو وہاں کیا خاک شاعری کی جاسکتی ہے''۔

حمایت بھائی !ڈاکٹر رشید موسوی سے بات چیت کرنے کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ آپ سچ مچ اپنے کلام سے بے نیاز اور اس کی اہمیت سے ناواقف ہیں۔تبھی تو ۷۳ برس کی عمر میں آپ کا پہلا مجموعہ کلام ،اور وہ بھی اتنا مختصر،شائع ہورہا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ نے کبھی اپنے مجموعہ کلام میں مقطع کی گنجائش نہیں رکھی حالانکہ شاعری میں مقطع ہوتا ہی اس لئے ہے کہ شاعر اس میں اپنے نام یا تخلص کے حوالے سے نادانی بلکہ بیوقوفوں کی سی باتیں کرے اور ان پر نازاں وفرحاں بھی ہو۔جب کہ آپ کا معاملہ دوسرا ہے۔آپ نے اپنے کلام میں ہمیشہ عقلمندی اور دانشمندی کی باتیں کیں اور ان پر نازاں ہونے کے بجائے سدا شرمندہ اور محجوب ہی رہے۔

حمایت بھائی! مجھے یاد ہے کہ میں نے ۱۹۵۳ء میں پہلے پہل آپ کو حیدرآباد میں دیکھا تھا۔تہذیبی پروگراموں میں، محفلوں میں، جلسوں میں اور جلوسوں میں۔جن دنوں سیاسی قائدین سیاسی سطح پر لوگوں کو رُلانے میں مصروف تھے تو اُن دنوں آپ اور آپ کے شوخ، چونچال اور کھلنڈرے ساتھی تہذیبی اور سماجی سطح پر لوگوں میں ہنسی کی دولت کو تقسیم کررہے تھے۔ اس پُر آشوب دور میں جب کہ لوگ ہنسی کو بھولتے جارہے تھے آپ نے حیدرآبادی مزاح کی بازیافت کی تھی۔

آپ کی اور میری دوستی کی عمر اب ماشاء اللہ پچاس برس کی ہوگئی ہے۔پل دو پل کی بات نہیں یہ نصف صدی کا قصہ ہے۔آپ نے اداکاری ،ممکری ،گلوکاری اور شاعری کے ذریعہ حیدرآباد میں طنز ومزاح کا ایک چوکھا طوفان بپا کیا۔سینکڑوں نوجوان فنکاروں اور شاعروں کی ہمت افزائی کی۔محفلیں آراستہ کیں،ڈرامے اسٹیج کئے،مشاعرے منعقد کئے اور حیدرآبادی مزاح کو پھر سے پٹڑی پر لا کھڑا کیا۔آپ نے برسوں پہلے حیدرآباد میں جو قہقہے لگائے تھے وہ قہقہے اب نہ

صرف صاحبِ اولاد ہو چکے ہیں بلکہ ان کے پوتے پوتیاں، پڑنواسے اور پڑنواسیاں وغیرہ تک پیدا ہو چکی ہیں۔ جس طرح بات میں سے بات نکلتی ہے اسی طرح ہنسی میں سے بھی ہنسی ہی نکل آتی ہے۔ یہ ایک مسلسل اور متعدی فعل ہے اور ہنسی کا سفر تاریخ کے دھارے میں اسی طرح جاری رہتا ہے۔ مجھے وہ دن اکثر یاد آتے ہیں جب معظم جاہی مارکیٹ، عابد روڈ اور کمرہ نمبر ۲۷ وغیرہ پر ہم لوگوں نے مل کر جوان وتوانا قہقہے لگائے تھے۔ مجھے یہ قہقہے یاد تو آتے ہیں لیکن یہ یاد نہیں آتا کہ ہم نے کن باتوں پر یہ قہقہے لگائے تھے۔ دوسری بات یہ کہ اب میں ان قہقہوں کی شدت اور کیفیت کو اپنے اندر محسوس نہیں کر سکتا۔ افسوس کہ جو لمحہ گزر جاتا ہے اُسے آدمی پھر سے جی نہیں سکتا۔ کبھی کبھی مجھے اپنا ہی ماضی کسی اجنبی کے ماضی کی طرح لگتا ہے۔ یوں بھی روز طلوع ہونے والا سورج اُس دن کے قہقہے اور اُس دن کے آنسو اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ یہ تو دن گزارنے والے کی توفیق اور استطاعت پر منحصر ہے کہ وہ کتنے قہقہے لگاتا ہے اور کتنے آنسو بہاتا ہے۔

حمایت بھائی! میں آپ کو حیدر آبادی مزاح کی سب سے روشن علامت سمجھتا ہوں۔ میں آخر میں اس المیہ کا ذکر کرنا چاہوں گا جو اتفاق سے میرا بھی مقدر ہے اور آپ کا بھی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ مزاح نگار سورج مکھی کے پھول کی طرح ہوتا ہے جسے مجبوراً اپنا چہرہ روشنی کی طرف رکھنا پڑتا ہے۔ لوگ یہ تو جانتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ سورج مکھی کا پھول جب سورج کے ساتھ ساتھ اپنا چہرہ مشرق سے مغرب کی طرف گھمالیتا ہے اور ایسے میں اچانک سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر مغرب میں غروب ہو جاتا ہے تو بیچارا پھول گھپ اندھیرے میں ساری رات کیسے گزارتا ہے اور وہ کس طرح اس اندھیرے میں محض اپنے بل بوتے پر اپنا چہرہ دوسرے دن کے سورج کے استقبال کے لئے پھر سے گھما کر مشرق کی طرف لے آتا ہے۔ مزاح نگار کا معاملہ بھی یہی ہے۔ میں نے بہت پہلے لکھا تھا کہ ظرافت نگاری کے لئے آدمی کا ظریف ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہونا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں، میں بھی جانتا ہوں اور سورج مکھی کا پھول بھی جانتا ہے کہ ہمیں باظرف بنے رہنے کی کتنی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۵/جون ۲۰۰۳ء)

☆☆

ایک خراجِ عقیدت

۱۴ر جون کو حیدرآباد کے نمائش کلب میں حمایت اللہ کے مجموعۂ کلام "دھن مڑی" کے اجراء کی تقریب جاری تھی۔ اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے میں نے حمایت اللہ کے بے شمار پرستاروں کے جم غفیر کو دیکھا تو ایک عرصہ بعد دل خوشی سے کھل اٹھا۔ میں نے سوچا کہ حیدرآباد کا ادبی ماحول اب بھی توانا اور فعّال ہے اور وہ اب بھی اپنے فنکاروں کو ٹوٹ کر چاہنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اجرا کی تقریب کے پہلے حصّہ کے اختتام پر میں خوشی خوشی ڈائس سے نیچے اُترا تو حسن الدین احمد صاحب نے آگے بڑھ کر مجھے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ ابھی کچھ دیر پہلے شکاگو میں ہاشم علی اختر کا انتقال ہوگیا۔ اس خبر نے مجھے پر سکتہ سا طاری کردیا۔ قدرت کی ستم ظریفی اور اپنی قسمت پر افسوس بھی ہوا کہ اب زندگی میں خوش ہونے کے مواقع دن بہ دن محدود ہوتے جارہے ہیں۔ خوشی کے چند لمحات میسر بھی آتے ہیں تو ان پر اچانک غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں ایک بھرپور اور توانا حیدرآباد کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحہ مجھے یہ اطلاع ملی کہ حیدرآباد سے ہزاروں میل دور شکاگو میں حیدرآباد کے ایک ایسے مایہ ناز سپوت نے دم توڑ دیا جو نہ صرف حیدرآبادی تہذیب اور روایات کا امین تھا بلکہ جس نے حیدرآبادی تہذیب کی تشکیل و تعمیر میں بھی بھرپور حصّہ لیا تھا۔ ان کے بارے میں ایک ضخیم کتاب کی اشاعت کا کام پچھلے چند مہینوں سے ادارہ ادبیات اُردو میں چل رہا ہے اور قدیر زماں اس کام کے نگران ہیں۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ میں حمایت اللہ کے جلسہ میں جانے لگا تو قدیر زماں بھی میرے ساتھ تھے۔ برسبیل تذکرہ میں نے اس کتاب کے بارے

میں ان سے پوچھا تو کہنے لگے ''ابھی پچھلے ہفتہ ہاشم علی صاحب نے کتاب کے آخری پروف دیکھ کر روانہ کر دیئے ہیں۔ وہ کام کے معاملہ میں بڑے Perfectionist ہیں۔ جب تک خود مطمئن نہ ہو جائیں کام کو آگے بڑھانے کی اجازت نہیں دیتے۔ اسی لئے کتاب کے بعض پروفس کو کئی بار ان کی خدمت میں روانہ کرنا پڑا۔ مگر اب ہر چیز مکمل ہو گئی ہے۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''چاہے کچھ بھی ہو اب اس کتاب کی چھپائی فوراً ہو جانی چاہئے تا کہ یہ ہاشم علی صاحب کی زندگی میں ہی شائع ہو جائے۔'' افسوس کہ جس وقت میں یہ باتیں حیدرآباد میں کر رہا تھا عین اسی وقت شکاگو میں ہاشم علی اختر اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ ۱۴ رجون کو ہی صبح میں ''سیاست'' کے دفتر پر اقبال متین سے ملاقات ہوئی تو میں نے اُن سے اُن کی اس کتاب کے بارے میں پوچھا تھا جو انہوں نے ہاشم علی اختر کے بارے میں لکھی ہے۔

مجھے اس وقت جون ۲۰۰۰ء کی وہ شام یاد آ رہی ہے جب شکاگو کے نیپیر ویل علاقہ میں اُن کے داماد کے گھر پر اُن سے میری ملاقات ہوئی تھی جسے اب آخری ملاقات کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ میں اپریل میں امریکہ پہنچا تھا تو انھیں کسی گھریلو تقریب میں شرکت کی خاطر اچانک حیدرآباد جانا پڑ گیا تھا۔ ان کا یہ دورۂ حیدرآباد بھی ان کا آخری دورہ ثابت ہوا۔ حیدرآباد سے ان کی واپسی پر ہی مجھے اُن سے امریکہ میں ملنے کا موقع ملا۔ اُنھیں چلنے میں سخت تکلیف رہتی تھی۔ چھڑی کی مدد سے چلتے تھے لیکن ذہنی طور پر نہایت چاق و چوبند تھے۔ ان کا حافظہ غضب کا تھا۔ ان کے معمولات بھی مقرر تھے۔ انہوں نے بڑی محبت سے مجھے اپنا وہ کمرہ بھی دکھایا تھا جس میں بیٹھ کر وہ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ بڑی دیر تک حیدرآباد کے بارے میں ڈھیر ساری باتیں کیں۔ وہ امریکی طرز زندگی کے مدّاح اور معترف تھے۔ وہاں کی صفائی، وہاں کا ڈسپلن، وہاں کی آسائشیں، طبی سہولتیں اور وہاں کی حیرت انگیز ترقی سب کا تفصیل سے ذکر کرتے رہے، ہر بار اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے کہ ہمارے اپنے ملک کو ترقی کی اس سطح پر آنے میں نہ جانے کتنا عرصہ لگ جائے گا۔ انھیں ہر لمحہ حیدرآباد کی یاد تڑپا دیتی تھی۔ کافی دیر کے بعد جب میں نے جانے کی اجازت چاہی تو اُنہوں نے بے ساختہ میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا ''تمہیں اتنا جلدی جانے کی اجازت دینے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔ کچھ دیر اور بیٹھو''۔ وہ بدستور میرا ہاتھ تھامے رہے۔ اس وقت ان کے اندر جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس کا میں اندازہ کر سکتا تھا۔ بولے'' بچے یہاں میرا بڑا

خیال رکھتے ہیں، کسی بات کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ پھر بھی اگر میری اہلیہ دنیا سے رخصت نہ ہوئی ہوتیں تو میں حیدرآباد کو چھوڑ کر یہاں نہ آتا''۔

ہاشم علی اختر نے مجھے ہمیشہ اپنی بے پناہ محبتوں سے نوازا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں وہ میرے بزرگوں عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر کے ساتھیوں میں سے تھے۔ اسی لئے میں ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے دورِ عروج کی پیداوار تھے۔ سچ کے برملا اظہار میں وہ کبھی مصلحت سے کام نہیں لیتے تھے۔ ان کی رائے دوٹوک اور بے لاگ ہوا کرتی تھی اسی لئے بعض اصحاب اُن سے اختلاف بھی کرتے تھے اور اُن سے خائف بھی رہا کرتے تھے۔ حکومت کے نہایت اہم عہدوں پر وہ فائز رہے لیکن کبھی اپنے عہدہ کا ناجائز استعمال نہیں کیا بلکہ اپنے عہدہ کے ذریعہ سینکڑوں ضرورت مندوں کو فیض پہنچایا۔ میں نے اپنے کئی دوستوں کے کاموں کے سلسلہ میں حسبِ عادت اُن سے سفارش کی اور انہوں نے حتی الامکان ان سب کی مدد کی۔ تاہم ایک سفارش کا مجھے زندگی بھر قلق رہے گا۔ جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے تو علی گڑھ کے کئی احباب میرے اطراف منڈلانے لگے۔ تاہم شہریار نے مجھے خبردار کردیا تھا کہ علی گڑھ، حیدرآباد نہیں ہے لہذا اپنی سفارشوں کو لگام دے رکھو تو اچھا ہے۔ میں نے حتی الامکان احتیاط بھی کی۔ تاہم علی گڑھ کے ایک استاد کو میں شخصی طور پر جانتا تھا جنہوں نے برسوں سے علی گڑھ یونیورسٹی سے چھٹی لے رکھی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ خدمت پر رجوع ہوئے بغیر انھیں ترقی مل جائے۔ میں نے نیک نیتی میں ان کی سفارش کردی اور ہاشم علی اختر نے یہ کام کردیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس طرح کے کئی اور استاد لمبی چھٹی پر ہیں اور ترقی کے طلبگار ہیں۔ اس نظیر کو سامنے رکھ کر ہاشم علی اختر کو ایسے اساتذہ کو بھی ترقی سے نوازنا پڑا۔

ایک دن شہریار نے مجھ سے کہا کہ تم نے ہاشم علی صاحب سے ایک غلط کام کروادیا۔ بہرحال جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ بعد میں یونیورسٹی کی سیاست میں ایک ایسا دور بھی آیا جب یہ صاحب (جن کی سفارش میں نے کی تھی) ہاشم علی صاحب کے شدید مخالف بن گئے۔ مجھے جب یہ اطلاعیں ملنے لگیں تو میں نے ان صاحب سے دوری اختیار کرلی۔ یہ اور بات ہے کہ میرے دل میں ایک بھاری خلش پیدا ہوگئی۔ لیکن ہاشم علی اختر کی بڑائی یہ تھی کہ کبھی اپنے طرزِ عمل میں فرق نہ آنے دیا اور نہ ہی کبھی ان صاحب کی شکایت کی۔ وہ مجھے بدستور علی گڑھ آنے کی دعوت دیتے اور اسی گرم

جوشی سے ملتے۔ دہلی آتے تو مجھے پہلے سے اطلاع دے دیتے تھے کہ میں فلاں تاریخ کو آرہا ہوں۔ بسا اوقات وہ علی گڑھ سے سیدھے میرے گھر آجاتے تھے اور مجھے ساتھ لے کر انڈیا انٹرنیشنل سنٹر پہنچ جاتے تھے جہاں وہ قیام کرتے تھے۔ جب وہ علی گڑھ کی وائس چانسلری سے سبکدوش ہوئے اور حیدر آباد واپس جانے کے لئے دہلی آئے تو میں نے کھُل کر اپنی ندامت کا اظہار کر دیا کہ میری ایک سفارش کی وجہ سے آپ کو علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک غلط کام بھی کرنا پڑا تھا۔ زوردار قہقہہ لگا کر بولے ''مجتبیٰ! مانا کہ تم نے سفارش کی تھی لیکن فیصلہ تو میں نے کیا تھا اور اس کی ذمّہ داری بھی مجھ پر ہی عائد ہوتی ہے تم پر نہیں۔ یوں بھی تم نے اپنے ظرف کے حساب سے ان صاحب کی سفارش کی تھی اور انہوں نے اپنے ظرف کے حساب سے اس کا صلہ دیا تھا۔ تمہیں اس معاملہ میں نادم یا شرمسار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میں ان کے اس جواب کو سن کر شرم کے مارے مزید پانی پانی ہو گیا۔ اب ایسے اعلیٰ ظرف انسان کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ان کے ادبی اور علمی کارناموں کے تعلق سے میں کچھ نہیں کہونگا۔ میں کیا اور میری بساط کیا۔ یوں بھی ایک زمانہ اُن کے کارناموں کا معترف ہے۔ تاہم ان کی ایک انگریزی کتاب (Essence of Islam) کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا چاہوں گا۔ ہاشم علی اختر نے اس کتاب میں اسلام کے جامع اور مبسوط اخلاقی و معاشرتی نظام کے علاوہ انسان دوستی، رواداری، وسیع النظری اور وسیع المشربی پر مبنی اسلام کے بنیادی مسلک کو اجاگر کرنے کی غرض سے اُن آیاتِ قرآنی اور احادیث کو بڑی عرق ریزی کے ساتھ مرتب کیا ہے جن کی روشنی میں کوئی بھی فرد بلالحاظ مذہب و ملّت اور رنگ و نسل اپنے لئے اعلیٰ و صالح کردار کی تشکیل کر سکتا ہے۔ شکاگو کی ملاقات میں انہوں نے ازراہ عنایت مجھے یہ کتاب تحفتاً دی تھی۔ شکاگو سے دہلی تک کے سفر میں یہ کتاب میرے زیر مطالعہ رہی۔ واپسی کے بعد میں نے یہ کتاب اپنے چند دوستوں کو پڑھنے کے لئے دی۔ آپ حیرت کریں گے کہ پچھلے تین برسوں میں میرے کئی دوستوں نے تقاضا کر کے یہ کتاب حاصل کی اور اس کے مطالعہ سے فیض یاب ہوئے۔ کئی دوستوں نے اس کے کئی حصّوں کی فوٹو کاپیاں کرا رکھی ہیں۔ یہ کتاب اقراء فاؤنڈیشن شکاگو کے زیر اہتمام کوالا لمپور سے شائع ہوئی ہے۔ اکثر احباب نے اس کتاب کو بازار سے خریدنے کی کوشش کی لیکن یہ شاید ہندوستان میں دستیاب نہیں ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ڈاکٹر عابد اللہ غازی اس کتاب کی ہندوستان میں تقسیم کا بندوبست

کریں۔اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دنیا کے اجنبی معاشروں میں رہنے والے مسلمانوں کواپنی طرزِ معاشرت اور سماجی رویّوں کومقامی حالات کے مطابق ڈھالنے کا درس دیتی ہے۔غالباًامریکہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد ہاشم علی اختر کواس طرح کی کتاب کومرتب کرنے کاخیال آیاتھا۔

ہاشم علی اختر کے بارے میں جوکتاب حیدرآباد میں زیرِطبع ہے اسے اب جلداز جلد چھپ جانا چاہئے۔پروفیسر مغنی تبسم، حسن چشتی،قدیرزماں اور ہاشم علی صاحب کے بھائی ڈاکٹر کاظم حسین اس سلسلہ میں توجہ کریں تو آنے والی نسلیں بھی ان کے بیش بہا کارناموں سے واقف ہوسکیں گی۔اگرچہ ہاشم علی اختر امریکہ کی مٹی کا حصّہ بن گئے ہیں لیکن حیدرآباداپنے اس محسن کو ہمیشہ یادرکھے گا۔

روزنامہ ''سیاست'' (۲۹/جون ۲۰۰۳ء)

باتیں کنولؔ پرشاد کی

''سیاست'' کا پانچ جون کا شمارہ مجھے تاخیر سے ملا تو پتہ چلا کہ اُردو اور ہندی کے ممتاز شاعر کنول پرشاد کنولؔ ۴؍جون کو حیدرآباد میں رحلت فرما گئے۔ دل کو ایک دھکا سا لگا۔ اس لئے کہ کنول پرشاد کنول سے کئی رشتے تھے۔ پہلا رشتہ تو یہ کہ وہ میرے بزرگ تھے کیونکہ عابد علی خاں، محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس کے قریبی دوستوں میں تھے۔ اس طرح میرے دل میں ان کے لئے بڑا احترام تھا۔ پھر ادب اور تہذیب کا الگ رشتہ تھا۔ وہ حیدرآبادی تہذیب کے سچے علمبردار اور سیکولرازم، رواداری، اخوت، انسان دوستی میں اٹوٹ عقیدہ رکھنے والے انسان تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے اندر تنگ نظری اور تعصب جیسے گھٹیا جذبات کو داخل کرنا ایسا ہی تھا جیسے ٹوتھ پیسٹ کے ٹیوب سے باہر نکلے ہوئے پیسٹ کو دوبارہ ٹیوب کے اندر داخل کرنے کی کوشش کرنا۔ شاعر ہونے کے ناتے شہرت کا طلبگار کون نہیں ہوتا۔ وہ بھی تھے۔ مگر انسان کھرے تھے۔ چھوٹوں سے ہمیشہ بے حد شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ افسوس کہ رواداری، محبت اور حیدرآبادی تہذیب کا ایک نادر نمونہ ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا۔ ان سے میرا ایک اور رشتہ بھی تھا جو افسر اور ماتحت کا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں جب میں نے حکومت آندھرا پردیش کے محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ میں ملازمت اختیار کی تو کنول پرشاد کنول اس محکمہ میں میرے اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔ ان سے ادبی محفلوں اور اورینٹ ہوٹل کی بیٹھکوں میں میری ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ گویا وہ نہ صرف میرے مزاج سے بخوبی واقف تھے بلکہ میری شرارتوں اور فقرہ بازیوں سے آگاہ تھے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ

افسر اور ماتحت کا رشتہ بڑا پیچیدہ اور نازک ہوتا ہے۔ یہ ان کی بڑائی تھی کہ کبھی اس رشتہ کی نزاکتوں اور پیچیدگی کو مجھ پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ تاہم اپنی تمام تر شفقتوں کے باوجود دورانِ ملازمت وہ مجھ سے خائف ضرور رہے کہ پتہ نہیں میں کب کیا حرکت کر بیٹھوں۔ اب اُنھیں یاد کرنے بیٹھا ہوں تو اُن سے وابستہ کتنی ہی خوشگوار باتیں اور یادیں میرے ذہن میں تازہ ہونے لگی ہیں، حالانکہ دل اندر سے روتا چلا جارہا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر ایک انسان گذر جائے تو کیا اس کے پسماندگان صرف روتے دھوتے ہی رہ جائیں اور اس سے وابستہ خوشگوار یادوں اور باتوں کو یکسر فراموش کر دیں۔ ایک انسان ہنسی اور غم کی آمیزش سے ہی ایک اکائی بنتا ہے، صرف رونے دھونے سے نہیں۔ جی چاہتا ہے کہ آج کنول پرشاد کنول سے وابستہ کچھ خوشگوار یادوں کو سمیٹنے کے جتن کروں۔ محکمہ اطلاعات کے دفتر کے سامنے شام کے وقت ایک بھکاری اکثر کھڑا رہتا تھا اور کنول پرشاد کنول دفتر سے گھر جاتے ہوئے اسے خیرات ضرور دیا کرتے تھے۔ میں نے اس پس منظر میں ایک لطیفہ گھڑا اور سلیمان اریب کو سنا دیا کہ کنول جی نے جیسے ہی بھکاری کے کشکول میں دس پیسے کا سکہ ڈالا تو بھکاری نے آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا ''اللہ تیرے اشعار میں وزن پیدا کرے''۔ کنول جی نے ادھر اُدھر دیکھا کہ کسی نے بھکاری کی دعا سن تو نہیں لی۔ جب یقین ہوگیا کہ کسی نے نہیں سنی تو انہوں نے دس پیسے کا ایک اور سکہ اس کے کشکول میں ڈالتے ہوئے کہا ''بڑے میاں! یہی دعا تھوڑی سی اور کرنا''۔ سلیمان اریب کے پیٹ میں کوئی بات نہیں رہتی تھی انہوں نے یہ لطیفہ اورینٹ ہوٹل کی ایک محفل میں سنا دیا جس میں مخدوم محی الدین بھی موجود تھے۔ مخدوم بھلا کہاں رکنے والے تھے۔ انہوں نے ایک دن کنول پرشاد کنول سے کہہ دیا کہ مجتبیٰ کہتا ہے کہ تم اپنے اشعار میں وزن پیدا کروانے کی خاطر ایک بھکاری سے دعائیں لیتے ہو۔ کنول پرشاد کنول نے یہ لطیفہ تو سن لیا لیکن مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ البتہ ایک بار دیکھا کہ وہ مذکورہ بھکاری سے کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ بھابی ریاست خانم (بیگم اختر حسن) بھی دفتر میں ہمارے ساتھ کام کرتی تھیں اور کنول جی ریاست بھابی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے ریاست بھابی کو بُلا کر یہ لطیفہ سنایا اور کہا کہ ''یہ مجتبیٰ بڑا شریر اور فتنہ گر ہے۔ میرے بارے میں من گھڑت لطیفے بنا کر لوگوں کو سنا دیتا ہے۔ اب اسی بھکاری کو لیجئے۔ کل میں نے اس بھکاری سے بات کی تو معلوم ہوا کہ وہ تو تلگو داں ہے۔ اُردو تو بالکل نہیں جانتا۔ بھلا وہ میرے اشعار میں وزن

پیدا کرنے کی دعا کیوں مانگے گا۔اسے نہ تو ردیف معلوم ہے نہ قافیہ۔میں مجتبیٰ کے بڑے بھائیوں کا دوست ہوں۔اسے کم از کم اس بات کا لحاظ تو کرنا ہی چاہئے"۔ریاست بھابی نے جب یہ بات مجھے بتائی تو میں نے مسکین سی صورت بنا کر کہا"بھابی! بھکاری کی زبان دانی سے کسی کو کیا لینا دینا ہے۔اس کا کام تو صرف دعا کرنا ہے چاہے وہ کسی بھی زبان میں کرے۔آپ کو راز کی بات بتاؤں کہ خود میں اپنی مزاح نگاری کی ترقی کے لئے اس بھکاری کو روز دس پیسے خیرات دیتا ہوں۔ ماشاءاللہ میری مزاح نگاری تو ترقی کرتی چلی جارہی ہے۔یہ اسی بھکاری کی دعاؤں کا فیض ہے۔ چونکہ کنول جی بھی اسے خیرات دیتے ہیں تو میں نے سوچا کہ شاید اپنی شاعری کی ترقی کی خاطر دیتے ہونگے۔"ریاست بھابی نے جب کنول جی کو لطیفے کے بارے میں میری صفائی سنائی تو بولے"ذرا دیکھئے اس کی شرارت۔اب ایک نیا ہی شوشہ اس نے لطیفہ میں پیدا کر دیا ہے"۔

جب چین نے ہندوستان پر جارحانہ حملہ کیا تو سارے ملک میں "بلیک آوٹ" کا حکم دے دیا گیا۔محکمہ اطلاعات کے دفتر میں بھی رات کے وقت عہدیداروں کی باری باری سے ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ دفتر میں موجود رہیں۔پتہ نہیں چین کب محکمہ اطلاعات پر حملہ کر دے۔ان دنوں نریندر لوتھر محکمہ اطلاعات کے ڈائرکٹر تھے اور کنول جی ان کی سختی اور ڈسپلن کی پابندی سے قدرے پریشان رہا کرتے تھے۔محکمہ اطلاعات کے دفتر کی عمارت پر عموماً رات کے وقت ایک لال بتی جلتی رہتی تھی۔بلیک آوٹ کی پہلی رات کو نو بجے تک میری ڈیوٹی تھی اور اس کے بعد کنول جی کو دفتر میں رہنا تھا۔کنول جی آئے تو دیکھا کہ دفتر کی عمارت پر لال بتی حسب معمول جل رہی ہے۔بولے "تمہیں تو معلوم ہے کہ سارے مک میں بلیک آوٹ کا حکم دیا گیا ہے۔یہ لال بتی کیوں جل رہی ہے؟"۔میں نے کہا"نریندر لوتھر ابھی پانچ منٹ پہلے یہاں سے گئے ہیں انہوں نے بھی جلتی ہوئی لال بتی کو دیکھا تھا۔جب انہوں نے اسے بند نہیں کروایا تو آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں"۔ بولے"یہ غلط بات ہے،تم فوراً ایک نوٹ ڈائرکٹر کے نام تیار کر کے لے آؤ تا کہ میں اس لال بتی کو بند کروانے کی اجازت ان سے حاصل کرلوں"۔میں نے بھی شرارتاً انگریزی میں ایک مزاحیہ نوٹ حسب ذیل عبارت کا تیار کر کے ٹائپ کروادیا۔

"In the light of the present black out I may kindly be permitted to put off the light, fixed at our office building."

کنول جی اپنے ماتحتین پر بڑا اعتماد کرتے تھے (چاہے ماتحت ہم جیسا ہی کیوں نہ ہو) فوراً نوٹ پر دستخط کر دیے اور تابڑتوڑ ایک خصوصی قاصد کے ذریعہ نوٹ نریندر لوتھر کے گھر بھجوا دیا۔ نریندر لوتھر نے نوٹ تو اپنے پاس رکھ لیا البتہ خصوصی قاصد کو زبانی تاکید کی کہ وہ خود جا کر بتی بجھا دے۔ دوسرے دن نریندر لوتھر نے انھیں غالباً ان کے نوٹ کا

" In the light of the present black out"

والا مزاحیہ فقرہ سُنایا تو واپس آکر بھابی سے شکایت کی "بھابی! مجتبیٰ اب انگریزی میں بھی مزاح نگاری کرنے لگا ہے۔ بھلا بتایئے In the light of the black out کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ یہ دفتری نوٹ ہے یا جدید شاعری؟"۔ بھابی نے کہا "وہ نوٹ تمہاری طرف سے تھا تو تم نے اس پر دستخط کرنے سے پہلے اسے پڑھا کیوں نہیں؟"۔ بولے "مجھے لائٹ کو بند کروانے کی جلدی تھی۔ کیا میں اپنے ماتحتین پر اتنا بھروسہ بھی نہ کروں۔ پھر میں تو اس کے بڑے بھائیوں کا دوست ہوں۔" (دفتر کے ہر معاملہ میں وہ میرے بڑے بھائیوں کو بیچ میں لے آتے تھے)۔

کنول جی کو اپنے شعر سنانے کا بڑا شوق تھا (کس شاعر کو نہیں ہوتا)۔ کوئی بھی ملنے والا اُن کے پاس آتا تو وہ فوراً اپنے خاص چپراسی اچیا کو طلب کرتے اور اپنے ہاتھ کی انگلیوں کے اشارے سے بتاتے کہ جاؤ جا کر چائے لے آؤ۔ اگر دو انگلیاں بتاتے تو اس کا مطلب ہوتا دو گھنٹے بعد چائے لے آؤ۔ ایک انگلی بتاتے تو اس کا مطلب ہوتا ایک گھنٹہ بعد چائے لے آؤ۔ وہ اپنی شاعری کی مقدار اور اپنی نجی مصروفیت کے حساب سے انگلی کا اشارہ طے کرتے تھے اور اچیا حسب الحکم مقررہ وقت تک دفتر سے غائب ہو جاتا تھا۔ اتنی دیر میں وہ اپنے ملاقاتی کو کلام سناتے رہتے تھے۔ وہ اُٹھنے کی کوشش کرتا تو کہتے بھائی چائے آرہی ہے۔ کیسے چلے جاؤ گے۔ چلو اتنی دیر میں میری ایک تازہ نظم سنو۔ ایک بار کنول جی اپنے چپراسی سے کسی بات پر ناراض ہو گئے اور اسے بُری طرح ڈانٹ دیا۔ چپراسی بھی آخر کو انسان ہوتا ہے۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے وہ میرے پاس آیا اور بتانے لگا کہ کس طرح وہ انگلیوں کے اشارے سے چائے لانے کے وقت کا تعین کر دیتے ہیں اور اس عرصہ میں معصوم، مظلوم اور بے گناہ ملاقاتیوں کو اپنا کلام سناتے رہتے ہیں۔ مجھ پر تو یہ راز فاش ہو ہی گیا تھا۔ اتنے میں دیکھا کہ حمایت اللہ کسی کام سے کنول جی کے کمرے میں جا رہے ہیں۔ دوستی کے ناتے میں نے انھیں یہ راز بتا دیا اور خبردار رہنے کی تلقین کی۔

حمایت بھائی کے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی کنول جی خوش ہو گئے اور اپنے ہاتھ کی دو انگلیاں اُٹھا کر اچھیا کو چائے لانے کا آرڈر دینے ہی والے تھے کہ حمایت اللہ نے فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر اُن کے ہاتھ کی ایک انگلی اپنے ہاتھ سے نیچے گرائی اور دوسری انگلی کو آدھا موڑ کر براہ راست اچھیا سے کہا ''اچھیا! میرے لئے آدھے گھنٹے میں چائے لے آؤ۔'' اس وقت تو کنول جی خاموش رہے۔ حمایت اللہ کے جانے کے بعد ریاست بھابی کو بلا کر کہا ''بھابی! میں مجتبیٰ کی غیر ذمہ داریوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ بھئی دفتر میں کام کرنے کے بھی کچھ آداب اور اُصول ہوتے ہیں۔ وہ تو دفتر کے سارے راز لوگوں کو بتا دیتا ہے''۔

کتنے ہی واقعات ہیں جو اب یاد آنے لگے ہیں۔ ریاست بھابی بھی اب اس دنیا میں نہیں رہیں اور اب تو کنول جی بھی رخصت ہو گئے۔ ان کی رفاقت میں دس برس کچھ اس طرح گذرے کہ آج بھی ذہن میں تر و تازہ ہیں۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ ان برسوں کا لمحہ لمحہ جوڑ کر ایک ناول لکھوں۔ لیکن اب عمر کی نقدی ختم ہونے اور بلاوے کی دستک سنائی دینے لگی ہے۔ یہ ان کی بڑائی تھی کہ کبھی میری سرزنش نہیں کی بلکہ ریاست بھابی نے بہت بعد میں مجھے بتایا کہ اندر ہی اندر وہ میری باتوں اور حرکتوں سے محظوظ ہوتے تھے۔ کتنا بڑا ظرف تھا اُن کا۔ وہ جب بھی دہلی آتے تو مجھے ضرور یاد کرتے تھے اور اپنی شفاف شفقتوں سے نوازتے تھے۔ ابھی تین ہفتے پہلے ہند۔ پاک تعلقات کی بہتری کے پس منظر میں ان کی ایک نظم ''سیاست'' میں شائع ہوئی تھی جسے پڑھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ وہ تخلیقی اور جذباتی سطح پر اب بھی سرگرم عمل ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ اب کی بار حیدر آباد میں ان سے ضرور ملوں گا بلکہ حمایت اللہ سے فون پر اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا۔ کنول پرشاد کنول جیسے مشفق اور سرپرست کا اس دنیا سے اٹھ جانا میرے لئے ایک بڑا شخصی سانحہ ہے۔ میں ان کی آتما کو بادیدہ نم سلام کرتا ہوں۔

جو ہم ادھر سے گذرتے ہیں کون دیکھتا ہے
جو ہم ادھر سے نہ گذریں گے کون دیکھے گا

(مجید امجد)

روزنامہ ''سیاست'' (جولائی ۲۰۰۳ء)

☆☆

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے نام ایک خط

مصوّرِ فطرت شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ صاحب قبلہ!

آپ کو خط لکھتے ہوئے نہ صرف اس ناچیز کو بلکہ ناچیز کے قلم کو تو کچھ زیادہ ہی پسینہ آ رہا ہے حالانکہ دن سردیوں کے ہیں۔ غور فرمائیے کہاں یہ خاکسار اور کہاں آپ کی ذات والا صفات۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا کہ آپ جیسے مایہ ناز انشا پرداز اور نابغۂ روزگار ہستی کو خط لکھنے کی جسارت کر سکوں۔ اصل قصہ یہ ہے کہ آپ کے فرزندِ ارجمند اور میرے کرم فرما حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی، سجادہ نشین درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ جن کے بارے میں اکثر لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا صحیح مرقع اور بالکل آپ کا نقش ثانی ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اب خود خواجہ حسن ثانی کا کوئی ثانی پیدا نہ ہوگا، کا حکم ہے کہ میں اس سمینار کی صدارت کروں جو آپ کی ذات گرامی سے منسوب ہے۔ دہلی میں جہاں پہلے ہی سے اتنے سارے نامی گرامی ''عادی صدور'' موجود ہوں اور جو ''صدارت'' کی آس میں لائن لگائے کھڑے رہتے ہوں وہاں اس مقصد کے لئے مجھ جیسے کم سواد پر خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب کی نظر انتخاب کا پڑنا ان کا عملی مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔ ان سے گڑگڑا کر گذارش بھی کی کہ جس محفل میں اتنے سارے اہل علم و دانش موجود ہوں وہاں مجھ جیسے کم علم کا کیا کام، مگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔

بہت غور کیا تو پھر ایک بار اس بات پر ایمان لانا پڑا کہ خواجہ حسن ثانی نظامی سچ مچ آپ کا نقش ثانی ہیں۔ جو کام بھی کرتے ہیں اُس میں آپ ہی کی طرح کوئی نہ کوئی ندرت اور جدّت کی گنجائش ضرور نکال لیتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے قدیمی خدمت گزار نوکر علی بخش کی گود میں اپنی جان جان آفریں کے حوالہ کی تھی۔ علامہ اقبال اور ان کے افراد خاندان سے آپ کے قریبی مراسم سب پر عیاں تھے لیکن آپ نے علامہ اقبال کے انتقال کا پُرسہ اُن کی اولاد کو نہیں بلکہ اُن کے نوکر علی بخش کو بھیجا تھا۔ جہاں سارے اکابرین اُن کی اولاد کو پُرسہ دے رہے تھے وہاں آپ کی نظرِ انتخاب علی بخش پر پڑی۔ سچ تو یہ ہے کہ علی بخش کی طرف سوائے آپ کے کسی اور کا دھیان نہیں جا سکتا تھا۔ حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی نے مجھ ناچیز کو اس سیمینار کی صدارت سونپ کر صحیح معنوں میں آپ کی اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ آپ اپنے عہد کی اُن سربرآوردہ ہستیوں میں سے تھے جن کے مراسم زندگی کے ہر شعبہ کے اکابرین سے تھے۔ بلاشبہ آپ نے اپنی تحریروں میں اپنے عہد کی ان بڑی ہستیوں کے بارے میں بھی لکھا لیکن جب آپ ایک عام اور معمولی آدمی یا موضوع کے بارے میں لکھتے تھے تو اپنے سحر طراز قلم کی جولانیوں کے ذریعہ اس معمولی آدمی کو غیر معمولی بنا دیتے تھے اور کئی نام نہاد بڑے آدمیوں کے مقابلہ میں اُسے بڑا بنا کر پیش کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ پھولوں کے معاملہ میں بھی آپ نے گلاب کے مقابلے میں کیکر کے پھول کو ہی ترجیح دی۔ معمولی بات، معمولی چیز اور معمولی آدمی کو غیر معمولی بنا کر پیش کرنا آپ کے فن کا خاص وصف رہا ہے اور یہ غیر معمولی بات کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ خیر اس بات کو میں یہیں پر ختم کرتا ہوں۔

خواجہ صاحب قبلہ! پہلے یہ بتائیے کہ آپ کس حال میں ہیں؟۔ قیاس اغلب یہ ہے کہ یہاں کے حالات کا علم تو آپ کو وہاں بخوبی ہو جاتا ہوگا کیونکہ ان دنوں اکثر اُردو والے لائن لگا کر یہاں سے وہاں جانے لگے ہیں۔ ان میں سے بعض تو جنّت میں بھی آتے ہوں گے کیونکہ ان میں سے بیشتر اصحاب، اُردو کے ادیب ہونے کے حوالہ سے، جہنّم میں رہنے کا عذاب اس دنیا میں بھگت چکے ہوتے ہیں۔ اُردو کا ادیب اور شاعر، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، جب اس دنیا سے گذر جاتا ہے تو اپنے پیچھے ایک خلا ضرور پیدا کر جاتا ہے جسے پُر کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ آپ حیرت کریں گے کہ اڑتالیس برس پہلے آپ کے اس دنیا سے چلے جانے کے باعث جو وسیع خلا پیدا ہوا تھا وہ آج بھی جیوں کا تیوں موجود ہے بلکہ آپ کے بعد اُردو کی جو باقیماندہ نامور ہستیاں

اس دنیا سے اُٹھیں اُنھوں نے اس خلا کی وسعت میں مزید اضافہ فرمایا ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ اُردو ادیبوں کا واحد مقصدِ حیات اب صرف یہی رہ گیا ہے کہ جلد از جلد مرو اور خلا پیدا کرو۔ بلکہ ہم جیسے لوگ تو خلا پیدا کرنے کے معاملے میں اتنے خود کفیل ہو چکے ہیں کہ اپنے ادب کے ذریعہ جیتے جی ہی خلا پیدا کرنے لگے ہیں۔ مرنے کے بعد تو ہر کوئی خلا پیدا کر سکتا ہے زندہ رہ کر خلا پیدا کرنا کمال کی بات ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ کبھی کبھار منفی کاموں کے مثبت نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اُردو ادیبوں نے اس وسیع کائنات میں اتنا بسیط خلا پیدا کر دیا ہے کہ اب امریکہ اور روس کے سائنسدانوں کو اس خلا کی تسخیر کے لے ایک جامع پروگرام پر عمل کرنا پڑ رہا ہے اور وہ آئے دن اپنے خلائی شٹل آسمان میں بھیجنے لگے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ اُردو کے ادیب اور شاعر خلا پیدا کر کے سائنس کی ترقی میں کتنا اہم حصّہ ادا کر رہے ہیں۔

محترم خواجہ صاحب! ایک بات اور عرض کروں کہ آپ کے انتقال کے بعد شوکت تھانوی نے آپ کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا ''قبر پُر ہوگئی۔'' یہ ایک اتفاق ہے کہ آپ نے اپنے انتقال سے کئی برس پہلے اپنی آخری آرام گاہ کے لئے نہ صرف جگہ کا انتخاب کر لیا تھا بلکہ اپنی قبر بھی تعمیر کروالی تھی۔ شوکت تھانوی نے لکھا تھا کہ یہ قبر کئی برسوں تک آپ کے جسد خاکی کے انتظار میں ویران پڑی رہی اور بالآخر ۳۱ر جولائی ۱۹۵۵ کو قبر کا مکین اُسے مل گیا اور یوں یہ قبر پُر ہوگئی۔ شوکت تھانوی نے قبر کے پُر ہونے کی بات تو کی لیکن اس خلا کے پُر ہونے کی کوئی بات نہیں کی جو آپ کی رحلت سے اُردو ادب میں پیدا ہو گیا تھا۔ حد تو یہ کہ آپ نے بھی اس بارے میں کبھی نہیں سوچا۔

آپ کے ایک ادنیٰ پرستار کی حیثیت سے یہ خاکسار بچپن ہی سے آپ کی تحریریں پڑھتا آیا ہے۔ آپ نے ایک صدی پہلے سادگی، پُرکاری اور خیال آفرینی کے امتزاج سے جو منفرد اسلوب نگارش اختیار کیا تھا وہ آج بھی بے مثال اور نا قابلِ تقلید ہے۔ آپ کی تحریروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آسان زبان لکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ حسرت رہ گئی کہ اپنی پچاس سالہ ادبی زندگی میں کبھی میں ایک پیراگراف ہی آپ کی طرح لکھ پاتا۔ یوں بھی میں کیا اور میری حیثیت کیا۔ حکیم الامت علامہ اقبال آپ کے بارے میں فرما گئے ہیں ''اگر میں خواجہ صاحب جیسی نثر لکھنے پر قادر ہوتا تو کبھی شاعری کو اظہارِ خیال کا ذریعہ نہ بناتا۔'' یہ اور بات ہے کہ آپ نے اپنی ''آپ بیتی'' میں

نہایت عجز وانکسار کے ساتھ اپنے اسلوب اور اپنی زبان کے بارے میں فرمایا ہے۔

''اگر کوئی تنقیدی نظر سے میری کتابوں کو دیکھے گا تو اس کو ایک حیرت خیز بات محسوس ہوگی کہ میں نے بہت محدود الفاظ سے یہ سب کام کئے ہیں یعنی میری زبان پر گنتی کے چند الفاظ چڑھے ہوئے ہیں ان ہی سے میں نے کام لیا اور ہر قسم کے مضامین ادا کر دیئے، الفاظ کی وسعت میرے ہاں نہیں ہے اور حافظہ درست نہ ہونے کے سبب مجھ کو مقررہ و معلومہ الفاظ کے سوائے ادائے مطلب کے وقت اور کوئی لفظ یاد نہیں آتا اور میں ان ہی محدود الفاظ سے ہر مطلب کو ادا کر دیتا ہوں۔''

خواجہ صاحب قبلہ! آپ کے اسٹائیل کا سارا حسن زبان کی سادگی میں ہی پوشیدہ ہے اور آپ نے اسی آسان اور سہل زبان میں اپنے خیالات کو اپنے لاکھوں پڑھنے والوں تک نہ صرف پہنچایا بلکہ اپنے پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ بھی پیدا کیا۔ یوں بھی آپ فضول خرچی کے قائل نہیں رہے۔ چاہے وہ لفظوں کی فضول خرچی ہی کیوں نہ ہو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا خاکہ لکھتے ہوئے آپ نے اُن کی ان گنت خوبیوں اور بے پناہ صلاحیتوں کے تفصیلی ذکر کے بعد آخر میں ایک جملہ یہ بھی لکھا تھا ''اگر عمر کا منتقل کرنا ممکن ہوتا تو میں اپنی زندگی کے پانچ مہینے اُن کو دے سکتا تھا۔ زیادہ نہیں کیونکہ میں فضول خرچی کو بُرا سمجھتا ہوں۔'' دیدۂ بینا رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس بیان میں جہاں آپ نے فضول خرچی کو بُرا بتایا ہے وہیں اپنے شخصی وقت کے بیش قیمت ہونے کا احساس بھی دلایا ہے۔ جس شخص نے اپنی تہتر سالہ زندگی میں پانچ سو تصانیف لکھیں، ہزاروں علمی، دینی، صحافتی اور کاروباری مضامین لکھنے کے علاوہ انشائیے، سفرنامے، روزنامچے اور نہ جانے کیا کیا لکھا اُس کی عمر کے پانچ مہینوں کو معمولی عرصہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ ہم جیسے اگر اپنے معمولات کے ساتھ پانچ سو برس بھی جی لیں تو اتنا نہیں لکھ سکتے جتنا کہ آپ نے تہتر برسوں میں لکھا۔

محترم خواجہ صاحب! آپ یقین کریں کہ آج قدم قدم پر آپ کی دور بینی اور دور اندیشی یاد آتی ہے۔ آپ نے آج سے سو سال پہلے اپنا جو پہلا مضمون لکھا تھا اس کا عنوان تھا ''انڈیا کی نازک حالت۔'' اگرچہ اس مضمون کو لکھے ہوئے سو برس سے اُوپر اور خود آپ کو اس دنیا سے گذرے ہوئے بھی اڑتالیس برس بیت چکے ہیں لیکن ''انڈیا کی نازک حالت'' آج بھی بدستور قایم و دایم ہے۔ اندازہ لگایئے کہ یہ نازک حالت کتنی پائیدار، طاقتور اور مستحکم ہے بلکہ یہ نازک

حالت دن بدن نازک ترین ہوتی چلی جارہی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی تحریروں میں جس انسان دوستی، رواداری اور وسیع المشربی کا درس دیا تھا لوگ اب اُسے بھول چکے ہیں۔یہاں اب ایسی باتوں کو سمجھنے والا تو بہت دور کی بات ہے سننے والا بھی نہیں رہا۔

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ ۱۹۰۰ء میں جب کہ آپ کی عمر صرف ۲۲ سال کی تھی آپ کی پہلی کتاب ''مفلسی کا مجرب علاج بذریعہ دُعا'' شائع ہوئی تھی۔یقین مانئے آج بھی اس ملک میں اُسی آن بان اور شان کے ساتھ مفلسی کا بول بالا ہے۔انگریز چلے گئے تو سوچا تھا کہ ہماری جمہوری حکومت مفلسی اور غربت کا قلع قمع کردے گی۔اگرچہ حکومت نے ''غریبی ہٹاؤ'' کا نعرہ بھی دے رکھا ہے لیکن ہمارے حکمران غربت کا خاتمہ کرنے کے بجائے غریبوں کا ہی خاتمہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ایک اعتبار سے یہ بات ٹھیک بھی ہے۔جب غریب ہی نہیں رہیں گے تو غربت کہاں رہے گی۔آپ نے سو برس پہلے دعاؤں کے ذریعہ غربت کے علاج کا جو نسخہ تجویز فرمایا تھا اس کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔سچ تو یہ ہے کہ ہم جیسوں کی زندگی حکومتوں کی مرہونِ منت نہیں رہی بلکہ صرف دعاؤں کے سہارے چل رہی ہے۔اس اعتبار سے ہم آج بھی آپ کی تجویز کردہ دُعاؤں کے محتاج ہیں۔

خواجہ صاحب قبلہ! آپ کے روزنامچے میں آج بھی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔آپ کے روزنامچوں میں جابجا اس طرح کا جملہ پڑھنے کو ملتا ہے۔'' دوپہر بعد دہلی گیا تھا اور رات دیر گئے بستی نظام الدین واپس آیا۔'' گستاخی معاف! اس جملہ سے یوں لگتا ہے جیسے اس زمانہ میں دہلی اور بستی حضرت نظام الدین دو الگ الگ جگہیں تھے۔آپ کو حیرت ہوگی کہ اب دہلی نے بستی حضرت نظام الدین کو پوری طرح ہڑپ کرلیا ہے اور اب چاروں طرف دہلی ہی دہلی نظر آتی ہے۔یہ اور بات ہے کہ کوئی دہلی والا نظر نہیں آتا۔میلوں چلے جایئے یہ شہر آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اس کے حدود اربعہ کا یہ عالم ہے کہ اس کے مشرق، مغرب، شمال اور جنوب میں بھی دہلی ہی واقع ہے۔بھیڑ کا یہ عالم ہے کہ یہاں کا باسی اپنی شناخت کھوکر حشرات الارض میں تبدیل ہوگیا ہے۔یہ شہر پہلے اپنی تہذیب کے لیے ساری دنیا میں شہرت رکھتا تھا اب اپنے پولیوشن (Pollution) کے لیے بدنام ہے۔آپ بُرا نہ مانیں تو پولیوشن کا ترجمہ بھی کرتا چلوں کیونکہ یہ انگریزی زبان کا لفظ ہے اور مجھے معلوم ہے کہ آپ صرف ایک دن کے لئے انگریزی اسکول میں داخل ہوئے تھے اور ایک

دن میں جتنی انگریزی سیکھی جاسکتی ہے سیکھ کر چلے آئے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ بہت دن بعد آپ نے اپنے انگریزی داں فرزند خواجہ حسین نظامی سے کہا تھا ''بیٹا! تم نے انگریزی پڑھی ہے اور تمہارے باپ نے انگریز کو پڑھا ہے۔'' کتنی بلیغ بات کہی تھی آپ نے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ آپ انگریزی تہذیب کے پولیوشن سے تو بخوبی واقف تھے لیکن دہلی کے موجودہ پولیوشن کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہاں کی موٹروں، بسوں، اسکوٹروں اور کارخانوں وغیرہ نے اس شہر کی فضا کو اتنا آلودہ اور گندہ بنا دیا ہے کہ عام آدمی کا سانس لینا دوبھر ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں کی فضا میں جو زہر پھیلتا جا رہا ہے اس کو قابو میں رکھنے کے لئے حکومت نے جگہ جگہ پولیوشن چیک کے مراکز قائم کر رکھے ہیں لیکن حکومت نے اب تک سیاسی قائدین کے ذریعہ پھیلنے والے پولیوشن یعنی نفرت اور فرقہ پرستی کے زہر کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں بنایا ہے۔ اس لئے یہ زہر اب دن دونی اور رات چوگنی پھیلنے لگا ہے۔

خواجہ صاحب قبلہ! اس شہر کی آبادی اب اتنی بڑھ گئی ہے اور مکانات کچھ اس ڈھنگ سے تعمیر ہونے لگے ہیں کہ اگر خدانخواستہ آپ کو کبھی پرانی دہلی سے بستی حضرت نظام الدین آنے کا موقع ملے تو تلاش بسیار کے باوجود آپ کو خود اپنا مکان نہیں مل پائے گا۔ اس لئے کہ اب یہاں اتنی ناجائز تعمیرات ہو چکی ہیں اور اتنی تنگ و تاریک گلیاں نمودار ہو چکی ہیں کہ اب آپ کو اپنے زمانہ کی گلیاں یہاں نظر نہیں آئیں گی۔ اس کے باوجود اگر آپ آنا چاہیں تو ہمارے شاعر دوست متین امروہوی کے گھر کی طرف سے بالکل نہ آئیں۔ اس لئے کہ ابھی پچھلے دنوں خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب سے مل کر واپس آتے ہوئے یہاں کے کھلے ہوئے سیور میں ہم نہ صرف اپنے سینڈل سے ہاتھ دھو چکے ہیں بلکہ پاؤں تک دھو چکے ہیں۔ زندہ آدمی تو خیر کسی طرح اپنے جسم کو موڑ کے ان گلیوں کو عبور کر لیتا ہے۔ تاہم اس نکتہ پر ہم اکثر غور کرتے ہیں کہ اگر اس علاقہ میں خدانخواستہ کسی کی موت واقع ہو جاتی ہوگی تو مرحوم کے پسماندگان اس کی میّت کو ان گلیوں میں سے نہ جانے کس طرح گذارتے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے مرحوم کے میّت میں تبدیل ہونے سے پہلے ہی اُسے ان گلیوں سے باہر نکال دیا جاتا ہوگا۔ اس بستی کے باسی کا یہاں چین سے رہنا تو دور کی بات ہے وہ چین سے مر بھی نہیں سکتا۔

خواجہ صاحب! دہلی اور اپنے ملک کے ذکر کو میں یہاں ختم کرنا چاہوں گا اس لئے کہ

مجھے بتایا گیا ہے کہ آج آپ کی یاد میں منعقد ہونے والے سمینار میں ایک بیرونی مہمان ذی وقار بھی موجود ہوں گے جو افغانستان کے صوبہ ہرات کے قصبہ چشت سے تشریف لے آئے ہیں میری مراد حضرت مولانا الحاج سید احمد شاہ مودودی چشتی، سجادہ نشین حضرت قطب الدین مودود چشتی سے ہے۔ آٹھ سو برس پہلے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، چشت سے ہی ہندوستان آئے تھے۔ اس ملک میں محبت، صلح وآشتی اور انسان دوستی کے پیغام کو عام کرنے میں چشتیہ سلسلہ کے صوفی بزرگوں نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں ان کا ذکر آپ کی تحریروں اور ''نظامی بنسری'' میں پڑھ چکا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ حضرت مولانا سیّد احمد شاہ مودودی چشتی کی موجودگی میں دہلی اور اپنے ملک کی نازک اور ناگفتہ بہہ حالت کا ذکر کروں ورنہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اگر اس ملک کے یہی حالات ہونے تھے تو چشتی صوفیائے کرام نے اپنے اچھے بھلے چشت کو چھوڑ کر یہاں آنے کی زحمت کیوں گوارا کی تھی۔ یوں بھی یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ ان کے علم میں ایسی باتیں نہیں آنی چاہئیں۔ علم غیب سے اگر انھیں معلوم ہو جائیں تو یہ ایک الگ بات ہے۔

حضرت خواجہ صاحب قبلہ! خط خاصا طویل ہو چکا ہے لہذا باقی باتیں اب انشاء اللہ وہیں آ کر بالمشافہ کروں گا۔ جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔ کوشش نہ بھی کروں تو یہاں کے حالات مجھے آپ کی خدمت میں بھجوا دیں گے۔ بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن حاضرین محفل اب اُس لنگر کی طرف متوجہ ہونے لگے ہیں جس کے کھانوں کی خوشبو یہاں تک آنے لگی ہے۔ ایسی حالت میں اگر آپ بھی ہوتے تو شاید یہی کرتے کیونکہ آپ نے ہمیشہ ہم جیسے بھوکوں اور ناداروں کا خیال رکھا۔ خدا حافظ

دُعاؤں کا طالب

(حضرت خواجہ حسن نظامی کے سمینار منعقدہ ۱۹؍فروری میں بطور صدارتی خطبہ پڑھی گئی تحریر)

روزنامہ ''سیاست'' (۲۰؍فروری ۲۰۰۳ء)

☆☆

ذکرِ خیر سیّد حامد کا

کچھ برس پہلے سابق مرکزی وزیر داخلہ سید سبطِ رضی کے گھر کوئی تقریب تھی۔ میں اپنی عادت کے مطابق اور سید حامد صاحب اُن کی اپنی عادت کے مطابق تقریب میں بروقت پہنچ گئے۔ کسی نادان کا قول ہے کہ جو اصحاب زمانے کے اعتبار سے قبل از وقت یا بعد از وقت پیدا ہوتے ہیں وہ عموماً جلسوں میں بروقت پہنچ جاتے ہیں۔ میزبان تو خیر موجود تھے ہی لیکن مہمان البتہ خال خال تھے اور تھے بھی تو ایسے مہمان کہ جن سے کم از کم میں تو اپنا منہ چھپانا ضروری تصور کرتا ہوں۔ آزمائش کی اس گھڑی میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ دیکھا حامد صاحب دور سے چلے آرہے ہیں۔ جن لوگوں نے سیّد صاحب کو چلتے ہوئے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ سید صاحب جب سینہ تان کر چلتے ہیں تو اس سے نہ صرف ان کا قد بلند ہو جاتا ہے بلکہ غور سے دیکھا جائے تو ان کی خودی بھی بلند ہوتی ہوئی دکھائی دے جاتی ہے۔ علامہ اقبال کی طرح وہ صرف خودی کو بلند کر کے مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ قد کو بلند کرنا بھی ضروری تصوّر کرتے ہیں۔ وہ میرے پرانے کرم فرماؤں میں سے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اتنا ہی کرم فرماتے ہیں جتنا کہ ان کے مزاج کی شائستگی اجازت دیتی ہے۔ اتنا کرم نہیں فرماتے جس کا میں طلبگار یا متمنی ہوتا ہوں۔ میں ان کے پاس گیا تو حسبِ معمول بڑی شفقت، محبت، خلوص اور نرمی وغیرہ سے پیش آئے۔ ایسی چیزیں اُن کے پاس ہمیشہ وافر مقدار میں موجود ہوتی ہیں۔ ہم دونوں ایک گوشہ میں بیٹھ گئے تو ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ میں نے یونہی وقت گزاری کے لیے مخدوم محی الدین کے ایک عملی

مذاق کا قصہ چھیڑ دیا۔ اب جو عامد صاحب اس واقعہ کے ایک ایک پہلو پر بے ساختہ ہنسنے لگے تو میں خود حیران رہ گیا۔ بہت دیر تک ہنستے رہے۔ بعد میں ان کی ہنسی تھمی اور محفل میں کچھ پسندیدہ مہمان آ گئے تو میں کسی اور طرف چلا گیا اور وہ کسی اور طرف۔ کچھ دیر بعد ایک شناسا مل گئے تو انھوں نے بصد اشتیاق مجھ سے پوچھا ''ابھی آپ کی باتوں پر جو صاحب یہاں بیٹھے بے ساختہ ہنس رہے تھے کہیں خدانخواستہ وہ سید حامد تو نہیں تھے؟''۔ میں نے کہا ''آپ نے حد کر دی، آپ تو سید صاحب کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے''۔ بولے ''وہ تو میں جانتا ہوں لیکن جس طرح وہ تمہاری باتوں پر دھاڑیں مار مار کر ہنس رہے تھے اس سے شبہ ہوا کہ شاید وہ سیّد حامد نہ ہوں۔ سنا ہے کہ فرشتے اور سیّد حامد کبھی نہیں ہنستے''۔ میں نے کہا ''خدا کے فضل و کرم سے فرشتوں کو دیکھنے کی نوبت تو خیر اب تک نہیں آئی البتہ سیّد حامد کو ضرور دیکھا ہے اور میرا خیال ہے کہ بُرا وقت آن پڑے تو سیّد صاحب ہنس بھی لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسی صورتوں میں فرشتے بھی ایسا ہی کرتے ہوں''۔

اُس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ سیّد حامد کے بارے میں لوگوں کو کیا کیا بدگمانیاں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ نہایت سنجیدہ، متین، بُردبار بلکہ گمبھیر انسان ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ ہنسنے سے بالکل عاری ہوں۔ میں نے انھیں جب بھی دیکھا تبسم زیرِ لب اور قہقہہ کے درمیان ایک شائستہ، سلیقہ مند، مہذب اور خوشگوار ہنسی کی حد پر کھڑے ہوئے پایا۔ تبسم کو قہقہہ میں تبدیل نہیں ہونے دیتے۔ کیونکہ ہنسی کے معاملہ میں وہ لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزی کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ کبھی غفلت میں خلاف ورزی ہو جائے تو یہ ایک الگ بات ہے۔ ایسی ایرکنڈیشنڈ ہنسی میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی۔

سیّد حامد حکومت ہند کے سینیئر ترین آئی۔ اے۔ ایس عہدیدار رہ چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں جاننے کے لیے مجھے دو اور سینیئر ترین آئی۔ اے۔ ایس عہدیداروں کی خدمات سے استفادہ کرنا پڑا۔ میری مُراد خواجہ عبدالغفور مرحوم، سابق چیف سکریٹری حکومت مہاراشٹرا اور ہاشم علی اختر، سابق سکریٹری حکومت آندھرا پردیش سے ہے۔ خواجہ عبدالغفور تو خود مزاح نگار تھے اور آئی اے ایس عہدیدار ہونے کے باوجود بے ساختہ قہقہہ لگانے کو اتنا بُرا بھی نہیں سمجھتے تھے۔ رشتے میں وہ سیّد صاحب کے سمدھی بھی ہوتے تھے۔ ان کے فرزند، حسن غفور، آئی پی ایس کی شادی

سیّد صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی ہے۔ خواجہ عبدالغفور مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کئی برس پہلے حسن غفور کی شادی کا جو استقبالیہ دہلی کے ''کلارجس ہوٹل'' میں دیا گیا تھا اس میں بھی دیکھا کہ خواجہ عبدالغفور تو اپنے دوستوں میں گھرے قہقہے لگانے میں مصروف ہیں اور دوسری طرف سیّد صاحب پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ مہمانوں کا استقبال کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ دلہن کے والد ہونے کے ناتے شاید انھوں نے عارضی طور پر ایسا سنجیدہ طرز عمل اختیار کر رکھا ہو۔ لیکن بعد کی دو چار محفلوں میں بھی انھیں اسی پوز میں دیکھا تو میں نے غفور صاحب سے پوچھا ''کیا بات ہے کہ سیّد صاحب ذرا کم ہی ہنستے ہیں؟''۔ بولے ''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ خوب ہنستے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی ہنسی کی نوعیت الٹی ہوتی ہے یعنی ہم لوگ تو اپنی ہنسی کو اندر سے باہر نکال دیتے ہیں لیکن وہ اپنی ہنسی کو باہر سے اندر کھینچ کر اپنی ذات میں جذب کر لیتے ہیں''۔ اور ان کی اس بات سے میں مطمئن ہو گیا۔

دوسرے آئی۔اے۔ایس عہدیدار، جن کی وساطت سے مجھے سیّد صاحب کو سمجھنے میں مدد ملی، ہاشم علی اختر ہیں جنھوں نے سیّد حامد صاحب سے علی گڑھ کی وائس چانسلری کا جائزہ حاصل کیا تھا۔ وہ سید صاحب کے بڑے زبردست مدّاح اور معترف ہیں۔ (آئی۔اے۔ایس برادری کی بعض مجبوریاں بھی تو ہوتی ہیں)۔ ہاشم علی اختر اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر انھوں نے سیّد صاحب کی بجائے کسی اور سے علی گڑھ کی وائس چانسلری کا جائزہ حاصل کیا ہوتا تو شاید ان کے لیے یونیورسٹی کو چلانا بہت دشوار ہو جاتا۔ دیکھا جائے تو یوں بھی سیّد حامد، علی گڑھ کے دو حیدرآبادی وائس چانسلروں یعنی پروفیسر علی محمد خسرو اور ہاشم علی اختر کے درمیان ''سینڈوچ'' کی حیثیت رکھتے تھے، اور سینڈوچ بننے کا جو کرب ہوتا ہے اس کا اندازہ آپ اُس وقت تک نہیں لگا سکتے جب تک کہ آپ بسوں کی تین افراد والی نشست پر خود سینڈوچ بن کر بیٹھنے کا تجربہ نہ رکھتے ہوں۔ پروفیسر علی محمد خسرو نے تو اپنے اندازِ خسروانہ سے یونیورسٹی چلائی لیکن سیّد حامد ٹھہرے آئی اے۔ایس عہدیدار۔ وہ سرسیّد کی یونیورسٹی کو خود سرسیّد کے بتائے ہوئے راستہ پر چلانے کے خواہشمند تھے۔ بتائیے یہ کتنی غلط بات تھی۔ آپ علی گڑھ کی بات کرتے ہیں۔ بہت لمبا عرصہ گذر جائے تو بعد میں آنے والے ایک عام سیّد کے لیے بھی اپنے پیشرو سیّد کے بتائے ہوئے سیدھے راستہ پر چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یادش بخیر ایک زمانہ کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں کسی نے مشہور کر

رکھا تھا کہ اگر خود سرسیّد بھی دوبارہ پیدا ہو کر علی گڑھ کے وائس چانسلر بن جائیں تو شاید وہ اس یونیورسٹی کو چلا نہ پائیں۔ حالانکہ ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ ایک ہوائی جہاز چلانے والا سرکار تک چلا سکتا ہے بلکہ ہوائی جہاز سے کہیں زیادہ بہتر طور پر سرکار چلا لیتا ہے۔ لیکن ان دنوں یونیورسٹیوں کو چلانے کے لیے ایک الگ ہی مہارت درکار ہوتی ہے۔ نواب علی یاور جنگ پر جب اُن کے دورِ وائس چانسلری میں قاتلانہ حملہ ہوا تھا تو غالباً آر۔ کے۔ لکشمن نے ایک کارٹون بنایا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ مستقبل میں دانشوروں اور ماہرین تعلیم کو یونیورسٹیوں کا وائس چانسلر نہ بنایا جائے بلکہ اس کام کے لیے پہلوانوں اور باکسروں (Boxers) کی خدمات حاصل کی جائیں۔

وائس چانسلروں کی بات چلی ہے تو ہاشم علی اختر یاد آ گئے جو علی گڑھ کے وائس چانسلر بننے سے پہلے عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ انھوں نے ایک مزے دار لطیفہ بنایا تھا کہ ایک وائس چانسلر مرنے کے بعد دوسری دنیا میں پہنچا تو اس سے پوچھا گیا کہ وہ نیچے کی دنیا میں کیا کام کرتا تھا۔ وائس چانسلر نے کہا ''حضور! ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر تھا''۔ پوچھا گیا ''کتنی معیادوں یعنی (Terms) کے لیے؟'' جواب ملا ''جی صرف ایک معیاد کے لیے''۔ حکم ہوا ''اسے جنّت میں جانے دو کیونکہ دوزخ کا عذاب یہ نیچے کی دنیا میں پہلے ہی جھیل چکا ہے''۔ حُسنِ اتفاق کہ اُس وقت وہاں ایک اور وائس چانسلر جنّت میں جانے کے خواہشمندوں کی قطار میں کھڑا تھا جو پہلے وائس چانسلر کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جب پہلا وائس چانسلر جنّت میں جانے لگا تو دوسرا وائس چانسلر بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ جنّت کے داروغہ کی نظر پڑی تو موصوف سے پوچھا ''اجی قبلہ! آپ کہاں چلے؟''۔ بولے ''جی۔ وہ میں بھی نیچے کی دنیا میں وائس چانسلر رہ چکا ہوں''۔ پوچھا گیا ''کتنی معیادوں کے لیے؟''۔ جواب ملا۔ ''دو معیادوں کے لیے۔'' اس پر حکم صادر ہوا ''تب تو اسے لیجا کر دوزخ میں ڈال دو کیونکہ اسے تو دوزخ میں رہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔''

بہر حال سید حامد نے وائس چانسلری کی اور خوب دھڑلّے سے کی۔ دھڑلّے کا مطلب یہ کہ جب تک علی گڑھ کے وائس چانسلر رہے اپنی جان کو ہتھیلی پر سجائے رکھا۔ آج تک کسی نے اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھنے کا اتنا لمبا ریکارڈ قائم نہ کیا ہوگا۔ بڑے ہنگامے ہوئے، گولی چلی، مفاد پرستوں کے مفادات پر ضرب کاری لگی۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی بند ہوگئی۔ مگر جب کھلی تو ایسے کھلی کہ بند ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ طلبہ ہیں کہ چپ چاپ پڑھے چلے جا رہے ہیں اور اساتذہ

ہیں کہ پڑھائے چلے جا رہے ہیں (پٹی نہیں بلکہ سچ مچ کی کتابیں)۔ بظاہر مرنجان مرنج دکھائی دینے والے سید صاحب کے عزم، حوصلے اور پختہ ارادے کی یہ ایک چھوٹی سے مثال تھی جو یونیورسٹی کے حق میں بہت بڑی ثابت ہوئی۔

سیّد صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ نہایت اصول پرست اور ایماندار آدمی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ایمانداری کا کوئی سرٹیفکیٹ اپنے پاس نہیں رکھتے۔ یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ پچھلے دنوں احباب کی محفل میں ایک سیاسی رہنما کی دیانت داری اور ایمانداری پر کسی نے انگلی اٹھائی تو مذکورہ رہنما کے حامی نے برملا کہا ''آپ تو ان کی ایمانداری پر کوئی شک کر ہی نہیں سکتے کیونکہ ان پر اب تک بدعنوانیوں اور گھوٹالوں کے دس مقدمے چل چکے ہیں اور ماشا اللہ وہ ان سب سے باعزت بری ہو چکے ہیں۔ آپ کو ان کی ایمانداری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہیے۔''

ہمارے سیّد صاحب کی ایمانداری میں بس اتنی سی کسر رہ گئی ہے کہ اپنی ایمانداری کا کوئی ثبوت اپنے پاس نہیں رکھتے حالانکہ زمانہ بڑا خراب ہے۔ ثبوت کے بغیر کسی بات کو نہیں مانتا۔ سید صاحب اُصول پرست ایسے ہیں کہ کسی دوست کے کام کے لیے ان سے سفارش کرو تو پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ کہیں دوست کا کام کرنے سے ان کے کسی دشمن کو نقصان تو نہیں پہنچے گا۔ ایک بار دشمن کی طرف سے سیّد صاحب مطمئن ہو جائیں تو تب کہیں جا کر وہ دوست کے فائدے کی بات سوچتے ہیں۔ اللہ اللہ کیا اُصول پسندی ہے۔ حالانکہ فی زمانہ اصولوں کو توڑنا ہی سب سے اچھا اُصول سمجھا جاتا ہے بلکہ جو شخص اُصولوں کو نہیں توڑتا لوگ اُسے ہی توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ سید صاحب کسی وجہ سے اب تک نہیں ٹوٹے یہ ایک الگ بات ہے۔ پھر پائیداری بھی تو ایک چیز ہوتی ہے۔ خوب یاد آیا ایک زمانہ میں مجھے احباب کے کاموں کے سلسلہ میں صاحبانِ اقتدار سے سفارش کرنے کا ہوکا سا تھا۔ دن بھر دوستوں کے کاموں کے لیے مارا مارا پھرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب اپنے لیے مارا مارا پھرتا ہوں۔ جب سیّد صاحب اسٹاف سلیکشن کمیشن کے صدر نشین تھے تو ایک دوست نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اُن کے بھائی کے تقرر کے سلسلہ میں سیّد صاحب سے سفارش کر دوں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ سیّد صاحب سفارش کو ناپسند کرتے ہیں میں نے اپنے دوست کے بھائی کی سفارش اُن سے کر دی۔ انھوں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ کاغذ کو میرے ہاتھ سے لے کر رکھ لیا اور حسبِ عادت کوئی وعدہ نہ فرمایا۔ پھر یوں ہوا کہ میرے دوست کا تبادلہ

ٹریونیڈرم ہو گیا اور بعد میں وہ وہاں سے کسی خلیجی ملک میں چلے گئے۔ گویا برسوں اُن سے کوئی ربط ضبط نہ رہا۔ ابھی پچھلے ہفتہ کی بات ہے۔ اُن سے اچانک ملاقات ہوگئی تو دنیا جہان کی باتیں ہوئیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں اُن کے بھائی کے تقرر کی بات کو تقریباً بھول چکا تھا۔ خود ہی یاد دلایا ''بھئی! آپ کو یاد ہوگا کہ کئی برس پہلے آپ نے میرے بھائی کے سلسلہ میں سیّد حامد صاحب سے سفارش کی تھی۔'' میں نے کہا ''مگر میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ سیّد صاحب سفارش کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں''۔ اس پر میرے دوست نے کہا '' آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ بھئی! میرے بھائی کا تقرر تو تبھی ہو گیا تھا۔ گردشِ روزگار نے مہلت ہی نہ دی کہ آپ کو یہ خوشخبری سناتا۔ ماشاﷲ اب تک اُسے چار ترقیاں بھی مل چکی ہیں۔ کبھی سید صاحب سے ملاقات ہو تو شکریہ ادا کر دیجئے۔'' میں نے کہا ''بھیا! اب تو تمہارا بھائی چند برسوں میں ریٹائر ہونے والا بھی ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اب تو اس کے ریٹائر ہونے کے بعد ہی سیّد صاحب کا شکریہ ادا کرنا مناسب ہوگا۔'' ڈاکٹر خلیق انجم کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس تہنیتی تقریب کے انعقاد کے ذریعہ مجھے سیّد صاحب کا شکریہ ادا کرنے کا موقع عطا فرمایا ورنہ میرے دل میں ایک خلش سی رہ جاتی۔ بہرحال یہ ایک مسلّمہ بات ہے کہ سید صاحب کسی کی سفارش نہیں سنتے۔

اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے مجھے کتابی چہروں، کتابی باتوں اور کتابی حوالوں سے ہمیشہ اُنس رہا ہے۔ مگر مجھے آج تک ایسا کوئی فرد نہیں ملا جو زبانی گفتگو بھی کرے تو یوں معلوم ہو جیسے کتاب پڑھ کر بول رہا ہے۔ میں نے سیّد صاحب کے علاوہ کسی اور کو مطبوعہ گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ بخدا جب وہ تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں، چاہے وہ انگریزی میں ہو یا اُردو میں، ایسی نپی تلی، مرصّع اور رچی سجائی زبان بولتے ہیں کہ مجھے تو ان کی تقریر میں جابجا فُل اسٹاپوں اور کاموں (Commas) سے لے کر سیمی کولنوں (Semi Colons) تک کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ سیّد صاحب کے قول اور فعل میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ جو زبان وہ بولتے ہیں وہی زبان لکھتے بھی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہر دو صورتوں میں اُن کے قاری یا اُن کے سامع کو بسا اوقات اُنھیں پڑھتے یا سُنتے وقت ڈکشنری دیکھنے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے (کم از کم مجھے تو آتی ہے)۔ کتاب پڑھتے وقت ڈکشنری دیکھنے کو میں بُرا نہیں سمجھتا لیکن یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ ایک شخص تقریر کر رہا ہو اور لوگ اُس کے سامنے بیٹھے ڈکشنریوں کے صفحات الٹتے پلٹتے

رہیں۔اس سے تقریر کی روانی بھی متاثر ہوتی ہے۔لگے ہاتھوں اس بات کا انکشاف کرتا چلوں کہ پچھلے دنوں میں نے سیّد صاحب کا ایک ایسا مضمون پڑھا ہے جسے پڑھنے کے دوران میں مجھے ڈکشنری دیکھنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔اس پر میں نے اپنے ایک دوست سے کہا "مجھے لگتا ہے کہ یا تو میری نجی لیاقت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے یا پھر سیّد صاحب ہی عام فہم زبان لکھنے لگے ہیں"۔ بولے "مجھے تو اوّل الذکر کا اندیشہ بالکل ہی کم اور آخر الذکر کا امکان زیادہ نظر آتا ہے۔" خدا کرے ایسا ہی ہو۔

آخر میں اُس بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کا ذکر اُصولاً سب سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔ ہمارے سیّد صاحب نہایت بے لوث، بے نیاز اور صوفی منش انسان ہیں۔ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے نہ تو گورنر بننے کی کوشش کی اور نہ ہی سفیر بننا گوارا کیا۔حد تو یہ کہ پارلیمنٹ میں جانے کی کوشش بھی نہیں کی حالانکہ ایرے غیرے تک اب وہاں جانے لگے ہیں بلکہ وہی جارہے ہیں۔علی گڑھ کی وائس چانسلری سے سبکدوش ہوئے تو حکیم عبدالحمید کی سرپرستی میں ہمدرد کے تعلیمی پروگرام سے وابستہ ہو گئے۔اب اُن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملک اور ملت کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں صرف ہوتا ہے اور یہ ان کی کوئی معمولی دین نہیں ہے۔ایک بار وائس چانسلر بننے کے بعد اُنھوں نے دوبارہ وائس چانسلر بننا بھی پسند نہ کیا۔اس لیے کہ ہاشم علی اختر کے بنائے ہوئے لطیفہ کو انھوں نے اپنی گرہ میں کس کر باندھ لیا ہے۔مانا کہ اب وہ ہمدرد یونیورسٹی کے چانسلر کے جلیل القدر عہدہ پر فائز ہو گئے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اس سے ان کی عام تعلیمی تحریکوں اور سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کیونکہ وائس چانسلری چلانے کے لیے آدمی میں جن بے پناہ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے شاید وہ چانسلری چلانے کے لیے درکار نہیں ہوتیں بلکہ صلاحیتوں کے نہ ہونے کو اور بھی مستحسن سمجھا جاتا ہے۔

سیّد صاحب نے ملت کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کا جو بیڑہ اٹھایا ہے وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی طرف دھیان دینے کی ہم جیسوں کو کبھی توفیق عطا نہیں ہوتی۔اس لیے کہ گھاٹے کا سودا ہے۔یہ اور بات ہے کہ گھاٹے کے اس سودے میں قوم کا فایدہ مضمر ہے۔لیکن ہم جیسوں کو قوم کے فائدے سے کیا مطلب۔خدا تادیر سیّد صاحب کو ہمارے درمیان تندرست، توانا اور سلامت رکھے تاکہ ہم لوگ تو پوری بے فکری کے ساتھ کرنسی والی دولت کو سمیٹتے رہیں

اور سید صاحب علم والی دولت کو آنے والی نسلوں میں بانٹتے رہیں۔ تقسیمِ کار ہمیشہ اچھی چیز ہوتی ہے۔ ذرا دیکھئے تو سہی مضمون ختم ہونے لگا ہے تو سیّد صاحب کے تعلق سے کتنی ہی اچھی اچھی باتیں ذہن میں آنے لگی ہیں مگر وہ جو غالب نے کہا۔ ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

(سید حامد صاحب کے چانسلر ہمدرد یونیورسٹی مقرر ہونے کی خوشی میں ۱۱ر ستمبر کو دہلی کے اُردو گھر میں انجمن ترقی اُردو ہند کی طرف سے منعقدہ ایک تہنیتی تقریب میں پڑھی گئی تحریر)

روزنامہ ''سیاست'' (ستمبر ۱۹۹۹ء)

ڈاکٹر شان الحق حقّی کی بھول

غالب کے بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے لئے پچھلے ہفتہ پاکستان سے ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر شان الحق حقّی اور افتخار احمد عدنی دہلی تشریف لے آئے تھے۔ ایک زمانہ میں پاکستان سے ادیبوں کا آنا جانا کچھ زیادہ ہی ہوا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ خاصے لمبے عرصہ بعد پاکستانی ادیب ہندوستان آئے ہیں۔ تینوں پاکستانی دانشوروں سے ہماری پرانی یاد اللہ ہے۔ جمیل جالبی اور ڈاکٹر شان الحق حقّی کو ہم اپنے کرم فرماؤں میں شمار کرتے ہیں۔ لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ مشفقی و مخدومی شان الحق حقّی کا ذکر مقصود ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کی صحبت میں وقت گذار کر آدمی کو جو لطف میسّر آتا ہے وہ کسی اور بات میں نہیں آتا۔ ماشا اللہ اب اسّی برس کے ہونے والے ہیں لیکن باتیں بدستور نوجوانوں کی سی کرتے ہیں (بعض اوقات تو حرکتیں بھی) تنقید نگار، محقق، مترجم، افسانہ نگار، شاعر، لغت نویس، مزاح نگار، بچوں کے ادیب اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ ادب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں اُنھوں نے اپنے کمالات نہ دکھائے ہوں۔ لفظوں کے ایسے مزاح دان ہیں کہ کسی لفظ کی پرتیں کھولنے لگتے ہیں تو لفظ کے سارے گوشے چمک اُٹھتے ہیں۔ سترہ برس تک ترقی اُردو بورڈ پاکستان کے سکریٹری رہ چکے ہیں، نشر و اشاعت سے بھی ان کا پُرانا رشتہ ہے۔ اُردو اور انگریزی کے علاوہ ہندی اور سنسکرت پر بھی گہرا عبور رکھتے ہیں۔ شان الحق حقّی نے جہاں بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ کیا ہے وہیں چانکیہ کے ارتھ شاستر کا سنسکرت سے براہ راست نثری ترجمہ کیا ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس کے لیے شان الحق حقّی ادب کی تاریخ

میں ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ شان الحق حقّی خالص دہلی والے ہیں اور دہلی آ کر یوں خوش ہوتے ہیں اور یہاں اس طرح دن گذارتے ہیں جیسے وہ کبھی پاکستان نہ گئے ہوں ۔ ان کی علیت اور بصیرت کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ ہم یہاں خصوصیت کے ساتھ اُن کی غائب دماغی اور بھلکّو پن کے کچھ واقعات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ برصغیر کے اُردو ادب میں ہم نے ان سے بڑا بھلکڑ کوئی اور نہیں دیکھا۔ ان کی غائب دماغی کے تو ہم خود بھی چشم دید گواہ رہ چکے ہیں۔ کراچی کے خوبصورت علاقہ ''ڈیفنس'' میں اُن کے مکان سے باہر نکلے تو پتہ چلا کہ وہ اپنی موٹر کی چابی بھول گئے ہیں۔ کار کی چابی لانے کے لیے گھر کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگے تو معلوم ہوا کہ اب کی بار مکان کی چابی کہیں کھو بیٹھے ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ کہ چابیاں بڑی مشکل سے دوچار منٹ کے وقفہ میں ہی کھوئی گئی تھیں۔ چابیاں تو خیر بعد میں مل گئیں لیکن ان کی تلاش میں جو جستجو کرنی پڑی وہ اب تک یاد ہے۔ کار کی چابی تو خیر کار کے دروازے میں ہی لٹکی ہوئی تھی کیونکہ اُنھوں نے کار کا دروازہ تو کھولا لیکن وہاں سے چابی نکالنا بھول گئے۔ ان کے اس مخصوص حافظہ کی وجہ سے ہم بہت محتاط رہتے ہیں۔ ان سے دہلی اور کراچی میں کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں لیکن پھر بھی خدشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں ہمیں بھول نہ گئے ہوں۔ چنانچہ اس بار ملے تو ہم نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنا نام بھی بتا دیا۔ بہت ناراض ہوئے'' آپ جیسے مزاح نگاروں نے میرے حافظہ کے بارے میں من گھڑت قصے مشہور کر رکھے ہیں۔ میں بھولتا ضرور ہوں اور وہی بات بھولتا ہوں جس کا بھلایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں آپ کو بھول جاؤں گا۔'' پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں،، ہم نے انھیں یاد دلایا کہ ۱۹۹۲ میں اُن کی پچھترویں سالگرہ کے موقع پر جو یادگاری مجلّہ شائع کیا گیا تھا وہ ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ یہ سنتے ہی انھوں نے اپنا بریف کیس کھولا اور یہ کہتے ہوئے اس یادگاری مجلّہ کا نسخہ ہمارے حوالہ کیا کہ اس مجلّہ کی ایک ہی کاپی میرے پاس رہ گئی ہے۔ یہ آپ کی نذر ہے۔ ہم نے شکریہ ادا کرتے ہوئے مجلّہ کا نسخہ اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔ آدھے گھنٹہ تک وہ مختلف لوگوں سے ملتے رہے۔ باتوں باتوں میں کسی نے پھر اس یادگاری مجلّہ کا ذکر کر دیا۔ حقّی صاحب نے کہا'' بھئی! اس مجلّہ کا ایک ہی نسخہ میرے پاس رہ گیا تھا۔ ابھی ابھی میں نے یہاں کسی صاحب کو دیا ہے۔ اُن کا نام یاد آ جائے تو بتاؤں گا۔ اُن سے لے کر پڑھ لیجئے۔'' پھر ہماری طرف دیکھ کر پوچھا'' کیا آپ کو

یاد ہے کہ میں نے یہ مجلّہ کس کو دیا ہے؟''۔ہم نے جان بوجھ کر لاعلمی ظاہر کی کیونکہ ان کے کمزور حافظہ کا اتنا فائدہ تو ہمیں اٹھانا ہی تھا۔ ہم نے پھر ان کی کمزور یادداشت کا مسئلہ اٹھایا تو بولے ''مشتاق احمد یوسفی، مشفق خواجہ اور دیگر احباب کو جب بھی غائب دماغی کی کوئی مثال ملتی ہے تو اسے مجھ سے منسوب کر دیتے ہیں جب کہ میں اتنا بھلکّو بھی نہیں ہوں''۔

ڈاکٹر شان الحق حقّی جب بھی اپنی غیر حاضر دماغی کی تاویلیں پیش کرتے ہیں تو ہمیں مشتاق احمد یوسفی کے حسبِ ذیل جملے یاد آتے ہیں۔''از بسکہ حقّی صاحب تحقیق کے مردِ میدان ہیں۔انھیں قدیم الفاظ و واقعات کے علاوہ کوئی اور بات مشکل سے یاد رہتی ہے۔مثلاً وہ یہ فوراً بتادیں گے کہ ''تیئں'' کب متروک ہوا۔غالبؔ کے کلام میں آئینہ کتنی مرتبہ آیا ہے۔غالب کے مکان کا پتہ اور بقایا کرایہ کتنا تھا۔لیکن اپنے مکان کا نمبر بتانے کے لئے انھیں بیگم سے تبادلۂ شکوک کرنا پڑتا ہے۔'' بہرحال شان الحق حقّی سے متعلق یادگاری مجلّہ کی جب ہم نے ورق گردانی شروع کی تو اس میں ہمیں بیگم شان الحق حقّی (سلمیٰ حقّی) کا وہ مضمون بھی نظر آیا جو انھوں نے اپنے شوہر نامدار کے بارے میں لکھا ہے۔اس میں اُنھوں نے حقّی صاحب کی غائب دماغی کے ایسے دلچسپ واقعات بیان کئے ہیں کہ کوئی بھی مزاح نگار بھولنے کے ایسے طبعزاد واقعات اختراع نہیں کر سکتا۔اب بیگم سلمیٰ حقّی کی زبانی ہی ان کی غائب دماغی کے واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

''ایک دن میرے ساتھ کسی دوست کے گھر ملنے گئے مگر اب آواز دیں تو کیونکر دیں کہ دروازے تک پہنچتے پہنچتے ان کا نام بھول گئے تھے۔اب پریشان کھڑے ہیں 'بتاؤ کیا کہہ کر پکاروں کس کا گھر ہے۔بھئی بھلا سا نام ہے'۔مگر وہ بھلا سا نام یاد نہ آنا تھا نہ آیا اور درِ دوست تک جا کر واپس چلے آئے۔اکثر ایسا ہوا کہ گھر سے جانے کے لئے نکلے اور تھوڑی دیر میں پھر چلے آرہے ہیں کہ بھئی تم نے یاد نہیں دلایا کہ میں نے ٹائی نہیں باندھی یا یہ کہ 'یہ بھی کوئی بات ہے کہ مجھے یہ نہ بتاؤ کہ تم نے شیو نہیں کیا ہے۔''

ایک محفل میں ان کے جوتوں پر جو نظر گئی تو دیکھا کہ دونوں پاؤں میں دو مختلف ڈیزائن کے جوتے ہیں۔یہ بسا غنیمت تھا کہ تھے دونوں ایک ہی رنگ کے۔

دفتر میں بیٹھے تھے۔چائے کی کشتی منگائی۔پیالیاں حسبِ دستور دو تھیں اور پینے والے یہ ایک۔شکر ڈال کر ایک پیالی چائے بنائی اور گھولتے رہے، گھولتے رہے مگر جب گھونٹ لیا تو پھیکا

نکلا۔تعجب ہوا کہ شکر تو ڈالی تھی پھر چائے کیوں پھیکی رہی۔آخر یہ انکشاف ہوا کہ شکر دوسری پیالی میں ڈالی تھی اور چائے دوسری پیالی میں بنائی تھی۔

ایک عزیز دوست سے روایت ہے کہ جب وہ ان سے ملنے ان کے دفتر گئے تو دیکھا کہ پریشان سے کچھ تلاش کرنے کے انداز میں اِدھر اُدھر میز پر ہاتھ مار رہے ہیں اور ان سے ڈھنگ سے مخاطب ہونے کی نوبت نہیں آئی۔انھوں نے پوچھا ''بھئی! کیا ڈھونڈ تے ہو؟''۔ بولے ''گھنٹی کھوگئی ہے۔'' اُنھوں نے مشورہ دیا ''تو پھر پریشانی کی کیا بات ہے چپراسی کو بلا کر کہو وہ ڈھونڈ دے گا۔'' بولے ''اسی کو بلانے کے لئے تو ڈھونڈ رہا ہوں گھنٹی''۔

ابھی گذشتہ سال کی بات ہے۔رات کو میرے ساتھ کہیں باہر گئے۔پھر مجھے پہنچانے کے لئے گھر کے دروازے تک آئے۔گاڑی روکی اور کہا کہ تم اُتر جاؤ مجھے اُردو بورڈ جانا ہے۔ میں نے خدا حافظ کہا اور اُتر گئی۔دوسرے دن یہ واردات سنائی کہ تم کو گھر پر اُتار کر جو میں چلا تو میں نے تم سے پھر باتیں کرنی شروع کر دیں۔اور گاڑی آگے بڑھتی رہی تو مجھے تعجب ہوا کہ تم نے میری بات کے جواب میں ہوں ہاں بھی نہ کی۔گردن موڑ کر دیکھا تو تم تھیں ہی نہیں''۔

چوراہوں کے سگنل رات کو ساڑھے دس گیارہ بجے بند ہو جاتے ہیں مگر ان با اُصول کو دیکھا گیا کہ چوراہے پر گاڑی روکے کھڑے ہیں سبز بتی کے انتظار میں۔

ایک مرتبہ ایک بس چوراہے پر نظر آئی۔آپ نے اپنی گاڑی کو اس کے پیچھے روک دیا کہ یہ چلے تو آگے بڑھیں گے۔دوسری گاڑیاں اِدھر اُدھر سے راستہ بنا کر نکلتی رہیں اور یہ بس کے کھسکنے کے منتظر رہے۔آخر کسی نے گزرتے ہوئے مخاطب ہو کر کہا آپ بس کے چلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔یہ بس تو خراب ہوئی کھڑی ہے۔

اپنا بڑا سا بیگ گاڑی کی ڈکی پر ٹکایا اور پھر کچھ دیر انجن دیکھنے اور پانی ڈلوانے میں لگے تو بیگ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہو چکا تھا۔گاڑی میں بیٹھ یہ جا وہ جا ایسی تیز رفتاری سے روانہ ہوئے کہ محلّہ کے خیر خواہ غُل مچاتے دوڑے، پیچھے چلنے والی گاڑیوں نے ہارن دیئے مگر یہ سب سے بے خبر اپنی رفتار سے چلتے رہے اور بیگ بیچارہ سارے راستے کی توجہ کا مرکز بنا ان کی بے نیازی کا نوحہ پڑھتا ساتھ ساتھ چلتا رہا۔آخر جب گاڑی وکٹوریہ روڈ کے چوراہے پر رُکی تو برابر والی گاڑی سے ایک صاحب نے سر نکال کر کہا جناب آپ کا بیگ خبر لیجئے گرا ہی چاہتا ہے۔ایک مرتبہ اسی

طرح گاڑی کی چھت پر کوئی موٹی سی کتاب ٹکائی اور چل کھڑے ہوئے۔ بچّوں نے بڑھ کر آواز دے کر متوجہ کرنا چاہا مگر بے سود۔ آخر ایک بچّے نے بڑھ کر چلتی گاڑی کی چھت پر سے وہ کتاب اُٹھالی۔ واپسی پر کتاب کمرہ میں رکھی دیکھی تو بولے ارے یہ تو یہیں ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں اپنے ساتھ لے گیا اور اسے گاڑی میں ڈھونڈھ رہا تھا۔

بیگم سلمیٰ حقّی نے ان کے بھلکڑ پن کے اور بھی واقعات لکھے ہیں لیکن ہم ان ہی واقعات پر اکتفا کریں گے۔ غرض ایسے بُھلکڑ آدمی ہیں ہمارے حقّی صاحب۔ لیکن ادب کے معاملہ میں وہ کسی بھول کے قائل نہیں ہیں۔ ادبی واقعات اور ادب سے متعلق ساری ضروری تفصیلات انھیں زبانی یاد رہتی ہیں۔ اصل میں ادب سے ان کا سروکار کچھ اتنا گہرا ہے کہ ہر دم اپنے حافظہ کو اسی میں لگائے رکھتے ہیں۔ نتیجہ میں اپنی شخصی زندگی کی بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں۔ انھوں نے ہمیں اپنا یادگاری مجلّہ دیتے ہوئے یہ تو کہا تھا کہ بہت سے لوگ غائب دماغی کے فرضی واقعات ان سے منسوب کر دیتے ہیں لیکن مجلّہ دیتے وقت یقیناً انھیں یہ یاد نہ رہا ہوگا کہ اس مجلّہ میں بیگم حقّی کا بھی ایک مضمون شامل ہے جس میں ان کی بھول کے بے شمار واقعات درج ہیں۔

شان الحق حقّی اکثر کہتے ہیں کہ بھول کے بے شمار نقصانات ہیں لیکن ایک فائدہ یہ ہے کہ بہت سی بدمزہ باتوں کا بار ذہن سے اُتر جاتا ہے اور یہ فائدہ سارے نقصانات پر بھاری ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۹۹۶)

بھیشم ساہنی بھی چلے گئے

ہندی کے مایہ ناز ادیب بھیشم ساہنی پچھلے ہفتہ گذر گئے۔ اگر چہ وہ ہندی کے ادیب کی حیثیت سے جانے جاتے تھے لیکن وہ اصل میں پورے ہندوستانی ادب کا بہت بڑا نام تھے۔ ایک ادیب جب کسی زبان میں اپنی بھرپور تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوالیتا ہے اور اپنے ادب کو انسان کے سچے اور اعلیٰ وارفع جذبوں کا آئینہ دار بنالیتا ہے تو پھر وہ کسی زبان کا ادیب باقی نہیں رہتا بلکہ عالمی ادب کا حصہ بن جاتا ہے۔ بھیشم ساہنی نے اپنی تحریروں کے ذریعہ یہ مرتبہ حاصل کرلیا تھا۔ وہ بڑی موہنی سی شخصیت کے مالک تھے۔ کم آمیز، کم گو مگر نہایت باوقار ہستی تھے۔ ہمیں وہ بہت اچھے لگتے تھے اور انھیں دور سے دیکھ کر بھی ایک عجیب وغریب مسرت حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک لمبے عرصہ تک ہم انھیں دور ہی سے دیکھ کر خوش ہولیا کرتے تھے۔ تیس برس پہلے ہم نے انھیں دہلی کے سری رام سنٹر کی ایک تہذیبی محفل میں دیکھا تھا۔ (ادبی محفلوں میں وہ ذرا کم ہی جاتے تھے)۔ ہم پچھلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بھیشم ساہنی بڑی خاموشی کے ساتھ آکر ہمارے برابر والی خالی کرسی پر بیٹھ گئے۔ تقریب کے منتظمین میں سے کسی نے آکر انھیں اگلی صف میں لے جانے کی کوشش کی مگر وہ راضی نہ ہوئے۔ بولے ''میں یہیں ٹھیک ہوں۔ آگے بیٹھ کر میں محفل کو اس طرح انجوائے نہ کرسکونگا جیسے یہاں سے کرسکتا ہوں''۔ ان کی عادت تھی کہ محفلوں میں وہ چپ چاپ آکر پچھلی صفوں میں بیٹھ جاتے تھے۔ کبھی نمایاں ہونے یا اگلی صفوں تک جانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ یہ ادا اُن کی سادگی اور منکسر المزاجی کی علامت تھی۔ تقریباً پانچ برسوں تک ہم انھیں

دور ہی سے دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ ایک بار سوویت سفارت خانہ کی ایک محفل میں ایک روسی سفارت کار نے کھانے کی میز پر اُن سے ہمارا تعارف کرایا تو بولے ’’کہیں آپ وہ تو نہیں ہیں جو طنز و مزاح لکھا کرتے ہیں‘‘۔ ہم نے کہا ’’بھیشم جی! بدقسمتی سے وہ میں ہی ہوں مگر آج میں اپنے آپ کو اس اعتبار سے خوش قسمت سمجھ رہا ہوں کہ آپ بھی میری چیزیں پڑھ لیتے ہیں‘‘۔ یہ سنتے ہی انہوں نے ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ اپنا وہ ہاتھ جس سے وہ کھانا کھا رہے تھے مصافحہ کے لئے آگے بڑھا دیا۔ اس کے جواب میں ہم نے احتراماً اپنا بایاں ہاتھ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے ان کے دائیں ہاتھ کی کلائی کو چھو کر مصافحہ کی رسم ادا کی۔ پھر انہوں نے کرشن چندر، کنہیا لال کپور اور فکر تونسوی سے اپنی دوستی کا ذکر کرتے ہوئے تقسیم ہند سے پہلے کے زندہ دلان لاہور کو یاد کیا۔ کہنے لگے ’’اُردو زبان کی شائستگی نے اس کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو بہت مالا مال کیا ہے‘‘۔ اس پہلی شخصی ملاقات کے بعد بھیشم ساہنی جب بھی ملے اپنی دلنواز شفقتوں کے ساتھ ہی ملے۔

۸/ اگست ۱۹۱۵ء کو ان کی پیدائش راولپنڈی کے ایک متوسط گھرانے میں ہوئی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے لاہور سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔ تقسیم ہند کے بعد انہوں نے پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ سے انگریزی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۰ء میں دہلی کے ذاکر حسین کالج میں انگریزی کے لکچرار بن گئے۔ اس کالج سے ان کا تعلق ۱۹۸۰ء تک رہا۔ درمیان میں ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۳ء تک انہوں نے ماسکو میں بحیثیت مترجم کام کیا اور روس کے کئی کلاسیکی ادیبوں کی کہانیوں کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ ۱۹۴۲ء میں انہوں نے ’’بھارت چھوڑو‘‘ تحریک میں بھی حصہ لیا تھا۔ آزادی سے پہلے اگرچہ انہوں نے کانگریس پارٹی کے ایک کارکن کی حیثیت سے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا تھا (وہ راولپنڈی ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بھی رہے) لیکن آزادی کے بعد اپنے بڑے بھائی اور مشہور فلمی اداکار بلراج ساہنی کے زیر اثر کمیونسٹ پارٹی سے قریب ہو گئے۔ کچھ عرصہ ممبئی جا کر ’’اپٹا‘‘ سے بھی وابستہ ہوئے اور کئی ڈراموں میں کام کیا۔ ۱۹۵۳ء میں ان کی ہندی کہانیوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ ان کا شہرہ آفاق ناول ’’تمس‘‘ جس پر بعد میں مقبول عام ٹیلی ویژن سیریل بھی بنایا گیا، ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ اس پر انھیں ۱۹۷۸ء میں ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ بھی ملا۔ انہوں نے ہندی ادب کو کہانیوں کے نو مجموعے اور سات ناول دیئے۔ بعض کامیاب ڈرامے لکھنے کے علاوہ انہوں نے انگریزی میں اپنے بڑے

بھائی بلراج ساہنی کی سوانح عمری بھی لکھی۔ پدم بھوشن کے علاوہ بھیشم ساہنی کو کئی قومی اور بین الاقوامی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ بھیشم ساہنی تقسیم ہند سے پہلے کے لاہور کی ملی جلی تہذیب کے پروردہ تھے۔ رواداری، بھائی چارہ، سیکولرازم، اخوت اور امن و آشتی کے جس مسلک کو انہوں نے اپنی نوجوانی میں اپنایا تھا اُسے آخری وقت تک اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ تقسیم ہند اور اس کے بعد کے عرصہ میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت، عصبیت اور تنگ نظری کے خلاف انہوں نے ہمیشہ اپنی آواز بلند کی۔

بھیشم ساہنی اگر چہ پنجابی تھے لیکن جب ہندی یا ہندوستانی بولتے تھے تو ان کے لہجہ سے کبھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ پنجابی ہیں حالانکہ بیشتر پنجابی اصحاب انگریزی بھی پنجابی لہجہ میں بولتے ہیں۔ اب یاد آرہا ہے کہ ہم نے انھیں کبھی خود پنجابی بولتے ہوئے نہیں سنا۔ تین دہوں سے دہلی میں رہنے کے باعث بے شمار پنجابی دوستوں سے ہماری ملاقات رہی ہے بلکہ ہمارے دوستوں کی اکثریت پنجابیوں پر ہی مشتمل ہے۔ ہم تو مذاق میں دہلی کو بھی پنجاب کا ہی ایک شہر قرار دیتے ہیں۔ پنجابی، چاہے پاکستان کا ہو یا ہندوستان کا، اچھی بھلی اُردو یا ہندی بولتے بولتے اچانک پٹری بدل کر پنجابی، بولنے پر اُتر آتا ہے اور رُکنے کا نام نہیں لیتا۔ اسے یہ احساس ہی نہیں رہتا کہ اس کا مخاطب پنجابی جانتا بھی ہے یا نہیں۔ شروع شروع میں ہمیں بڑی بے چینی ہوتی تھی لیکن اب تو ماشاء اللہ ہم بھی پٹریاں بدلنے لگے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں جبڑوں میں بڑا درد ہوتا ہے۔ بھیشم ساہنی نے زبان بولتے ہوئے کبھی پٹری نہیں بدلی حالانکہ وہ انگریزی، ہندی، اُردو اور پنجابی چاروں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ پتہ نہیں انہوں نے کبھی اُردو میں بھی لکھا یا نہیں تاہم گذشتہ لاہور کو یاد کرتے ہوئے وہ ''ادبی دنیا'' ''ادب لطیف'' اور ''چترا'' جیسے اُردو رسالوں کا ذکر کرنے کے علاوہ پطرس بخاری، منٹو، فیض اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے خواہش کی کہ ہم اُنھیں پاکستان کے کچھ رسالے پڑھنے کے لئے دیں۔ ہم نے عطاء الحق قاسمی کے ''معاصر'' اور اظہر جاوید کے ''تخلیق'' کے کچھ شمارے انھیں دیئے۔ چند دن بعد ملے تو کہنے لگے ''میں نے ان رسالوں میں پاکستانی قلم کاروں کی اُردو کہانیاں غور سے پڑھیں، یہ جان کر حیرت ہوئی کہ پاکستان کی اُردو پر پنجابی زبان کا غلبہ بڑھتا جارہا ہے۔ اگر چہ میں خود پنجابی ہوں لیکن اُردو کو اُردو کی طرح برقرار رکھنے کا قائل ہوں کیوں کہ ہر زبان کی اپنی ایک الگ شناخت

اورا لگ خاصیت ہوتی ہے۔ کیا عجب کہ کچھ عرصہ بعد پاکستان کی اُردو اور ہندوستان کی اُردو میں بہت زیادہ فرق آجائے''۔ اس بات سے اندازہ لگایئے کہ وہ کتنے انہماک سے مطالعہ کرتے تھے۔

دہلی کی ایک تنظیم ''آرگنائزیشن آف انڈراسٹینڈنگ اینڈ فریٹرنٹی'' پچھلے کئی برسوں سے مختلف زبانوں کے ادیبوں اور صحافیوں کوایوارڈ دیا کرتی ہے۔ ہم اس ایوارڈ کمیٹی کے کنوینز ہیں۔ اس کمیٹی میں کئی نامی گرامی ہستیاں جیسے کے پی ایس گل، راجہ وجے کرن، پروفیسر علی محمد خسرو اور بھیشم ساہنی وغیرہ شامل رہے ہیں۔ ہر سال ایوارڈ کے سلسلہ میں کمیٹی کی میٹنگ ہوتی ہے جس میں بڑی دیر تک بحث وتکرار چلتی ہے۔ کئی نام پیش ہوتے ہیں۔ بھیشم ساہنی اپنی عادت کے مطابق اس بحث میں حصہ نہیں لیا کرتے تھے اور آخر تک خاموش ہی بیٹھے رہتے تھے۔ جب آخر میں ان کی رائے پوچھی جاتی تو بڑی متانت اور دھیمے انداز میں کچھ ایسے نام پیش کردیتے تھے جن سے اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی تھی۔

بھیشم جی کو ایک بار ہم نے ہندی میں چھپی ہوئی اپنی ایک کتاب دی تو بولے'' آپ بھی اچھا مذاق کرلیتے ہیں۔ مانا کہ میں ہندی کا ادیب ہوں لیکن اُردو بھی جانتا ہوں۔ آپ اُردو میں اپنی کتابیں کیوں نہیں دیتے؟''۔ حسن چشتی نے ہماری تحریروں کے انتخاب کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کی دوسری جلد، جو شخصی خاکوں پر مشتمل ہے، اتفاق سے ان ہی دنوں شائع ہوئی تھی۔ ہم نے اُنھیں یہ کتاب دی تو کچھ عرصہ بعد ان کا خط آیا جسے انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے اُردو میں لکھا تھا۔

دوسال پہلے ان کی اہلیہ کے انتقال کے بعد وہ ٹوٹ سے گئے تھے۔ اپنی بیٹی کے پاس رہنے لگے تھے مگر ادب اور سماج سے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اٹوٹ رشتہ قائم رکھا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ ادیب بڑے تھے یا انسان۔ مگر ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ چونکہ وہ بڑے انسان تھے اسی لئے بڑے ادیب بھی تھے۔ اور چونکہ بڑے ادیب تھے اسی لئے بڑے انسان بھی تھے۔ بھیشم جی ہندوستانی ادب میں ہمیشہ یادرکھے جائیں گے۔

(بھیشم ساہنی کا خط مجتبیٰ حسین کے نام)

محترم رفیق!

آپ کے مضامین بڑے چاؤ سے پڑھتا رہا ہوں۔ کچھ مدت کے لئے دہلی سے باہر چلا

گیا تھا۔ اس لئے وقت پر خط نہیں لکھ سکا۔ انہیں پڑھتے ہوئے خوب لطف اندوز ہوا ہوں۔ آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

جس نظر سے آپ کسی واحد کا خاکہ اتارتے ہیں اس میں آپ کی اپنی عظمت جھلکتی ہے، جس طرح کے خاکے آجکل لکھے جا رہے ہیں جن میں شخصیت کا مذاق اڑانا، اس کی کمزوریوں کو ابھارنا اور اس کی ذاتی زندگی میں سے اسکینڈل کھوج کھوج کر نکالنا ایک روایت سا بن گیا ہے۔ آپ کے خاکے پڑھتے ہوئے آپ کے کیریکٹر اور زیادہ عزیز اور زیادہ احترام کے قابل بن کر اُبھرتے ہیں۔ آپ انہیں ایک ادبی شخصیت دیتے ہیں۔ بہت بہت مبارک ہو! آپ کی قلم سے اسی طرح بہترین ادب کی تصنیف ہوتی رہے۔ یہی دعا ہے۔ آداب و نیاز

بھیشم ساہنی

روزنامہ "سیاست" (۲۰ر جولائی ۲۰۰۳ء)

☆☆

208-210, Golf Apartment
Sujan Singh Park
New Delhi. 110003
22. 3. 2002

مکرم رفیق۔

آپکے مضامین بڑے چاؤ سے پڑھ رہا ہوں۔
کچھ مدت کیلئے دہلی سے باہر چلا گیا تھا اسلئے وقت پر خط نہیں لکھ سکا۔ انہیں پڑھتے ہوئے خوب لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ آپکا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

جس نظر سے آپ کسی واحد کا خاکہ اتارتے ہیں اس میں آپ کی اپنی عظمت جھلکتی ہے۔ جس طرح کے خاکے آجکل لکھے جا رہے ہیں جن میں شخصیت کا مذاق اڑانا۔ اسکی کمزوریوں کو ابھارنا۔ اسکی ذاتی زندگی میں سے سکینڈل کھوج کھوج کر نکالنا ایک روایت سا بن گیا ہے آپکے خاکے پڑھتے ہوئے آپکے کیریکٹر اور زیادہ عزیز اور زیادہ احترام کے قابل بن کر ابھرتے ہیں۔ آپ انہیں ایک ادبی شخصیت دیتے ہیں۔
بہت بہت مبارک ہو! آپکی قلم سے اسی طرح بہترین ادب کی تصنیف ہوتی رہے۔ یہی دعا ہے۔ آداب و نیاز

بھیشم ساہنی

(بھیشم ساہنی کی تحریر کا عکس)

تماشائے اہلِ کرم

گھنٹہ گھر کا گھڑیال

پچھلے دنوں ہمارے صحافی دوست ذہانت علی بیگ نے اپنے ایک فیچر میں شکایت کی تھی کہ معظم جاہی مارکیٹ کی عمارت میں یہ جو تین چار بڑی بڑی گھڑیاں لگی ہوئی ہیں وہ کبھی صحیح وقت نہیں بتاتیں بلکہ ایک جانب کی گھڑی کا وقت دوسری جانب کی گھڑی سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک ہی گھر میں رہنے والے تین افراد بھلے ہی ایک دوسرے سے متفق نہ ہوتے ہوں لیکن ایک ہی عمارت میں لگی ہوئی مختلف گھڑیوں کو تو وقت کے معاملہ میں متفق ہونا چاہئے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کی ایک گھڑی پچھلے کئی مہینوں سے چار بج کر بیس منٹ کا وقت بتلا رہی ہے۔ دوسری گھڑی چار بج کر دس منٹ کا وقت اور تیسری گھڑی بھی اظہار خیال کی آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی اور ہی وقت بتا رہی ہے۔ ان کا اعتراض بالکل بجا ہے لیکن انھیں سوچنا چاہئے کہ زمانہ اب مخلوط حکومت کا آگیا ہے۔ ایک ہی حکومت میں شامل کئی پارٹیاں جب اپنے اپنے حساب سے عمل کرتی ہیں اور اپنی اپنی پالیسیاں بناتی ہیں تو ہماری معظم جاہی مارکیٹ کی عمارت پر یہ الزام کیوں عائد کیا جائے کہ اس کی گھڑیوں میں 'اتفاق رائے' نہیں پایا جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب اس ملک کی جمہوریت میں 'مخلوط حکومتوں' کا تصور ابھی پیدا نہیں ہوا تھا تو تب سے ہی یہ گھڑیاں 'مخلوط حکومت' کی ڈگر پر نہایت کامیابی سے رواں دواں ہیں۔ پھر مختلف ملکوں کے اوقات اور ان کی اوقات میں بھی تو بڑا فرق ہوتا ہے۔ مانا کہ یہ گھڑیاں ہمارے حساب سے غلط وقت بتا رہی ہوں لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ کسی نہ کسی ملک کا صحیح وقت بتا رہی ہوں۔ ان گھڑیوں کے بارے میں آج اگر کوئی اعتراض کرتا ہے تو ہمیں اس کی نادانی پر ہنسی آجاتی ہے کیونکہ ہم نے بھی آج سے تیس، پینتیس برس پہلے ان گھڑیوں

کے 'اختلافات' کے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا۔ مگر جب کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو ہم نے بھی بالآخر وقت کے ساتھ صلح کر لی اور کبھی ان گھڑیوں میں وہ وقت نہیں دیکھا جو ہمیں درکار ہوتا ہے۔
کسی نے سچ کہا ہے کہ وقت ہی سب سے بڑا امر اہم ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ان گھڑیوں کی وجہ سے ہم ہر کام دیر سے کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ دفتر کو بھی دیر سے جاتے تھے اور بروقت ڈانٹ بھی کھاتے تھے۔ دیکھا جائے تو یہ بڑی بڑی گھڑیاں اور گھنٹہ گھر اُس زمانہ کی دین ہیں جب دستی گھڑیاں بہت مہنگی ہوا کرتی تھیں اور ہر کس و ناکس ان کو خریدنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ اب تو اُس آدمی کی کلائی پر بھی گھڑی بندھی ہوتی ہے جو وقت دیکھنا تک نہیں جانتا۔ آج دیواری گھڑیوں اور گھنٹہ گھر کی گھڑیوں کو کون پوچھتا ہے۔ ہمیں اس وقت ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ہمارے ایک عہدیدار بالا کے پاس ان کے دادا کے زمانہ کا ایک ایسا دیواری گھڑیال تھا جو خود ان کے موجودہ فلیٹ کی کسی بھی دیوار سے بڑا تھا۔ چونکہ کسی بھی دیوار پر اسے لٹکایا نہیں جا سکتا تھا اسی لئے اس گھڑیال کو انھوں نے ایک کونہ میں ترچھا کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ آدمی چونکہ ماضی پرست تھے اسی لئے اپنے دادا کی اس چھوڑی ہوئی نشانی سے دستبردار ہونا نہیں چاہتے تھے۔ برسوں اس گھڑیال کو سینہ سے لگائے ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہوتے رہے۔ لیکن ایک بار جب پڑوسی کی بلّی نے ان کے گھڑیال کے پنڈولم کے عین نیچے اپنے بچے پیدا کئے اور اس گھڑیال کو ''میٹرنیٹی ہوم'' میں تبدیل کر دیا تو انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ اس بیش قیمت گھڑیال کے ٹوٹے ہوئے شیشے تبدیل کر دیئے جائیں اور ہو سکے تو اس کی مشین کی مرمت بھی کرالی جائے۔ مگر اس دیواری گھڑی کی جسامت ہو بہو ان کے دادا جیسی تھی جن کی قد آدم تصویر ہم نے ان کے ڈرائینگ روم میں اکثر دیکھی تھی۔ کوئی اکیلا شخص اس گھڑیال کو اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا تاوقتیکہ وہ ویٹ لفٹر نہ ہو۔ اسی لئے ہمارے عہدیدار نے ایک دن ہمیں کہا کہ میاں اگر تم ایک دن شام کو میرے گھر آ جاؤ تو ہم دونوں اس دیواری گھڑی کو اٹھا کر کسی گھڑی ساز کے پاس لے جائیں اور اس کی مرمت کروالائیں۔ یہ دیواری گھڑی میرے دادا کی نشانی ہے اور میں اسے یوں وقت کے ہاتھوں برباد ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ سو ایک دن ہم ان کے گھر پہنچے۔ ہم دونوں نے اس گھڑیال کو احتیاط سے اٹھایا اور گھڑی ساز کی دکان کی طرف چل دیئے۔ بازار میں بڑی بھیڑ تھی۔ ہر کوئی آگے نکلنے کی کوشش میں ایک دوسرے کو دھکا دے رہا تھا۔ ایک مرحلہ پر ایک سائیکل رکشا والے نے کچھ ایسی حرکت کی کہ ہمارے عہدیدار بالا اپنا توازن کھو بیٹھے اور اپنے دادا کے گھڑیال سمیت زمین پر آ رہے۔ زمین

پر چاروں طرف جب اس گھڑیال کے کل پرزے بکھر گئے تو ہمارے عہدیدار کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ خون کیوں نہ اُتر آتا اس گھڑیال سے اُن کا ایک خونی رشتہ جو تھا۔ رکشاوالے پر برسنے لگے تو برستے ہی چلے گئے۔ جتنی دیر رکشاوالا ان کی ڈانٹ سنتا رہا اتنی دیر میں ہم سڑک پر بکھرے ہوئے اس گھڑیال کے کل پرزوں کو سمیٹتے رہے۔ ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو رکشاوالے نے ڈرتے ڈرتے اپنی سوچ کے مطابق ہمارے عہدیدار سے کہا'' صاحب! مانا کہ اس میں میری غلطی ہو سکتی ہے اور میں معافی کا خواستگار بھی ہوں۔ لیکن گستاخی معاف تھوڑی سی غلطی آپ کی بھی ہے۔ اگر آپ کو وقت کی پابندی کا اتنا ہی خیال ہے تو وقت دیکھنے کے لئے آپ ایک دستی گھڑی کیوں نہیں خرید لیتے۔ اتنے بڑے گھڑیال کو ساتھ لے کر نکلنے کی کیا ضرورت ہے''۔ رکشاوالے نے یہ بات کچھ ایسی معصومیت کے ساتھ کہی کہ اچانک ہمیں ہنسی آ گئی۔ ہماری ہنسی پر ایسی قہر آلود نگاہوں سے ہمیں دیکھا جیسے کہنا چاہتے ہوں'' Yor too Brutus ''۔ رکشاوالے کو بھلا کیا معلوم کہ یہ گھڑیال ہمارے عہدیدار کے لئے کتنی اہمیت رکھتا ہے اور یہ کہ وہ اسے درست کرانے کے لئے گھڑی ساز کے پاس لے جا رہے تھے۔ اُس نے تو اپنی سوچ کے مطابق یہی سمجھا کہ وہ وقت دیکھنے کے لئے ہر دم اس قد آدم گھڑیال کو ساتھ لئے لئے پھرتے ہیں۔ اس بھولے ہوئے واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آج کے زمانہ میں معظم جاہی مارکیٹ کی طرح کی گھڑیاں وقت دیکھنے کے کام نہیں آتیں بلکہ یہ تو صرف طرزِ تعمیر کا ایک حصہ ہوا کرتی ہیں۔ اگر کوئی ان میں وقت دیکھتا ہے تو یوں سمجھئے کہ وہ اپنا وقت برباد کرتا ہے۔ زمانہ اتنا مصروف ہو گیا ہے کہ کسی کو ایک پل کی خبر نہیں۔ دور کیوں جایئے خود ہم نے پچھلے دو مہینوں میں اپنی دستی گھڑی میں وقت ہی نہیں دیکھا کیونکہ ہمارے پاس اسے دیکھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ یہ گھڑی چل بھی رہی ہے یا نہیں اس کا بھی ہمیں کوئی اندازہ نہیں ہے۔ کبھی دیکھیں گے تو بتائیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم معظم جاہی مارکیٹ کی گھڑی کے بارے میں کچھ لکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اس تحریر کو لکھنے کا اصل محرک تو وہ خبر ہے جو ابھی ہماری نظر سے گذری ہے جس کے مطابق لکھنو کے علاقہ حسین آباد کے گھنٹہ گھر کی گھڑی پچھلے نو برسوں سے خراب ہے۔ یہ ایک تاریخی گھڑی ہے جسے تیسرے نواب اودھ محمد علی شاہ نے ۱۸۸۲ء میں بنوایا تھا۔ پوری دنیا میں یہ واحد گھڑی ہے جس کے کل پرزے گن میٹل کے بنے ہوئے ہیں۔ اس گھڑی کی مرمت میں غیر معمولی تاخیر کا سبب یہ ہے کہ اسے صرف رام ناتھ نامی ایک گھڑی ساز ہی ٹھیک کر سکتا ہے اور اس کی صحت ان دنوں خراب چل رہی ہے۔ 69 سالہ رام ناتھ کے لئے اب

یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ 220 فیٹ اونچے اس گھنٹہ گھر پر چڑھ کر اس گھڑی کی مرمت کر سکے۔ لکھنو والے اس تاریخی گھڑی کے خراب ہو جانے سے بہت دُکھی ہیں اور ان کا مطالبہ یہ ہے کہ اس تاریخی گھڑی کی جلد از جلد مرمت کروائی جائے۔ مانا کہ لکھنو کی تہذیب بھی حیدرآباد کی تہذیب جیسی ہی اہم ہے لیکن لکھنو والوں کو گھڑیوں کے معاملہ میں حیدرآبادیوں سے بہت کچھ سیکھنا چاہئے۔ خدا کے فضل سے حیدرآباد میں بھی کئی تاریخی گھنٹہ گھر ہیں اور ان کی گھڑیوں نے برسوں سے صحیح وقت بتانا چھوڑ دیا ہے اور حیدرآبادیوں نے ان بوسیدہ گھڑیوں کو وقت کے کوڑے دان میں ڈال دیا ہے۔ یہ نہ تو ان کی طرف دیکھتے ہیں اور نہ ہی ان کی مرمت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لکھنو والے بھی اگر حیدرآبادیوں کا سارویہ اپنائیں تو انھیں بھی اپنے اجداد کی یاد نہیں ستائے گی۔ یوں بھی وقت ایک اضافی شئے ہے۔ کبھی کبھی پورا ایک دن ایک پل میں گذر جاتا ہے اور کبھی ایک منٹ کے گذرنے میں کئی کئی دن بیت جاتے ہیں۔ وقت کے جلدی گذرنے پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک نوجوان لمبے عرصہ بعد اپنی محبوبہ سے ملنے کے لئے گیا تو اُس وقت شام کے چار بجے تھے۔ دونوں ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہی تھے کہ اچانک اوپر کے کمرہ میں گھڑیال نے پانچ گھنٹے بجائے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے چھ، سات، آٹھ، نو اور دس بجنے کے گھنٹے سنائی دیئے۔ اس پر نوجوان نے کہا ”ڈارلنگ! دیکھا تم نے ہماری محبت میں وقت کتنی تیزی سے گذر جاتا ہے۔ میں چار بجے تمہارے پاس آیا تھا اور مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی پانچ منٹ پہلے میں یہاں آیا تھا حالانکہ اب دس بج رہے ہیں“۔

اس پر محبوبہ نے کہا ”بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔ اوپر کمرے میں میرے دادا اصل میں اپنے پرانے گھڑیال کے وقت کو صحیح کر رہے ہیں اور تم سمجھ رہے ہو کہ پورے چھ گھنٹے بیت گئے۔ تمہیں یہاں آئے ہوئے تو پانچ منٹ ہی ہوئے ہیں“

بہر حال ہمیں تو معظم جاہی مارکیٹ کی گھڑیوں کے ٹھیک ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ایسے میں نہ لکھنو والے اپنے گھنٹہ گھر کی فکر کریں اور نہ ہی حیدرآبادی معظم جاہی مارکیٹ کی گھڑیوں کی پرواہ کریں۔ یوں بھی زندگی میں کونسا اچھا وقت آنے والا ہے کہ ان گھڑیوں کو دیکھ دیکھ کر اپنا وقت ضائع کیا جائے۔ گھڑیاں بھلے ہی صحیح وقت نہ بتائیں لیکن وقت تو بہر حال گذرتا ہی جاتا ہے۔ وقت تو اس وقت بھی گذر جاتا تھا اور بہتر طور پر گذرتا تھا جب انسان نے گھڑی ایجاد نہیں کی تھی۔

روزنامہ ”سیاست“ (۲۳ / اگست ۱۹۹۸ء)

☆☆

دُعا مانگنے والے

پاک پروردگار کا ہم پر لاکھ لاکھ احسان ہے کہ وہ ہمیشہ ہی ہم پر اپنی مہربانیوں کی بارش برساتا رہتا ہے۔اس کے کرم کا کتنا ذکر کریں اور کس طرح کریں۔عملی زندگی میں اس کی بے پایاں عنایات تو ہمیشہ ہمارے شامل حال رہیں۔ بسا اوقات اُس نے ہماری مزاح نگاری پر بھی اپنے کرم کا سایہ برقرار رکھا۔کہتے ہیں خدا شکر خورے کو شکر ضرور فراہم کرتا ہے۔قدرت ہمیں بھی مزاح نگاری کے نت نئے مواقع اور مواد فراہم کرتی رہتی ہے۔اب یہی دیکھئے کہ اس بار بھی ہم ہمیشہ کی طرح مشرقی دہلی کی عیدگاہ میں عید کی نماز ادا کرنے کے لئے پہنچے اس عیدگاہ میں ہم پچھلے پانچ چھ برسوں سے عید کی نماز پڑھنے کے لئے پابندی سے جاتے ہیں۔کبھی کبھی یہ اطلاع بھی ہمارے کانوں میں پڑ گئی کہ عیدگاہ کی انتظامی کمیٹی کے ارکان میں کچھ اختلاف رائے بھی پایا جاتا ہے۔ہم نے اس پر زیادہ دھیان اس لئے نہیں دیا کہ مسلمانوں کے اداروں میں اختلاف رائے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ یہ ادارہ مسلمانوں کا ہے۔ ویسے بھی ہمیں انتظامی کمیٹی کے ارکان کے اختلافات سے کیا لینا دینا ہے،ہم تو سال میں صرف دو بار یہاں جاتے ہیں اور وہ بھی اس التزام کے ساتھ کہ اپنی جانماز اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔سب کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور واپسی میں جاءنماز اپنے ساتھ اُٹھا کر لے آتے ہیں۔کبھی ہم نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کہ عیدگاہ کی انتظامی کمیٹی کے ارکان کے اختلافات کی نوعیت کیا ہے۔لیکن اس بار عید الفطر کے موقع پر عیدگاہ کی انتظامی کمیٹی کی کارکردگی کا حال بھی معلوم ہوگیا۔وہ اس طرح کہ عید کی نماز

اور خطبہ کے بعد جب امام نے دعا مانگنی شروع کی تو ہمیشہ کی طرح ہم اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ یوں بھی نماز کے بعد دعا مانگنے والے حصہ میں ہماری دلچسپی کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ بلکہ ایک صاحب تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آخر میں صرف دعا مانگنے کی خاطر ہم سالم نماز پڑھ لیتے ہیں۔ (وہ تو اچھا ہے کہ ہم اپنے بدخواہوں کی ایسی باتوں کی پرواہ نہیں کرتے)۔ بہر حال امام صاحب نے پہلے تو سارے عالم اسلام کی خوشحالی کے لئے دعا مانگی۔ پھر ساری انسانیت کی بھلائی کا نمبر آیا۔ پھر امام صاحب نے درجہ بدرجہ بیماریوں میں مبتلا اصحاب کے صحت یاب ہونے اور ہم جیسے بھٹکے ہوئے لوگوں کو نیکی کے راستے پر چلانے کی دعا بڑے موثر ڈھنگ سے مانگی اور ہم نے اس پر بھی آمین کہا۔ پھر انہوں نے ان اصحاب کے لئے دعا مانگی جو مالی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ اس پر عیدگاہ میں آمین کا شور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بلند ہوا۔ بعد میں انہوں نے کچھ متفرق دعائیں بھی مانگیں۔ البتہ آخر میں امام صاحب نے نہایت رقت کے ساتھ دعا مانگی کہ اے پروردگار تو اس عیدگاہ کی انتظامی کمیٹی کے ارکان میں اتفاق رائے پیدا کر، انھیں مل جل کر کام کرنے کا سلیقہ سکھا، انتظامی کمیٹی نے پچھلے تین مہینوں سے میری تنخواہ نہیں ادا کی ہے، انھیں یہ توفیق عطا فرما کہ وہ مجھ غریب کی تنخواہ ادا کردیں۔ اس پر انتظامی کمیٹی کے بعض ارکان نے اعتراض کیا اور خدا خدا کر کے دعا اختتام کو پہنچی۔ مگر اس دعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ نمازی جوق در جوق امام صاحب سے ملنے لگے اور جس کی جیب میں جو کچھ بھی تھا وہ امام صاحب کے حوالے کرنے لگے۔ آپ سے کیا چھپانا کہ ہم نے بھی چپکے سے پچاس روپیہ کا ایک نوٹ امام صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بعد میں امام صاحب اور انتظامی کمیٹی کے ارکان کے درمیان کیا کچھ ہوا یہ ہم نہیں جانتے کیونکہ ہم تو وہاں سے چلے آئے تھے۔ تاہم ہمیں یہ احساس ہوا کہ امام صاحب کی دعا میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ اِدھر دعا ختم ہوئی اور اُدھر یہ دعا قبول بھی ہوگئی۔

اس پر ہمیں چالیس پینتالیس برس پرانی ایک بات یاد آ گئی۔ ایک بار ہم بھی شدید مالی بحران میں گرفتار ہو گئے تھے۔ جمعہ کی نماز کے بعد ہم نے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ اے پروردگار تو ہماری پریشانیوں کو دور فرما۔ مالی پریشانیاں کچھ زیادہ ہی تھیں اس لئے ہم دیر تک دعا مانگتے رہے۔ آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو گئے تھے۔ دعا سے فارغ ہو کر اٹھے تو دیکھا کہ مسجد کے سارے نمازی جا چکے ہیں۔ اتنے میں ہماری نظر ایک بٹوے پر پڑی جو کچھ دور پڑا ہوا تھا۔ ہم نے بٹوے کو کھول کر دیکھا

تو اس میں بھاری رقم رکھی ہوئی پائی جو ہماری مالی پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے کافی تھی۔ہم پر اچانک رقت طاری ہوگئی اور ہم جذبات سے مغلوب ہوگئے۔ہم نے سوچا ہم جیسے گنہگار کی دعا میں اتنی تاثیر!۔ہم نے بٹوے کو برابر میں رکھا اور نماز شکرانہ ادا کرنے کے لئے پھر سے سجدے میں چلے گئے۔سجدہ سے اُٹھ کر ابھی سلام بھی پھیر نہ پائے تھے کہ ایک صاحب مسجد میں دوڑتے ہوئے آئے۔ادھر ادھر کچھ دیکھا اور بڑی تیزی سے اپنے بٹوے کو اٹھا کر چلتے بنے۔سچ تو یہ ہے کہ اس دن ہم خود بھی حیران تھے کہ ہم جیسے گنہگار کی دعا اتنی جلدی کیونکر قبول ہوگئی۔خیر بعد میں ہماری مالی پریشانیاں بھی دور ہوگئیں کیونکہ اللہ نے کوئی اور سبیل پیدا کردی، لیکن وہ بٹوہ ہمیں بہت دنوں تک یاد آتا رہا۔

آج ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ ہماری دعاؤں میں کتنی اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔بچپن میں جو کچھ مانگتے تھے وہ اب بالکل نہیں مانگتے۔اپنے پرائمری اسکول کا وہ زمانہ اب بھی یاد ہے جب برسات کے موسم میں ایسی موسلا دھار بارش کی دعا مانگا کرتے تھے کہ ہمارا اسکول پانی میں ڈوب جائے۔امتحانات کے زمانہ میں ہم امتحان کی تیاری کم کرتے تھے اور زیادہ وقت اس دعا میں گزار دیتے تھے کہ امتحان کے پرچہ میں وہی سوالات ہم سے پوچھے جائیں جنھیں ہم زبانی یاد کر چکے ہیں۔ہماری یہ دعائیں قبول ہوئیں یا نہیں اس کا جواب جاننے کے لئے کبھی آپ ہمارے گھر آکر بی۔اے کی وہ سند دیکھ سکتے ہیں جو اب بھی ہمارے دیوان خانہ میں آویزاں ہے (کون کہتا ہے کہ گنہگاروں کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں) تین چار سال کی عمر میں جب ہم نے پہلے پہل دعا مانگی تو اپنے والدین سے پوچھا تھا کہ دعا میں کیا کیا مانگا جائے۔انھوں نے تاکید کی کہ بیٹا تم جن کو جانتے ہو ان کی بھلائی کی دعا مانگ لو۔یہ اور بات ہے کہ اس زمانہ میں ہم بہت کم لوگوں کو جانتے تھے۔نتیجہ میں ہم نے جو پہلی دعا مانگی اس کا لب لباب یہ تھا "پروردگار! آپ ہمارے ماں باپ کو اچھا رکھیں، بھائیوں اور رشتہ داروں کا بھلا کریں، ہمارے جو دو ایک نوکر ہیں انھیں بھی خوشیاں عطا کریں۔اور آپ بھی اچھے رہیں کیونکہ جو کچھ ہمیں ملتا ہے وہ آپ ہی سے ملتا ہے"۔ہمیں اپنی یہ معصوم دعا اب بھی یاد آتی ہے تو گمان ہوتا ہے کہ خدا کو ہماری یہ معصوم دعا ضرور پسند آئی تھی کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ بعد کی زندگی میں پروردگار نے ہم پر جتنی بھی عنایات کیں وہ اسی معصوم دعا کی وجہ سے کیں۔یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ دعا

مانگتے وقت آدمی عموماً خود غرض اور لالچی ہو جاتا ہے۔اپنی ذات کے سوا کسی اور کی ذات کے بارے میں نہیں سوچتا۔ ہمارے بچپن کی اسی بے لوث دعا کا نتیجہ ہے کہ آج ہم ایک باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ سب اوپر والے کا کرم ہے۔اب ہم اپنی پچھلی دعاؤں کو یاد کرنے بیٹھے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ نوجوانی کے زمانہ میں ہم نے جوش جوانی میں کچھ ایسی دعائیں بھی مانگی تھیں کہ اگر خدانخواستہ یہ قبول ہو جاتیں تو آج ہم کہیں کے نہ رہتے۔غرض اوپر والا سب کچھ جانتا ہے اور بندے کی وہی دعا قبول کرتا ہے جو بندے کے حق میں ہوتی ہے۔یقین مانئے آج جو ہم ایک مطمئن اور آسودہ زندگی گزار رہے ہیں تو اس کا راز یہی ہے کہ خدا نے ہماری بعض دعائیں قبول نہیں کیں۔

مانا کہ ایک زمانہ میں ہم دعا مانگنے کے معاملہ میں بے حد سنجیدہ رہا کرتے تھے۔بعض دفعہ تو اپنے اوپر رقت بھی طاری کر لیتے تھے بلکہ جو چیزیں مانگنی ہوتی تھیں ان کی باضابطہ فہرست بھی پہلے سے تیار کر لیتے تھے لیکن عمر میں اضافہ کے ساتھ، اور خدا نے ہم پر پہلے ہی جو کرم کئے ہیں اُن کے پیش نظر، ہمارے دعا مانگنے کے انداز میں اب وہ شدت باقی نہیں رہی۔کچھ عرصہ پہلے ایک مقدس مقام پر ہمیں اپنے صحافی دوست پرؔوانہ ردولوی کے ساتھ جانے کا موقع ملا تھا۔کچھ دیر بعد وہ ایک جگہ کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کر بہ آواز بلند دعا مانگنے لگے۔ان کی تقلید میں ہم نے بھی اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھا لئے اور پرؔوانہ جو جو مانگنے لگے ہم بھی وہی مانگتے چلے گئے۔(یوں بھی پرؔوانہ رودولوی کے اور ہمارے سماجی اور معاشی حالات نہ صرف ایک جیسے ہیں بلکہ ہم دونوں کی شخصی کوتاہیوں اور گناہوں میں بھی بڑی مماثلت پائی جاتی ہے)۔ایک مرحلہ پر پرؔوانہ رودلوی پر اچانک رقت طاری ہو گئی اور وہ رو رو کر کچھ ایسی آواز میں دعا مانگنے لگے کہ ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا مانگ رہے ہیں۔اب ہمارے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ ہم اپنے بل بوتے پر دُعا مانگیں۔ہم نے پہلے تو اپنی عاقبت کو سنوارنے کے لئے تادیر دعا مانگی لیکن پرؔوانہ کی دعا تب بھی ختم ہونے میں نہ آئی تو ہم نے خدا کا شکر ادا کرنا شروع کر دیا کہ اس نے ہمیں وہ سب کچھ دیا ہے جس کی ہم نے کبھی امید بھی نہیں رکھی تھی۔بعد میں ہم دونوں باہر نکل آئے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جب پرؔوانہ اپنی لمبی دعا کے اثر سے سنبھلے تو ہم نے شکایت کی ''قبلہ! آپ نے اپنی دعا کے آخری حصہ میں کیا کیا مانگا یہ میری سمجھ میں نہیں آیا''۔بولے ''یہ میرا نجی معاملہ تھا۔آپ کو

اس سے کیا مطلب؟''ہم نے کہا ''مطلب یہ کہ میں بھی وہی مانگ رہا تھا جو آپ مانگتے چلے جارہے تھے مگر بعد میں جب آپ رونے لگے اور آپ کی دعا میری سمجھ میں نہ آنے لگی تو مجبوراً مجھے اپنے بل بوتے پر دعا مانگنی پڑی'' بولے ''مضامین اور شعروں میں سرقہ کی بات تو سنی تھی لیکن دعا میں بھی سرقہ ہوسکتا ہے یہ پہلی بار سن رہا ہوں''

ہم نے کہا ''بھیا پروانہ! ماشاء اللہ آپ پینسٹھ برس کے ہو چکے ہیں۔ اوپر سے جہاندیدہ آدمی بھی ہیں، جو چیزیں آپ کو اُصولاً حکومت وقت سے مانگنا چاہئے وہ بھی آپ خدا سے مانگتے چلے جارہے ہیں۔ کب تک آپ مانگنے کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ کبھی خود اپنی عاقبت کی دعا مانگئے اور اُس کی بے پایاں عنایات کے لئے اوپر والے کا شکر ادا کیجئے''۔ ہماری اس بات پر پروانہ پر پھر سے رقت طاری ہوگئی۔ آنسو پونچھتے ہوئے بولے ''حضرت! کبھی کبھی آپ مذاق میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ آدمی آبدیدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا''۔

روزنامہ ''سیاست'' (۲۴ر جنوری ۱۹۹۹ء)

ڈاکٹر سدھیشور راج سکسینہ سے
ایک ملاقات

کراچی کی حیدرآباد کالونی کے گلبرگہ اسٹور کے مالک جناب عبدالرزاق نے پرتبھا کرن کی معرکتہ الارا کتاب 'حیدرآبادی پکوان' کے بارے میں ہمارے کالم کو پڑھنے کے بعد راجہ وجئے کرن کے نام ہماری معرفت ایک خط روانہ کیا تھا جسے پہنچانے کے لئے ہم پچھلے ہفتہ راجہ وجئے کرن کے گھر گئے تھے۔ اُس دن ہماری مصروفیات چونکہ کچھ زیادہ تھیں اس لئے ہم نے سوچا تھا کہ اس خط کو راجہ وجئے کرن کے سنتری کے حوالے کرکے باہر سے چلے جائیں گے۔ ہم نے سنتری کو یہ خط دیا تو سنتری نے کہا " آپ دو منٹ انتظار کریں تو میں یہ خط ابھی انھیں دے کر آتا ہوں"۔ ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ راجہ وجئے کرن خود بڑی تیزی سے باہر نکل آئے۔ بولے " جناب! یہ بھی خوب رہی۔ میں صبح سے آپ کے گھر فون کرتا چلا جارہا ہوں اور آپ باہر سے یہ لفافہ دے کر بھاگے چلے جارہے ہیں۔ اصل میں آپ کے لئے میرے پاس ایک سرپرائز ہے کیونکہ آپ کے ایک پرانے دوست آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہیں اور اس وقت میرے ڈرائینگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں"۔ ہم اندر گئے تو دیکھا کہ ہمدم دیرینہ ڈاکٹر سدھیشور راج سکسینہ گلے میں مالائیں پہنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ دیکھتے ہی ذوق کا یہ شعر سنایا ؎

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ سے ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

پھر ہم سے بغلگیر ہو گئے۔ بولے "میں کل رات ہی حیدرآباد سے آیا ہوں اور آج رات لندن واپس جا رہا ہوں۔ صبح سے تمہاری تلاش میں ہوں۔ پتہ چلا صبح ہی گھر سے نکلے ہوئے ہو۔ میری بات مانو اس وقت میری کشش ہی تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے"۔ ڈاکٹر سدھیشور راج سکسینہ ہمارے چالیس برس پرانے دوست ہیں۔ جب ہم عثمانیہ یونیورسٹی میں پڑھا کرتے تھے تو یہ غالباً نظام کالج میں زیر تعلیم تھے مگر 'اُردو فیسٹول' اور اُردو کی ادبی محفلوں میں (جو ان دنوں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں) ان سے اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔ بعد میں انھوں نے عثمانیہ میڈیل کالج سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کا امتحان کامیاب کیا اور نیلوفر اسپتال میں امراض اطفال کے ماہر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ ہمارے بڑے بھائی محبوب حسین جگر مرحوم انہیں بہت عزیز رکھتے تھے اور طبی اور ادبی موضوعات پر ان کے اکثر مضامین 'سیاست' میں پابندی سے شائع ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں یہ اچانک انگلستان چلے گئے اور وہاں جا کر انگریزوں کا علاج تو کرنے لگے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انھیں ایک ایسی بیماری میں بھی مبتلا کرنے لگے جس کا نام اُردو شاعری ہے۔ ہمارے لندن کے ایک اور دوست نقی تنویر کا کہنا ہے کہ سدھیشور راج سکسینہ کے علاج سے ان کے مریض تو شفایاب ہو جاتے ہیں لیکن بعد میں ہم جیسوں سے اقبالؔ، غالبؔ، مومنؔ، خواجہ میر دردؔ اور داغؔ دہلوی کے شعروں کا مطلب پوچھنے چلے آتے ہیں۔ نقی کا بیان ہے کہ ڈاکٹر سکسینہ کا ایک انگریز مریض نقی کے پاس یہ جاننے کے لئے چلا آیا کہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں جس خودی کو بلند کرنے کی تلقین کی ہے اسے کس طرح بلند کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ نقی خود اردو ماحول کا پروردہ ہے، بلکہ اُردو کا ادیب بھی ہے، لیکن اسے بھی نہیں معلوم کہ خودی کو کس طرح بلند کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس سوال کے جواب کو ٹالنے کے لئے نقی اس انگریز کو ایک میکدے میں لے گیا اور اسے جیسے ہی اسکاچ وہسکی کے تین چار پیگ پلا دیئے اس کی خودی اپنے آپ ہی بلند ہو گئی، اور وہ ڈاکٹر سکسینہ کے علاج کی تعریف اور علامہ اقبال کی شاعری کے گُن گانے لگا۔ نقی کو بھی پہلی بار پتہ چلا کہ خودی کیسی ہوتی ہے اور کیسے بلند ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سدھیشور راج کی کمزوری یہ ہے کہ وہ اُردو شاعری کے حوالے کے بغیر کوئی بھی کام چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا انجام نہیں دے سکتے۔ حد تو یہ ہے کہ طب جیسے دقیق موضوع پر بھی جب وہ انگریزی میں مضامین لکھتے ہیں تو اس میں جا بجا اُردو شعروں کے حوالے دیتے رہتے ہیں۔ انھیں اُردو شاعروں کے ہزاروں شعر یاد ہیں جنھیں وہ عام گفتگو میں بھی بے دریغ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ پانی بھی مانگنا ہو تو میر تقی میرؔ کے کسی شعر کا حوالہ دیں گے۔

نہیں ہے لیکن ان کا خیال ہے کہ اچھا اُردو شعر بھوک کو (ہر قسم کی) اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ سو کھانوں کے پکانے کی ترکیبوں کے نیچے سو اُردو شعر بھی لکھے ہوئے ہیں۔ ہم ان شعروں کو یہاں نقل تو نہیں کریں گے البتہ جن شاعروں کے حصہ میں جو حیدرآبادی کھانے آئے ہیں ان کی دو چار مثالیں پیش کرنا چاہیں گے۔ (دہی وڑا۔ علامہ اقبالؔ)۔ (شامی کباب۔ مومنؔ)۔ (دہی اور گوشت کا سالن۔ مرزا غالبؔ)۔ (چکن مصالحہ۔ خواجہ میر دردؔ)۔ (قبولی۔ میر تقی میرؔ)۔ ہری مرچ کے سالن کی ترکیب کے نیچے حسرتؔ موہانی کا حسب ذیل شعر لکھا گیا ہے۔

مر مٹے ہم تو، کبھی یاد بھی تم نے نہ کیا
اب محبت کا نہ کرنا کبھی وعدہ دیکھو

ویسے تو ہمیں مشورہ دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا لیکن ہری مرچ کے سالن کی خاصیت اور شعر کی معنویت میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے یہاں اُردو کا صرف یہ مصرعہ لکھ دیا جاتا تو کافی تھا۔

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ پربھا سکسینہ نے اس معرکتہ الارا کتاب کو لکھتے وقت قلم توڑ کر رکھ دیا ہے کیونکہ یہاں قلم توڑنے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ البتہ پکوان سے متعلق اس کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں پربھا سکسینہ نے کئی برتن ضرور توڑے ہونگے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس برتن توڑ کتاب کی خاصی پذیرائی ہوگی۔ ہمارے اس قلم توڑ تبصرے کے باوجود کوئی صاحب مندرجہ بالا کتاب کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں تو مندرجہ ذیل پتہ پر ربط پیدا کر سکتے ہیں۔

Dr. Sidheshwarraj Saxena "Prasidh" 12-C Alleynroad

West Dulwich - SE 21-8 Al, LONDON

دو گھنٹوں کی ملاقات کے بعد جب ہم جانے لگے تو ڈاکٹر سکسینہ ہم سے بغلگیر ہوتے ہوئے محبوب حسین جگر مرحوم کو یاد کر کے اچانک آبدیدہ ہو گئے۔ بولے "حیدرآباد کو جن لوگوں نے حیدرآباد بنایا تھا اب وہ اس شہر میں نہیں رہے تو یہ شہر خالی خالی سا ہو گیا ہے"۔ ہماری دعا ہے کہ سدھیشور راج سکسینہ لندن میں خوش و خرم رہیں تاکہ ہمیں یہ شہر بھرا بھرا نظر آتا رہے۔

روزنامہ "سیاست" (۷ فروری ۱۹۹۹ء)

☆☆

بنجارہ ہلز کی چٹانیں

نریندر لوتھر کو حیدرآباد سے عشق ہے (یوں بھی ایک عمر کے بعد آدمی شہروں سے عشق کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے)۔ پچھلے ہفتہ دہلی آئے تو ہمیں فون کیا۔ ہم نے حیدرآباد کا حال پوچھا تو حسب معمول اسے اچھا بتانے لگے۔ ہم نے کہا "حیدرآباد سے آپ کا عشق اب اس منزل میں ہے جہاں آپ بھولے سے بھی اس شہر کے موسم کی برائی تک کرنا نہیں چاہتے۔ سنا ہے ان دنوں وہاں گرمی بہت ہے"۔ بولے "شہر ہوگا تو اس کے موسم بھی ہونگے۔ بھلا گرمی بھی کوئی شکایت کرنے کی چیز ہے۔" ہم نے کہا "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ عشق جب آتش نمرود میں کود پڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو آپ حیدرآباد کی گرمی کی شکایت کیوں کریں گے"۔ بولے "باتیں نہ بناؤ۔ پہلے یہ بتاؤ کل تمہاری کیا مصروفیت ہے؟"۔ ہم نے کہا "معاصرانہ چشمک کے سوائے اردو کے ایک ادیب کی اور کیا مصروفیت ہو سکتی ہے۔ کسی کی غیبت کریں گے۔ کسی کی ٹانگ کھینچیں گے۔ کسی کی ٹوپی اچھالیں گے۔ (بشرطیکہ اس نے پہن رکھی ہو) بولے۔ "کل گیارہ بجے نائب صدر جمہوریہ ہند جناب کرشن کانت اپنی قیام گاہ پر میری وہ دستاویزی فلم دیکھنے والے ہیں جو میں نے حیدرآباد کی چٹانوں کے بارے میں پچھلے دنوں بنائی ہے۔ تم بھی آجانا"

نریندر لوتھر کی اس دستاویزی فلم کا ذکر ہم نے نہ صرف پڑھا تھا بلکہ سنا بھی تھا۔ دیکھا اس لئے نہیں تھا کہ جس دن یہ فلم دوردرشن پر دکھائی گئی تھی اُس دن ہم غالباً اور طرح کی چٹانیں دیکھنے میں مصروف تھے۔ دیکھا جائے تو چٹان اور عشق کا بھی بڑا پرانا سمبندھ ہے۔ اگر یہ سمبندھ

نہ ہوتا تو میاں فرہاد اپنے ساتھ تیشہ، پھاوڑا اور کدال وغیرہ لے کر اپنی شیریں کی خاطر پہاڑ کو کاٹنے کیوں جاتے ،نائب صدر جمہوریہ کے ساتھ بیٹھ کر چٹانوں کے بارے میں فلم ہی نہ دیکھ لیتے ۔ بہر حال سچے معاملاتِ عشق تو سچے عاشق ہی جانیں ۔

اگر چہ علامہ اقبال نے ہم جیسے مومنوں کو بہت پہلے ایک مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کی گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

ہمیں کیا معلوم تھا کہ علامہ اقبال کے اس شعر میں جن چٹانوں کا ذکر ہے وہ بنجارہ ہلز اور جوبلی ہلز کی چٹانیں ہیں ۔ بخدا جب ہم میں شاہین بننے کی صلاحیت موجود تھی تو اس وقت ہمیں ان چٹانوں کو دیکھ کر ڈر ہوتا تھا کہ ان میں جا کر کیسے رہیں ،لیکن اب جب کہ ہم میں ان چٹانوں میں رہنے کی خواہش بیدار ہونے لگی ہے تو پتہ چل رہا ہے کہ ان چٹانوں پر این آر آئیز (NRI's) اور پیسے والوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور ان چٹانوں کا ایک گز رقبہ بھی چار پانچ ہزار روپے سے کم میں دستیاب نہیں ہے ۔اب احساس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال سچ مچ دانائے راز تھے ۔ہم جیسے عاقبت نا اندیشوں نے ان کے کلام کی قدر نہ کی ۔ ان کے کلام کی صرف داد دی اس پر عمل نہ کیا ورنہ آج کوئی چٹان ہمارے قدموں کے نیچے بھی ہوتی ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ہمارے قدموں سے اپنا سر پھوڑ رہی ہوتی ۔

نریندر لوتھر نے ان چٹانوں کے بارے میں سچ مچ ایک خوبصورت ،دلنشین اور دلگداز فلم بنائی ہے ۔ بہت سے حیدر آبادیوں کو یہ پتہ بھی نہ ہوگا کہ جن چٹانوں کے بیچ وہ رہتے ہیں ان کا شمار اس سطح زمین کے سب سے قدیم ارضی نمونوں میں ہوتا ہے ۔ یہ چٹانیں 2500 ملین برسوں سے موجود ہیں (حساب ہمیں نہیں آتا ۔سنا ہے کہ ایک ملین کے دس لاکھ روپئے ہوتے ہیں ۔ڈھائی ہزار ملین کے کتنے کروڑ اور کتنے ارب برس ہونگے ۔ ذرا ہمیں بتایئے تو) ۔پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ چٹانیں سطح مرتفع دکن پر بیس ہزار مربع کیلومیٹر کے رقبہ پر چیدہ چیدہ حالت میں پھیلی ہوئی ہیں ۔ میسور کے پاس بھی جہاں فلم ''شعلے'' کی شوٹنگ ہوئی تھی یہ چٹانیں موجود ہیں ۔کروڑوں برسوں سے یہ خاموش چٹانیں سطح مرتفع دکن میں یونہی چپ چاپ کھڑی ہیں ۔کسی نے پلٹ کر یہ نہیں پوچھا کہ اے چٹانو ! کیوں کھڑی ہو ۔کیا کہنا چاہتی ہو؟ ۔جب تک فلم ''شعلے'' نہیں بنی تھی

تب تک کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ قدرت نے ان چٹانوں کی تخلیق کیوں کی ہے۔ (یوسفی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ خدا نے کتوں کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ ایک دن پطرس بخاری ان پر ایک مضمون لکھیں۔ اس طرح ہمارا خیال ہے کہ قدرت نے سطح مرتفع دکن کی چٹانوں کو اس لئے پیدا کیا تھا کہ ایک دن ان کے پس منظر میں فلم 'شعلے' بنائی جائے)۔ گبر سنگھ نے جب سلیم جاوید کا لکھا ہوا یہ مکالمہ ادا کیا تھا۔ ''اب تیرا کیا ہوگا کالیا؟'' تو اس وقت وہ اصل میں کالیا سے مخاطب نہیں تھا بلکہ اس کا روئے سخن ان چٹانوں کی طرف تھا کہ ''اب تمہارا کیا ہوگا اے چٹانو؟''۔ چنانچہ اب آئے دن ہندوستانی فلموں کے نازک اندام ہیرو بسا اوقات جنوبی ہند کی صحت منداور چٹان صفت ہیروئنوں کے ساتھ ان چٹانوں کے بیچ ناچتے، گاتے اور ویلنوں سے لڑتے جھگڑتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس صورتحال سے گھبرا کر اب نریندر لوتھر کو خود ان چٹانوں کے بارے میں ایک دستاویزی فلم بنانی پڑی۔ ماشاء اللہ اس دستاویزی فلم میں ان چٹانوں نے غضب کی اداکاری کی ہے۔ چٹانیں بول نہیں سکتیں تو کیا ہوا نریندر لوتھر کا اسکرپٹ تو پیچھے سے بول رہا ہے۔ یوں بھی ساٹھ ستر برس پہلے تک ہمارے ہاں خاموش فلمیں ہی بنا کرتی تھیں۔ اب جو بولنے والی فلمیں بنتی ہیں تو ہمیں ان کے بننے پر بھی اعتراض ہے کیونکہ آپ دو چار ہندوستانی فلمیں ذرا دل لگا کر دیکھ لیں تو آپ کو یہ جاننے میں محنت صرف نہیں کرنی پڑتی کہ ہیرو کیا کہنا چاہتا ہے۔ ویلن کے کیا ارادے ہیں، ہیروئین کے باپ کی کیا مجبوری ہے۔ آپ غور سے دیکھیں تو ان فلموں میں پروڈیوسر کے مکالمے بھی سنائی دیتے ہیں حالانکہ وہ خود پردہ سیمیں پر نمودار نہیں ہوتا۔ نریندر لوتھر نے اس فلم کے ذریعہ ان خاموش چٹانوں کو جو قوت گویائی عطا کی ہے اس سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ چٹانیں نہ صرف بول رہی ہیں بلکہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں بول رہی ہیں۔ فلم میں چٹانوں کا ایک منظر ایسا بھی ہے جس میں ایک بڑی چٹان کھڑی ہوئی ہے اور اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پتھریوں بکھرے ہوئے ہیں جیسے بڑے انہماک کے ساتھ اس رہنما چٹان کی تقریر سن رہے ہوں۔ ایک چٹان میں ایک ماں اپنے بچے کو دودھ پلا رہی ہے۔ ایک اور چٹانی منظر میں پورا ایک خاندان پکنک منا رہا ہے۔ (برابر میں کوکا کولا کی خالی بوتلیں پڑی ہوئی ہیں) ایک چٹان میں ایک باریش آدمی کی شبیہ نظر آ رہی ہے (یہ اور بات ہے کہ تیز ہوا کے باوجود داڑھی کے بال ہلنے سے معذور ہیں)۔ ہم نے تو یہاں تک دیکھا کہ ایک چھوٹی چٹان ایک بڑی چٹان کی جیب کاٹ رہی ہے۔

افسوس کہ نریندر لوتھر نے اس فلم کے بنانے میں ذرا دیر کردی ورنہ اس فلم میں شمولیت کے لئے ہم اُس چٹان کی نشاندہی بھی کردیتے جو ابھی چند برس پہلے تک حسین ساگر کے ایک کنارے پر واقع تھی۔ یہ ہماری محبوب چٹان تھی جس پر ابھی تیس پینتیس برس پہلے تک ہم شام کے دھندلکے میں بیٹھا کرتے تھے (اکیلے نہیں)۔اس چٹان سے ہماری کتنی ہی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔پانچ چھ برس پہلے اک دن یونہی وہاں سے گزرے تو دیکھا کہ کوئی اس چٹان کو کاٹ کر لے گیا ہے۔ یوں لگا جیسے کوئی ہمارا دل کاٹ کر لے گیا ہو۔اب کس سے فریاد کریں۔کہاں ہے وہ زنجیر عدل جسے ہم کھینچنے جائیں۔ کس سے دادرسی چاہیں۔نریندر لوتھر کی اس فلم کا پہلے سے پتہ ہوتا تو ان سے کہہ کر اس فلم میں اس چٹان کو بھی محفوظ کرالیتے۔غرض اب نہ وہ چٹان باقی رہی اور نہ ہی وہ ہستیاں جن کے ساتھ ہم یہاں بیٹھا کرتے تھے۔ سب فنا۔ آخر فنا۔ چٹانیں تو اس قدر جلدی فنا نہیں ہوا کرتی تھیں لیکن اب وہ بھی ہونے لگیں۔اس فلم میں وہ محیر العقول چٹانیں بھی دکھائی گئی ہیں جن میں ایک چھوٹے سے پتھر پر اس کی جسامت سے ہزار گنا بڑی چٹان یوں ٹکی ہوئی ہے جیسے سرکس کے شو میں سالم ہاتھی ایک چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھ جاتا ہے۔ہاتھی تو خیر بیٹھنے کی اداکاری کرتا ہے لیکن چٹان تو نہیں کرسکتی۔ایسی چٹانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہمیں ہمیشہ سے ڈر لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب سر پر آن گرے۔ پہلے تو خیر بہت گھبراتے تھے لیکن اب نہیں گھبراتے کیونکہ جب سے مرکز میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی مخلوط سرکار بنی ہے تب سے ہمیں ایسی چٹانیں کوئی عجوبہ نہیں دکھائی دیتیں کیونکہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی اتنی بڑی سرکار بھی پانچ پانچ ، تین تین ارکان پارلیمنٹ پر مبنی پارٹیوں پر ٹکی ہوئی ہے۔ایک سال سے تو ٹکی ہوئی ہے۔آگے کا حال ہم نہیں جانتے۔

نریندر لوتھر کی فلم رابندر ناتھ ٹیگور کی اس مشہور نظم سے شروع ہوتی ہے جسے انھوں نے ۱۹۳۳ء میں اپنے دورہ حیدرآباد کے موقع پر ان چٹانوں کو دیکھ کر کہی تھی۔ ہم سوچتے رہے کہ اگر ٹیگور آج ان چٹانوں کو کاٹ کر بنائی گئیں موجودہ بستیوں کو دیکھ لیتے تو کیا ایسی خوبصورت نظم کہہ سکتے تھے۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔رابندر ناتھ ٹیگور ۱۹۳۳ء میں ہی یہ نظم کہہ سکتے تھے نہ اس سے پہلے کہہ سکتے اور نہ ہی بعد میں کہہ سکتے تھے۔ ان چٹانوں نے کروڑوں برس تک ایک پرسکون زندگی پائی۔انھیں کیا پتہ تھا کہ ایک دن پیسے والے ان کے سکون کو چکنا چور کردیں گے۔ ۱۹۲۷ء

میں نواب مہدی نواز جنگ نے بنجارہ ہلز میں 1500 ایکڑ کی اراضی کوڑیوں کے مول خریدی تھی۔ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ ساٹھ ستر برس بعد اس علاقہ کا یہ حال ہو جائے گا تو ہرگز نہ خریدتے۔ سنا ہے کہ ان چٹانوں کے تحفظ اور انھیں برقرار رکھنے کی خاطر ایک انجمن بھی بنائی گئی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں انجمنوں سے مشکل یہ ہوتی ہے کہ یہ بھی ٹوٹنے کے معاملہ میں چٹانوں کی طرح کمزور ہوتی ہیں۔ انجمن کے ارکان میں اتفاق رائے موجود نہ ہو تو بعض ارکان انجمن کو ہی کاٹ کر لے جاتے ہیں۔ خدا کرے یہ انجمن بنجارہ ہلز کی چٹانوں سے کہیں زیادہ مضبوط ثابت ہو۔ یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ ہماری محبوب چٹان تو ملیا میٹ ہوگئی۔ کم از کم دوسروں کی چٹانیں تو محفوظ رہیں۔

صرف اپنا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

غرض آدھے گھنٹہ کی اس فلم کو نائب صدر جمہوریہ ہند مسٹر کرشن کانت نے بھی نہایت ذوق وشوق سے دیکھا بلکہ دو چار چٹانوں کو تو پہچانا بھی۔ کیوں نہ پہچانیں گے۔ آخر وہ بھی تو ایک عرصہ تک ان چٹانوں کے دامن میں رہ چکے ہیں۔

روزنامہ ''سیاست'' (۴/اپریل ۱۹۹۹ء)

الفریب اور ہمارا الطنز و المزاح

پچھلے دنوں حیدرآباد میں پانچ چھ ہفتوں تک قیام کرنے کے بعد ہم نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ گذشتہ کئی برسوں سے ہم دہلی میں مقیم ہیں اور خدا نے ہمیں توکل، قناعت، قلندری بلکہ تنگ دستی کی دولت سے سرفراز فرمایا ہے۔ اگر خدانخواستہ ہم بھی حیدرآباد میں رہ رہے ہوتے تو ہمارے پاس بھی چار پیسے ہوتے اور ہماری مالی حالت کچھ ایسی ہوتی کہ اپنا اثاثہ ان فینانس کمپنیوں میں مشغول کر دیتے جو ان دنوں اپنے ناموں سے پہلے 'ال' لگا کر معصوم لوگوں کو 'حلال' کرنے میں مصروف ہیں۔ خدا کے فضل سے دہلی مہنگا شہر ہے۔ اوپر سے یہاں فاصلے بھی بہت ہیں۔ نتیجہ میں آدمی کفایت شعاری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یوں بھی ہم پر وہ زمانہ گذر چکا ہے جب صبح کی روٹی کھالیتے تھے تو پتہ نہیں رہتا تھا کہ شام کو روٹی ملے گی بھی یا نہیں اور اگر ملے گی تو کہاں ملے گی۔ گویا پہلے ایک وقت کے کھانے کی فکر کرتے تھے مگر بعد میں حالات کچھ بہتر ہوئے تو ایک دن کے گزر جانے کے بعد دوسرے دن کے کھانے کی فکر لاحق رہنے لگی۔ اب خدا کے فضل سے حالات اتنے اچھے ہیں کہ ایک ہفتہ گزر جانے تک دوسرے ہفتہ کے گزارنے کی فکر نہیں رہتی۔ اس جہانِ فانی میں جہاں آدمی کی زندگی کسی بھی پل ختم ہو سکتی ہے وہاں اگر آدمی کو ایک ہفتہ کے گزرنے کی طمانیت بھی میسر آ جائے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ ایں سعادت بزور بازو نیست، مگر یہ طمانیت اتنی تونگر بھی نہیں ہوتی کہ آدمی پیسہ کو ہاتھ کا میل سمجھنے لگ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے کفایت شعاری اور سلیقہ مندی کی زندگی گزارنے کو ہمیشہ ضروری جانا اور پیسے کے میل کو کبھی

اپنے ہاتھ پر جمنے نہیں دیا۔ نتیجہ میں ہمارے پاس ادب کے سرمایہ کے علاوہ ایسا کوئی سرمایہ نہیں ہے جسے ہم چٹ فنڈ کمپنیوں اور فینانس کمپنیوں وغیرہ میں مشغول کرسکیں۔ مخفی مباد کہ ہم حیدرآباد اکثر آتے رہتے ہیں اور اس شہر کے حالات سے حتی الامکان باخبر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ جب سے حیدرآبادی نوجوان روزگار کی تلاش میں جوق در جوق خلیجی ممالک میں جانے لگے ہیں اور وہاں سے کچھ کما کر حیدرآباد بھیجنے لگے ہیں تب سے حیدرآباد کے معاشرہ میں ''ال'' کی اہمیت دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ اب تو یہ معمول سا بن گیا ہے کہ جو دیانتدار اور شریف نوجوان اپنی محنت کے بل بوتے پر کچھ کمانا چاہتے ہیں وہ بے شک خلیجی ممالک میں چلے جاتے ہیں لیکن جو لوگ وطن میں رہ کر بڑے اطمینان کے ساتھ بے ایمانی اور حرام خوری کرنا چاہتے ہیں وہ اس ''ال'' کے سہارے وہ سب کچھ حاصل کرلیتے ہیں جو برسوں کی کمر توڑ محنت کے بعد بھی ہمارے ایماندار نوجوان باہر رہ کر حاصل نہیں کرسکتے۔ ایسے مفت خوروں کو جب بھی حرام خوری کا خیال آتا ہے تو وہ ایک ایسا ادارہ قائم کرلیتے ہیں جس کے نام سے پہلے ''ال'' لگا ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دوست بتارہے تھے کہ انھوں نے تجربہ کے طور پر ایک ادارہ ''الفریب'' کے نام سے قائم کیا تھا۔ اگرچہ اخباروں میں اس کی مناسب پبلسٹی بھی نہیں کی تھی مگر پھر بھی لوگ بھاری رقمیں لے لے کر ان کے پاس آتے رہے۔ ہمارے یہی دوست بتارہے تھے کہ ایک بار پولیس نے ایک چور کو چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ کانسٹیبل نے چور سے پوچھا ''تم چوری کیوں کررہے تھے؟''۔ چور نے جواب دیا ''حضور! میں چوری کہاں کررہا تھا۔ میں تو 'السرقہ' کررہا تھا''۔ کانسٹیبل نے ''السرقہ'' کا لفظ سنا تو اپنے کان پکڑ لئے اور چور کو چوری کے سامان سمیت جانے کی اجازت دیدی۔ دور کیوں جایئے جب سے ''ال'' کے 'الفوائد' ہم پر منکشف ہوئے ہیں تب سے ہم بھی ''ال'' کا بے دریغ استعمال کرنے لگے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک صاحب نے ہم سے استفسار فرمایا کہ ہم کیا کرتے ہیں۔ ہم نے جواب دیا ''جناب! ہم 'الطنز والمزاح' لکھتے ہیں''۔ اتنا سننا تھا کہ انھوں نے بڑی عقیدت کے ساتھ ہمارے ہاتھ چومنا شروع کردیئے۔ پہلے تو ان ہاتھوں کو اپنے سر پر رکھا پھر انھیں اپنی آنکھوں سے لگانا شروع کردیا۔ دوسری بار ہمارا یہ 'المداح' راستہ میں مل گیا تو ہم نے بے خیالی میں اپنے ہاتھ اس کی طرف بڑھادیئے۔ بولا ''حضور! کچھ دیر توقف کیجئے۔ میں ابھی وضو کر کے آتا ہوں''

بہر حال ادھر کچھ عرصہ سے حیدرآباد میں بعض ایسے دھوکہ باز نمودار ہو گئے ہیں جو ''ال'' کی برکت سے بے پناہ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔کئی معصوموں کے گھر اجاڑ دیئے،غریبوں اور مسکینوں کی زندگیاں برباد کیں۔مانا کہ کچھ دھوکہ باز یا تو فرار ہو چکے ہیں یا پھر جیلوں میں بند ہیں لیکن نہ جانے اور کتنے باقی ہیں جو اب بھی معصوموں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔ایک زمانہ تھا جب دھوکہ باز اکیلے ہی دھوکہ دیتا تھا اور بسا اوقات اکیلے ہی غائب بھی ہو جاتا تھا۔اب سائینس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے باعث دھوکہ دینے والا باضابطہ ایک ادارہ قائم کرتا ہے۔اسٹاف رکھتا ہے،خوبصورت ریسپشنسٹ کا تقرر کرتا ہے۔ٹیلیفون لگواتا ہے،ایرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھتا ہے،فیکس اور انٹرنیٹ لگواتا ہے۔پھر ذرائع ابلاغ کی مدد سے اپنے ادارہ کے اطراف ایک ایسی فضا قائم کرتا ہے کہ عام آدمی اس چکا چوند میں ایسے دھوکہ بازوں کی عظمت کا قائل ہو جاتا ہے۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران میں ہم نے محسوس کیا کہ دھوکہ دینے کے معاملہ میں دھوکہ باز بڑی زبردست تخلیقی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ان کے چنگل میں جہاں غریب اور معصوم رکشاران، جز معاش مزدور وغیرہ پھنستے ہیں وہیں دانشور، پروفیسر،انجینئر،ٹھیکیدار،صحافی،افسر،سبھی شامل ہیں۔ ان کے دھوکہ دینے کا جال اتنا بڑا ہے کہ اس میں محمود و ایاز دونوں کو بیک وقت ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔دھوکہ کھانے والوں کی اقسام میں جو تنوع ہے،جو رنگا رنگی اور بوقلمونی ہے وہ دھوکہ دینے والوں کی بھرپور تخلیقی صلاحیتوں کی ترجمان ہے۔

پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دھوکہ باز رفتہ رفتہ شہر کی سماجی،تہذیبی اور ادبی زندگی میں بھی دخل دینے لگتے ہیں۔انھیں صدر اور مہمان خصوصی کی مسند پر بٹھایا جاتا ہے۔اردو شاعر تو یوں بھی کسی کی شان میں قصیدہ کہنے کے لئے اتاولا رہتا ہے۔سو شاعران بدمعاشوں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔بعض تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان حرام خوروں کے نام بڑی عقیدت کے ساتھ اپنے مجموعہ ہائے کلام معنون کر دیتے ہیں اور اس حرکت سے ہم جیسوں کو پتہ چلتا ہے کہ بعض اوقات دھوکہ دہی کے معاملہ میں اردو شاعر اور دھوکہ باز دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا بلکہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے دکھائی دیتے ہیں۔پھر ان بدمعاشوں کو محفلوں میں خطابات اور اعزازات سے نوازا جاتا ہے۔انھیں 'آبروئے دکن'، 'شان چارمینار'، 'فخر حیدرآباد'، 'گوہر دکن'، 'خوشبوئے دکن' وغیرہ جیسے القاب سے پکارا جاتا ہے۔پچھلے ہفتہ ہم نے ایسے ہی ایک

'آبروئے دکن' کے بارے میں ایک صاحب سے پوچھا کہ موصوف کس حال میں ہیں۔ جواب ملا "آبروئے دکن فرار ہیں"۔ 'خوشبوئے دکن' کے بارے میں معلوم ہوا کہ روپوش ہیں۔ 'شان چارمینار' حوالات میں بند ہیں۔ 'فخر حیدرآباد' حیدرآباد سے فرار ہیں۔

بہت عرصہ پہلے حیدرآباد میں ایک سرکاری عہدیدار ہوا کرتے تھے (اب ریٹائر ہو چکے ہیں) جو اپنے بل بوتے پر فنکاروں، ادیبوں، شاعروں وغیرہ کی واجبی سی مدد کردیا کرتے تھے۔ (ایک بار ہماری بھی مدد کی تھی)۔ لوگ انھیں 'تہذیبی سفیر' کہا کرتے تھے اور اس زمانہ میں وہ جلسوں کی زینت بڑھانے کے کام آیا کرتے تھے۔ بیچارے دو چار منٹ تقریر کر کے بلکہ بعض اوقات تو سامعین کی ہوٹنگ کو برداشت کر کے چپ چاپ بیٹھ جاتے تھے۔ بعد میں سکندرآباد میں بھی ایک ادب دوست سرکاری عہدیدار حیدرآباد کی تہذیبی زندگی کے افق پر نمودار ہو گئے تھے۔ باذوق آدمی تھے اور وہ بھی ادیبوں اور فنکاروں کی حسب توفیق مدد کردیا کرتے تھے۔ جب دو دو تہذیبی سفیر حیدرآباد کی سماجی زندگی پر چھا گئے تو دونوں سفیروں میں 'معاصرانہ چشمک' کی گنجائش بھی نکل آئی۔ یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب ہم حیدرآباد کو چھوڑ کر دہلی جانے کے لئے پر تول رہے تھے بلکہ تول چکے تھے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تو ہم نے اس کا پرامن حل یوں نکالا کہ حیدرآباد اور سکندرآباد ویسے تو جڑواں شہر ہیں لیکن پھر بھی 'ضرورت شعری' کے تحت انھیں دو الگ الگ شہروں میں تقسیم بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہمارے پاس اس وقت دو تہذیبی سفیر ہیں تو ایک کو حیدرآباد کے حوالے کیجئے اور دوسرے کو سکندرآباد کے کھاتہ میں ڈالئے۔ البتہ دونوں اس بات کا خیال رکھیں کہ تہذیب کی خدمت کرتے وقت اپنے اپنے شہروں کے بلدی حدود کی خلاف ورزی نہ کریں۔ خیر ان دونوں شریف تہذیبی سفیروں سے آج کے بدمعاش اور بدتہذیب تہذیبی سفیروں کا کیا تقابل۔ پچھلے دنوں ہم نے اپنے ایک دوست کے سامنے، جو سدا صلح کل کی پالیسی پر عمل پیرا رہتے ہیں، حیدرآباد میں وقفہ وقفہ سے نمودار ہونے والے ان دھوکہ بازوں کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا تو ہمیں دلاسہ دیتے ہوئے بولے "میاں! کیوں تم ناحق اپنا خون کھولاتے ہو۔ خیر اور شر کے عناصر سماج میں ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ قلی قطب شاہ کی رواداری، ابوالحسن تاناشاہ کی قلندری، عبدالرزاق لاری کی وفاداری، آصف جاہوں کی شرافت کی حکمرانی دکن میں بہت عرصے سے چلی آرہی ہے۔ تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ ابوالحسن تاناشاہ کے عہد میں عبدالرزاق لاری کے

علاوہ ایک عبداللہ پنی افغانی بھی تھا جس نے دھوکہ سے گولکنڈہ کے قلعہ کا دروازہ اورنگ زیب کی فوجوں پر کھول دیا تھا۔ آج کے دھوکہ باز اسی عبداللہ پنی کی اولادیں ہیں۔ عبداللہ پنی کے پاس گولکنڈہ کے قلعہ کی چابی تھی اور آج اس کے پیروکاروں کے پاس ''ال'' کی چابی آگئی ہے''۔ اب بھلا اس کے جواب میں ہم کیا کہتے۔ الامان والحفیظ کہہ کر خاموش ہوگئے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۶رمئی ۱۹۹۹ء)

پتّھر کے دور سے پتھری کے دور تک

کون کہتا ہے کہ انسان پتھر کے دور سے نکل کر لوہے کے دور، صنعتی دور وغیرہ سے ہوتا ہوا خلائی دور میں داخل ہو گیا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ انسان آج بھی پتھر کے دور میں زندہ ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ آج بھی ہم بڑے اہتمام کے ساتھ ایک دوسرے پر پتھر پھینکتے رہتے ہیں۔ ہمارے رہنماؤں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں اور ان کی عقل پر تو اور بھی زیادہ پتھر پڑے رہتے ہیں۔ ان حالات میں ہم جیسے لوگ اپنے دل پر پتھر رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اردو شاعر تو خیر یوں بھی بڑی آسانی سے ایک دوسرے کے سر پھوڑنے کے اہل ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے از راہ عنایت اپنے ہی پتّھر سے خود اپنا سر پھوڑنے کو ہمیشہ پسندیدہ فعل جانا بلکہ اس خصوص میں معشوق کے سنگِ آستاں تک کو زحمت دینا گوارا نہ کیا۔

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

کہنے کو انسان چاہے کسی بھی دور میں داخل ہوا ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پتھر کی اہمیت ہر دور میں برقرار رہی ہے بلکہ حضرت شیخ سعدی تو پتھر کی آزادی کے بھی قائل رہے ہیں۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ ایک بار وہ کسی شہر سے گزر رہے تھے تو ایک کتے نے ان پر بھونکنا شروع کر دیا۔ انھوں نے کتے کو مارنے کے لیے زمین پر پڑے ہوئے ایک پتھر کو اٹھانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ پتھر زمین میں کافی اندر تک دھنسا ہوا ہے۔ اس پر شیخ سعدی نے کہا "بڑا عجیب شہر

ہے، یہاں لوگ کتے کو تو کھلا چھوڑ دیتے ہیں لیکن پتھر کو باندھ کر رکھتے ہیں۔"

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم کسی بھی بات کو گھما پھرا کر بیان کرنے کے عادی ہیں۔ ہم نے اپنے قارئین پر اتنی لمبی تمہید کا پتھراؤ صرف یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے پتے کی پتھری کا آپریشن ہوا ہے اور اس آپریشن کے بعد ہم پر یہ راز منکشف ہوا کہ انسان پتھر کے دور سے نکل کر کسی اور دور میں نہیں گیا بلکہ پتھری کے دور میں ہی داخل ہو گیا ہے۔ کہنے کو انسان کئی ادوار سے گزر کر خلائی دور میں داخل ہوا ہے لیکن ہر دور میں وہ کچھ ایسی حرکتیں کرتا رہا ہے جن سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ وہ پھر سے پتھر کے دور میں داخل ہونے کی دلی خواہش رکھتا ہے۔ چنانچہ یہ جو ایٹمی طاقتیں آئے دن ایٹمی تجربات کرتی رہتی ہیں تو وہ انسان کی اس دلی خواہش کے غماز ہیں۔ خیر ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ پچھلے ہفتہ حیدرآباد کے میڈی سٹی اسپتال میں ہمارے اس پتے کو جسے ہم زندگی بھر یا تو مارتے رہے یا جسے پانی پانی کرتے رہے، ہمارے پیٹ سے کاٹ کر نکال باہر کر دیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس پتے کو پتھر کی شکایت لاحق ہو گئی تھی اور جو پچھلے دو ڈھائی برسوں سے ہمیں تنگ کرتا چلا آ رہا تھا۔ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ہم مثالی صحت رکھتے ہیں۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ پچھلے چالیس برسوں میں ہمارا ٹمپریچر کبھی نارمل سے اونچا نہیں ہوا۔ دل ہمارا آج تک اس لیے خراب نہیں ہوا کہ ہم نے اسے کبھی اپنے پاس نہیں رکھا۔ جہاں کوئی اچھی شکل دیکھی اُس کی جھولی میں اسے ڈال دیا۔ ہماری ساری خرابیوں کی جڑ ہمارا پاپی پیٹ ہی رہا ہے جس کی خاطر ہم نے کیا کیا پاپڑ نہ بیلے مگر اسے ہم کبھی اپنی ذات سے الگ نہ کر سکے۔ یوں بھی دل کے تو کئی خریدار مل جاتے ہیں لیکن پاپی پیٹ کا کوئی خریدار نہیں ملتا۔ غرض ہم جہاں گئے اپنے اس بدکار پیٹ کو ساتھ لے کر گئے (دعوتوں میں تو اور بھی زیادہ ساتھ لے گئے)۔ ہمارے دوست افتخار عارف کا شعر ہے۔

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا

ڈیڑھ دو برس پہلے جب ہمیں بتایا گیا کہ ہمارے پتے میں پتھری آ گئی ہے تو ہم نے اس کے آپریشن کو حتی الامکان ٹالنا چاہا۔ ہم نے سوچا کہ جس پتے کو ہم زندگی بھر مارتے رہے اب اسے کیونکر اپنی ذات سے الگ کریں۔ ہماری ذات میں مارنے کے لیے کچھ تو ہونا چاہیے۔ اگر یہ نکل جائے تو ہم کسے ماریں گے۔ نفس امارہ کو مارنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ مارا نہ گیا۔ اب ایک

پتّا رہ گیا ہے سو وہ بھی خموش ہے۔ دوسری بات یہ کہ دوستوں کی مزاج پرسی کرنے کے لیے یوں تو ہم سیکڑوں بار اسپتال گئے ہیں لیکن خود کبھی اسپتال میں شریک نہیں ہوئے۔ اگر چہ نوجوانی میں بیسیوں مرتبہ ہم اپنے ہوش گنوا چکے ہیں لیکن انستھیسیا (Anesthesia) کی مدد سے اپنے ہوش گنوانے کو ہم نے ہمیشہ کسرشان سمجھا۔ پھر پیٹ کے آپریشن سے ہم اس لیے بھی گھبراتے ہیں کہ ڈاکٹر لوگ بعض اوقات غلطی سے آپریشن کے دوران اپنی چھری، چاقو، پستول، قلم، قینچی وغیرہ پیٹ میں رکھ کر بھول جاتے ہیں اور بعد میں مانگنے چلے آتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ بھی ڈاکٹروں کی بڑائی ہے ورنہ آج کے زمانہ میں کون کسی کے پیٹ میں اپنی کوئی چیز چھوڑتا ہے۔ بعض لوگوں کا ہاضمہ اتنا اچھا ہوتا ہے کہ پورے ملک تک کو کھا کر ہضم کر لیتے ہیں لیکن ہم جیسوں سے ایک معمولی قینچی تک ہضم نہیں ہوتی۔ ویسے ڈاکٹروں کا بس چلے تو مریض کا پورا پیٹ تجوری سمیت نکال کر لے جائیں۔ کیا کریں ڈاکٹر کو بھی تو اپنے پاپی پیٹ کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ غرض ایسی ہی باتوں کی وجہ سے ہم پیٹ کے آپریشن سے گریز کرتے رہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ہم نے اپنے دل میں کئی باتیں چھپا کر رکھی ہیں لیکن آج تک ہمارے پیٹ میں کوئی بات نہ رہ سکی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ہمیں ہلکے پیٹ کا آدمی سمجھتے ہیں۔ پہلے ہی ہمارا پیٹ ہلکا ہے اوپر سے اس میں سے پتّا نکال دیا جائے تو اس میں باقی کیا رہ جائے گا۔

اسے ہماری خوش بختی ہی کہیے کہ ہمارے پیٹ کا آپریشن امراض شکم کے نوجوان سرجن ڈاکٹر ونئے کمار نے کیا جو ہمارے کرم فرما جناب شیو شنکر کے فرزند ہیں۔ لہٰذا ہمیں یہ یقین بھی تھا کہ شیو شنکر صاحب سے ہمارے مراسم کی وجہ سے ڈاکٹر ونئے کمار ہمارے پیٹ میں قینچی وغیرہ نہیں بھولیں گے۔ جب ہم نے اس بھروسہ کا اظہار ڈاکٹر ونئے کمار سے کیا تو بولے "جناب! آپ کے پیٹ کو کھولا ہی نہیں جائے گا تو اس میں قینچی کو رکھ کو بھولنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ میں تو سرجری کی جدید تکنیک (Laparoscopy) کے ذریعہ آپ کے پتّے کو پتھری سمیت باہر نکال لوں گا۔ چنانچہ ڈاکٹر ونئے کمار نے ڈیڑھ گھنٹہ کی سرجی کے ذریعہ کچھ ایسی صفائی سے ہمارے پتّے کو پیٹ سے نکال باہر کیا کہ آپریشن کے چھ گھنٹوں بعد ہی ہم نہ صرف اپنے بستر میں اُٹھ بیٹھے بلکہ کچھ دور چلنے کا بھی مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر ونئے کمار نہایت مستعد اور چاق و چوبند نوجوان ہیں۔ اپنی بات چیت میں "خدا کا فضل، خدا کا کرم، خدا حافظ، انشاء اللہ، ماشاء اللہ" جیسے لفظوں کا بے دریغ استعمال

کرتے رہتے ہیں۔ گویا علم طب کی مدد سے جہاں عمل جراحی انجام دیتے ہیں وہیں مندرجہ بالا اُردو لفظوں کے ذریعہ زخموں پر مرہم کا پھاہا بھی رکھتے جاتے ہیں۔ اسے ڈاکٹر ونئے کمار کی جراحی کا کمال کہیے یا ہماری مثالی صحت کا کرشمہ کہ اسپتال میں اپنے دو روزہ قیام کے دوران میں وہاں کے عملہ سے ہمارے تعلقات خوشگوار نہ رہ سکے۔ نرسیں ہمیں مریض سمجھ کر ہم پر اپنے التفات کی بارش برسانا چاہتی تھیں اور ہماری خواہش تھی کہ یہی کام وہ ہمیں صحت مند سمجھ کر انجام دیں۔ سوچنے کے اس بنیادی فرق کی وجہ سے اسپتال کی ایک دایا نے تو ہمیں زبردستی پہیہ دار کرسی پر بٹھا دیا کہ بندۂ خدا کچھ دیر کے لیے تو مریض بنے رہو۔ مریض بننے کی اتنی بھاری فیس اسپتال کو دے رہے ہو تو اس کا فائدہ بھی اٹھاؤ۔ مگر ہم نے مریض بن کے نہ دیا، چنانچہ آپریشن کے دوسرے ہی دن علی الصبح جب ہماری آنکھ کھلی تو ہم غفلت میں اسپتال کے کپڑوں میں ہی چہل قدمی کرنے کے لیے اپنے کمرہ سے باہر نکل کر چلے گئے۔ کیا کریں چہل قدمی کی عادت پچیس تیس برس پرانی ہے۔ اس سے کیونکر دستبردار ہو جائیں۔ اس پر نرسوں نے واویلا مچایا کہ یہ مریض اسپتال میں صحت مندوں کی سی حرکتیں کرتا ہے۔ بعض اوقات تو اپنے بستر سے بھی غائب رہتا ہے۔ ان حالات میں ڈاکٹر ونئے کمار نے ہمیں دو ہی دن میں اسپتال سے چھٹی دینے میں عافیت سمجھی (ہماری نہیں اپنی) اس کی ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہماری مزاج پرسی کے لیے آنے والے احباب بھی اسپتال کے عملہ کے لیے مسئلہ بنتے چلے جا رہے تھے حالانکہ ہمارے احباب کو ہماری علالت کی اطلاع صرف اُڑتے اُڑتے ہی ملی تھی۔ کچھ کرم فرما ایسے بھی تھے جنھوں نے میڈی سٹی اسپتال کی بجائے میڈوین اسپتال سن لیا اور ہماری مزاج پرسی کرنے کے لیے وہاں پہنچ گئے۔ ہمارے بزرگ دوست جناب محسن علی بتاتے ہیں کہ وہ بھاگے بھاگے میڈوین اسپتال گئے۔ ریسپشن پر ہمارا نام بتایا تو انھیں ایک کمرہ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں سچ مچ ایک مجتبیٰ حسین داخل تھے جو اتفاق سے اس وقت بعض ضروری طبی معائنے کرانے کے لیے اسپتال کے کسی شعبہ میں گئے ہوئے تھے۔ البتہ کمرہ میں ان کی خوش اخلاق بیگم صاحبہ ضرور موجود تھیں۔ محسن علی صاحب کو بڑے تپاک سے یہ کہہ کر بٹھایا کہ آپ تشریف رکھیں وہ ابھی آجاتے ہیں۔ محسن علی صاحب نے ہمیں بعد میں بتایا کہ خاتون چونکہ خاصی کم عمر نظر آرہی تھیں اس لیے انھیں ایک لمحہ کے لیے شبہ بھی ہوا کہ شاید وہ غلط جگہ آگئے ہیں۔ (محسن علی صاحب صحیح جگہ پر پہنچ کر اسے غلط سمجھنے کے لیے یوں بھی بڑی شہرت رکھتے ہیں)۔ اتنی

دیر میں وہ ہمارے بارے میں کئی مشکوک اندازے بھی قائم کرتے رہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اصلی مجتبیٰ حسین آئے تو ان کی غلط فہمی رفع ہوئی۔ مگر افسوس کہ ان کے میڈوین سے میڈی سٹی آنے تک ہم گھر واپس ہو چکے تھے۔ اس معاملہ میں ہمارے ایک اور کرم فرما پروفیسر جعفر نظام کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ مزاج پرسی کرنے والوں کی بھیڑ تو یقیناً رہی لیکن ہمیں یہ سہولت ضرور حاصل رہی کہ ان ہی دنوں میں پروفیسر سراج الدین بھی میڈی سٹی اسپتال کے ایک کمرہ میں شریک تھے۔ جب مزاج پرسی کرنے والوں کی بھیڑ بڑھ جاتی تو ہمارے ایک دوست بعض احباب سے کہتے "بھئی اتنی دیر میں آپ ذرا پروفیسر سراج الدین صاحب کی مزاج پرسی کر آیئے۔" جب سراج الدین صاحب کے کمرہ میں لوگوں کی تعداد بڑھ جاتی تو وہ کچھ لوگوں کو ہماری طرف بھگا دیتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون کس کی مزاج پرسی کر رہا ہے۔ اس مسئلہ کا بھی واحد حل یہی تھا کہ ہم جلد از جلد اسپتال سے گھر بھاگ آئیں۔ سو ان دنوں پتے اور احباب کے بغیر ہم آرام سے ہیں اور سچ مچ آرام کر رہے ہیں۔

روزنامہ "سیاست" (جون ۱۹۹۹ء)
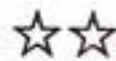
خواجہ معین الدین کی ٹائی

خواجہ معین الدین ہمارے پرانے کرم فرما ہیں۔اس رشتہ سے وہ ہمارے بزرگ بھی قرار پاتے ہیں کہ ان کا شمار ہمارے دو اور بزرگوں یعنی محبوب حسین جگر مرحوم اور عابد علی خاں مرحوم کے مقربین خاص میں رہ چکا ہے۔یہ اور بات ہے کہ اپنے مزاج کی فراخ دلی کی وجہ سے کبھی کبھی وہ ہمیں 'برابری' کا درجہ عطا کرنے کی سعی بھی فرماتے ہیں جسے ہم نے کبھی قبول نہیں کیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خود بڑی تیزی سے 'بزرگی' کی طرف مائل بہ پرواز ہیں۔ایسے میں ہم سے بھی زیادہ بزرگ دکھائی دینے والا کوئی اور بزرگ نظر آجائے تو جی کو بڑا حوصلہ ملتا ہے اور ڈھارس بندھی رہتی ہے۔چودھری محمد علی رودولوی نے اس کیفیت کو اپنے ایک انشائیہ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک زمانہ میں محفلوں میں ان کا تعارف اس طرح کرایا جاتا تھا کہ فلاں کے بھانجے اور فلاں کے بھتیجے ہیں۔اب اس طرح کرایا جاتا ہے کہ فلاں کے چچا اور فلاں کے ماموں ہیں۔یہ سعادت (بشرطیکہ اسے سعادت کہا جا سکے) بزور بازو حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ سعادت فالتو وقت کو یونہی ضائع کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔افسوسناک بات یہ ہے کہ جوں جوں ہم بزرگی کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں ہمارے بزرگوں کی تعداد بھی کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔اسی لئے ہم بزرگوں کو سنبھال کر اور سینت سینت کر رکھنے کے قائل ہیں۔

خواجہ معین الدین کو ہم 'خواجہ بھائی' کہہ کر بلاتے ہیں اور آج ہمیں ان کے بارے میں کچھ لکھنے کا خیال اس لئے آیا ہے کہ پچھلے دنوں وہ اپنے بھائی ڈاکٹر خواجہ غیاث الدین سے ملنے

کے لئے برطانیہ گئے تھے اس سے پہلے بھی وہ تین چار مرتبہ برطانیہ جا چکے ہیں اور جب بھی جاتے ہیں تو ہمیں وہاں سے خط ضرور لکھتے ہیں تا کہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آوے۔ان کا تازہ خط سفر نامہ لندن کی حیثیت رکھتا ہے جس میں انہوں نے وہاں کے سماجی اور تہذیبی حالات پر روشنی ڈالنے کے علاوہ اس بات پر گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے کہ اب برطانیہ میں ٹائی باندھنے کا رواج ختم ہوتا جارہا ہے۔چند وکلا، حکومت کے سینیر عہدیدار اور معدودے چند بزنس مین ہی ہیں جو اس روایت کو اپنے سینہ سے بلکہ گلے سے لگائے ہوئے ہیں ورنہ عام آدمی کے لباس میں سے ٹائی غائب ہو چکی ہے (دیکھا جائے تو مغرب کے باسیوں کے لباس میں سے خود لباس بھی بڑی تیزی سے غائب ہوتا جارہا ہے)۔ایک زمانہ تھا جب یہاں بچہ بچہ ٹائی لگاتا تھا بلکہ بعضے تو ٹائی کے ساتھ ہی پیدا ہوتے تھے۔خط میں جس جگہ خواجہ معین الدین نے ٹائی کا ذکر کیا ہے وہاں ہمیں پانی کے ایک قطرے کا نشان بھی نظر آیا جسے ہم اپنی دانست کے مطابق خواجہ بھائی کے اُس آنسو کا نشان سمجھ رہے ہیں جو ٹائی کی رحلت پر ان کی آنکھ سے گرا ہوگا۔ہوسکتا ہے ہمارا اندازہ غلط ہو کیونکہ خواجہ معین الدین ٹائی کے چلن کے خاتمہ پر خون کے آنسو تو روسکتے ہیں لیکن پانی کے آنسو پر اکتفاء نہیں کرسکتے۔ٹائی سے انھیں جو محبت،اُنس،لگاؤ،رغبت وغیرہ ہے اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ پچاس برسوں سے تو ہم خود انھیں دیکھ رہے ہیں۔انھیں کبھی ٹائی کے بغیر نہیں دیکھا۔ہاں ایک بار ضرور دیکھا تھا جب انھوں نے کسی خاص تقریب کے پیش نظر شیروانی پہن رکھی تھی ٹائی کے بغیر۔ انھیں دیکھ کر ہم کھل اٹھے مگر جب ان سے خواہش کی کہ وہ مستقبل میں بھی ہمیشہ شیروانی ہی پہنا کریں تاکہ ان کی ذات کو ٹائی سے نجات مل سکے تو بڑی متانت سے بولے ''شرفا میں یہ رواج ہے کہ ٹائی شیروانی کے اوپر نہیں باندھتے بلکہ شیروانی کے نیچے باندھتے ہیں۔'' گویا وہ کبھی شیروانی بھی پہنتے ہیں تو اس کے نیچے ٹائی باندھے رہتے ہیں بلکہ ٹائی ہی باندھتے ہیں اور کچھ نہیں باندھتے۔ یوں بھی عام لوگ اب شیروانی کے اندر پریشانی کے سوا کچھ بھی نہیں باندھتے۔ٹائی سے ایسا والہانہ لگاؤ ہم نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔پورے حیدرآباد میں ان کی پہچان اس ٹائی کی وجہ سے ہے۔ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے جب یہ آندھرا پردیش کے سکریٹریٹ میں سابق وزیر داخلہ نواب میر احمد علی خاں کے پرائیویٹ سکریٹری ہوا کرتے تھے تو ایک صاحب کوئی خط اپنے چپراسی کے ذریعہ انھیں روانہ کرنا چاہتے تھے۔چپراسی انھیں پہلے سے نہیں جانتا تھا۔لہذا اس نے جب خواجہ

معین الدین کے حلیہ کے بارے میں پوچھا تو اس سے کہا گیا کہ " میاں! جو کوئی بھی تمہیں ٹائی لگایا ہوا آدمی نظر آئے اسے یہ خط دیدیں"۔ اور یہ خط خواجہ معین الدین کو سچ مچ مل گیا تھا۔ وہ ایک شخصیت ہی نہیں بلکہ خود اپنا 'پوسٹل ایڈرس' بھی ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ خواجہ معین الدین نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ اگر خدانخواستہ وہ بھی الیکشن لڑتے تو یقین مانیے ان کا انتخابی نشان "ٹائی" ہی ہوتا۔ ایک دن ہم نے ٹائی سے ان کے اس والہانہ لگاؤ کی وجہ دریافت کی تو بولے" آدمی ٹائی نہ لگائے تو بالکل ننگا نظر آتا ہے۔ مانا کہ ٹائی بذات خود کوئی لباس نہیں ہے لیکن اسے گلے سے نہ باندھو تو یوں لگتا ہے جیسے پتلون ڈھیلی ہو رہی ہے یا قمیض نیچے سرک رہی ہے۔ یوں سمجھئے کہ ٹائی ہی انسان کے سالم لباس کو باندھے رکھتی ہے۔ ٹائی سے لباس کا وہی رشتہ ہے جو گھر اور قفل کا ہوتا ہے۔ گھر سے باہر جاتے وقت اگر آپ اسے قفل نہ لگائیں تو وہ غیر محفوظ رہتا ہے، ٹائی کو بھی تم لباس کا قفل ہی سمجھو تب یہ بات تمہاری سمجھ میں آئے گی"۔ اور اس طرح ہماری سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی۔ بات صحیح بھی ہے کیونکہ ہمیں تو قفل اور ٹائی کی گانٹھ کی شکل میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

ایسا نہیں ہے کہ ہم نے کبھی ٹائی نہ باندھی ہو، خاص موقعوں پر ضرور باندھتے ہیں بلکہ بندھواتے ہیں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کیونکہ اتنی لمبی عمر گزارنے کے باوجود ہمیں آج تک خود سے ٹائی باندھنا نہیں آیا۔ ہمیں یاد ہے کہ نوجوانی کے دنوں میں ایک خاص تقریب میں شرکت کی غرض سے ہم نے اپنے ایک دوست سے پہلی مرتبہ اپنے گلے کے اطراف ٹائی بندھوائی تھی۔ کچھ دیر تو ہم ٹھیک ٹھاک رہے لیکن بعد میں ہماری طبیعت بگڑنے لگی۔ آنکھیں باہر کو نکل آنے لگیں اور سانس لینے میں بھی تکلیف محسوس ہونے لگی۔ فوراً ایک ڈاکٹر کو طلب کیا گیا۔ ڈاکٹر نے ہماری نبض سے کہیں زیادہ ہماری ٹائی کی نبض کا معائنہ کیا اور جاتے ہوئے ایک نسخہ بھی ہمارے ہاتھ میں تھما گیا۔ ڈاکٹروں کی 'خوش خطی' سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ بعد میں اس نسخہ کو پڑھوانے کے لئے ہم ایک کیمسٹ کے پاس گئے تو اس نے نسخہ کی جو عبارت پڑھی وہ یہ تھی" جناب! مستقبل میں ٹائی سے حتی الامکان پرہیز کیجئے۔ کبھی مجبوری میں ٹائی باندھنا پڑ جائے تو اس کی گرہ قدرے ڈھیلی رکھئے ورنہ یہ مرض جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے"۔ ڈاکٹر کے اس طبی مشورے کے بعد ہم نے جب بھی ٹائی باندھی اس کی گرہ ڈھیلی ہی رکھی۔ مگر ایک بار یوں ہوا کہ ٹائی باندھنے کے بعد ہمیں مجبوراً ایک بس میں سفر کرنا پڑا جس میں اتنی بھیڑ تھی کہ بس کے ڈنڈے کو پکڑنے تک کی گنجائش نہیں تھی۔ ہمارے

سامنے ایک بڑھیا تھی جسے اپنا توازن برقرار رکھنے کے لئے کوئی اور چیز پکڑنے کو نہیں ملی تو اس نے اچانک ہماری ٹائی پکڑلی۔ اس کے بعد جو ہم میں مرض کی وہی پرانی کیفیات پیدا ہونے لگیں تو بس سے اُترتے ہی پریشان ہو کر ڈاکٹر کے پاس گئے۔ ڈاکٹر نے اب کی بار دو پرہیز بتلائے۔ ایک تو یہ کہ ٹائی نہ باندھا کریں۔ دوسرے یہ کہ اگر مجبوری میں ٹائی باندھنا ضروری ہو جائے تو ٹائی باندھ کر سفر بس میں نہ کریں کیونکہ اکثر مسافرین ٹائی والے مسافر کی ٹائی کو بس کے ڈنڈے کے نعم البدل کے طور پر استعمال کرتے ہیں جو جان لیوا بھی ثابت ہوسکتا ہے، بخدا اس کے بعد سے ہم نے ٹائی باندھنا ترک کر دیا ہے۔ بس ٹائی سے بندھے ہوئے خواجہ بھائی کو دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ یقین مانیئے خواجہ معین الدین کے پاس سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ٹائیاں ہونگیں۔ قابل تعریف بات یہ ہے کہ کسی محفل میں جاتے ہیں تو محفل کی مناسبت سے ٹائی کا انتخاب بھی فرماتے ہیں۔ خوشی کا موقع ہوگا تو ایسی ٹائی باندھیں گے کہ جو بھی اس ٹائی کو دیکھے گا خوش ہوتا ہی چلا جائے گا۔ غمی کا موقع ہوگا تو ایسی ٹائی باندھیں گے کہ جب جب آپ کی نظر ان کی ٹائی پر پڑے گی تو آپ کے اندر غم کا سیلاب اُمڈ آئے گا۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو جائیں گے اور ہچکیاں تھمنے کا نام نہ لیں گی۔ آپ یقین کریں کہ اگر یہ کسی کے جنازے میں اپنی کوئی غمگین ٹائی لگا کر آئیں تو ہم مرحوم کو یاد کر کے اتنا نہیں روتے جتنا کہ خواجہ بھائی کی افسردہ ٹائی کو دیکھ کر روتے ہیں۔

آخر میں ہمیں خواجہ بھائی سے دلی ہمدردی ہے کہ صرف یہ پتہ چلانے کے لئے کہ برطانیہ میں ٹائی کا چلن ختم ہوتا جا رہا ہے انھیں ہزاروں روپے خرچ کر کے برطانیہ جانا پڑا۔ یہ کام تو وہ یہیں بیٹھ کر بی بی سی ٹیلی ویژن کا پروگرام دیکھ کر بھی بخوبی انجام دے سکتے تھے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۲۶؍ستمبر ۱۹۹۹)

☆☆

جامعہ سے ظامیا تک

ہم نے پچیس برس پہلے ایک مضمون 'اُردو کا آخری قاری' کے عنوان سے لکھا تھا جس میں ہم نے پیشین گوئی کی تھی کہ ۲۰۰۰ء تک اُردو کے قارئین معدوم ہو جائیں گے اور اُردو اس کے لکھنے والوں اور شاعروں وغیرہ تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔ لوگ اب اس مضمون کے حوالے سے ہم پر طعنے کسنے لگے ہیں کہ میاں اکیسویں صدی اب آیا ہی چاہتی ہے مگر اُردو کے قارئین کا دم اب تک نہیں نکلا۔ یہ اب بھی زندہ ہیں اور کھلے بندوں گھوم رہے ہیں۔ طعنوں کا لہجہ کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے ہم سے کہنا چاہتے ہوں کہ بھئی اب بھی وقت ہے، اٹھاؤ بندوق اور ختم کر دو اُردو کے قارئین کو تا کہ تمہاری پیشین گوئی صحیح ثابت ہو۔ مانا کہ ہم نے غلط پیشین گوئی کی تھی لیکن اس پر اتنا واویلا مچانے کی کیا ضرورت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے یہ پیشین گوئی بھی محض اس لیے کی تھی کہ یہ بعد میں غلط ثابت ہو جائے کیونکہ ہمیں پتہ ہے کہ لوگ ہماری باتوں پر اُلٹا عمل کرتے ہیں۔ ہم مغرب کی طرف جانے کو کہتے ہیں تو وہ مشرق کی طرف نکل جاتے ہیں۔ پھر پیشین گوئیاں تو آئے دن غلط ثابت ہوتی ہی رہتی ہیں۔ خود بیسویں صدی میں چار پانچ موقعے ایسے آئے جب ہمیں بتایا گیا کہ فلاں تاریخ کو قیامت آنے والی ہے۔ ہم نے سچے دل سے قیامت کو گلے لگانے کی تیاریاں بھی مکمل کر لی تھیں بلکہ وہ گناہ بھی جو ہم سے اب تک سرزد نہیں ہوئے تھے ان پر بھی بعجلت ممکنہ عمل کیا کہ مبادا بعد میں ان پر عمل پیرا ہونے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ مگر قیامت کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ اس کے باوجود ہم نے کبھی یہ نہیں کیا کہ قیامت کی آمد کی پیشین گوئی کرنے والے صاحب کا گریبان

ہی پکڑ لیتے کہ میاں بتاؤ قیامت کیوں نہیں آئی۔ اگر یہ کسی وجہ سے نہیں آسکی تو اب اسے پکڑ کر لے آؤ۔ ہم تو قیامت کے لیے مرے جا رہے ہیں۔

ہم نے مانا کہ اُردو کے قارئین اب بھی بقید حیات ہیں لیکن ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن سے آپ ان کا 'اسم شریف' جاننے کی کوشش کریں تو پہلے تو آپ کا منہ تکنے لگ جاتے ہیں، پھر اردو کے کسی بچے کھچے قاری سے خود اپنا 'اسم شریف' پوچھ بیٹھتے ہیں۔ بعد میں الٹا ہم سے شکایت کرتے ہیں کہ آپ نے سیدھے سیدھے نام کیوں نہیں پوچھا، اسم شریف کیوں پوچھا، حالانکہ یہ تو بڑا آسان سوال تھا۔ ایک بار ایک صاحب کی طبیعت ناساز ہوئی تو ہم نے اُن کی مزاج پرسی کرنے کی خاطر کہا "سنا ہے کہ مزاج دشمناں ناساز ہے۔" بولے "ایسی ہماری قسمت کہاں کہ دشمنوں کے مزاج ناساز ہونے لگیں۔ ہمارے دشمن تو ہٹے کٹے، بھلے چنگے دندناتے پھر رہے ہیں اور ہم ہیں کہ چار دنوں سے بخار میں مبتلا ہیں۔" ایک بار ایک نوجوان کے حلیہ میں اپنے ایک دوست کی شباہت کو پا کر ہم نے اس سے پوچھا "میاں! کیا تم ہمارے فلاں دوست کے فرزند دلبند ہو؟" بولا "لاحول ولا! میں کیوں ان کا فرزند دلبند ہونے چلا۔ میں تو ان کا بیٹا ہوں۔" ایک بار ہم نے ایک ذی حیثیت ہستی کو نہایت مودبانہ انداز میں خط لکھا تھا اور آخر میں ازراہ انکسار اپنے نام سے پہلے "کمترین" لکھ کر دستخط کر دیئے تھے۔ ان کے پاس سے جواب آیا تو لفافہ پر پتہ میں ہمارا نام اس طرح لکھا تھا "جناب کمترین مجتبیٰ حسین"۔ ایک اور صاحب کو 'آنجہانی' کا لفظ کچھ اتنا پسند ہے کہ جب بھی ملتے ہیں ہمیں آنجہانی کہہ کر ہی مخاطب کرتے ہیں۔ بہر حال یہ تو طے ہے کہ اُردو کا وہ قاری جو اپنے اسم شریف سے واقف تھا، جو مزاج دشمناں کا نباض تھا، جو کسی کا فرزند دلبند تھا اور جو اپنے سوائے کسی اور کو کمترین نہیں سمجھتا تھا، اب آنجہانی ہو چکا ہے۔ دور کیوں جایئے خود ہم نے تیس برس پرانی اپنی ایک تحریر نکال کر پڑھی تو بخدا اسے سمجھنے کے لیے ہمیں 'فرہنگ آصفیہ' کی مدد لینی پڑی۔ اُردو کے کتنے ہی الفاظ جو ایک زمانہ میں ہماری نوکِ زبان پر رہتے تھے اب نہیں رہتے۔ چنانچہ ان الفاظ کو نوکِ زبان سے اٹھا کر اپنے سینہ میں دفن کر دیا ہے۔ مبادا آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم اُردو کے قاری کے ختم ہونے کا پھر سے اعلان کر رہے ہیں۔ قاری تو ختم نہیں ہوا ہے البتہ زبان دھیرے دھیرے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ انگریزی زبان کے بارے میں کہیں پڑھا تھا کہ روزانہ اس زبان میں مختلف شعبہ ہائے حیات سے ڈیڑھ سو نئے الفاظ داخل ہوتے ہیں۔ جب کہ

ہمارا خیال ہے کہ اُردو سے روزانہ بھلے ہی ڈیڑھ سو الفاظ نہ سہی پانچ دس الفاظ تو ضرور خارج ہوتے چلے جارہے ہیں۔ ہمیں اس کالم کو لکھنے کا خیال اصل میں اس لیے آیا کہ پچھلے دنوں دہلی کے اُردو اخبار 'قومی آواز' میں دہلی سرکار کی اُردو نوازی کے نمونے کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف جانے والے راستہ پر آویزاں ایک سائین بورڈ کی تصویر شائع ہوئی ہے جس میں جامعہ کا نام نہایت جلی حروف میں 'ظامیا' لکھا گیا ہے۔ تصویر کے نیچے جو عبارت دی گئی ہے اس کے مطابق دلی سرکار 'اوکھلا' کو 'عوکھلا' غالب کو 'گالب' اور جواہر لال کو 'جواحرلال' لکھتی ہے۔ یہ شکایت بھی کی گئی ہے کہ دہلی کے تعمیرات عامہ کے وزیر پرویز ہاشمی روزانہ اسی راستہ سے گذرتے ہیں لیکن انھوں نے بھی دلی سرکار کے املا کو ٹھیک کرانے کی کوشش نہیں کی جبکہ یہ سائین بورڈ پچھلے چار مہینوں سے لگا ہوا ہے۔ یہ نہایت نامناسب بات ہے کہ آپ دہلی کے وزیر تعمیرات عامہ پرویز ہاشمی سے یہ توقع رکھیں کہ وہ اپنی سرکار کا اُردو املا ٹھیک کراتے پھریں۔ ان سے آپ سڑکیں ٹھیک کرانے کے بارے میں تو کہہ سکتے ہیں لیکن املا ٹھیک کرانے کا مطالبہ سراسر ناواجب ہے۔ وزراء صاحبان یوں بھی بہت مصروف رہتے ہیں۔ کہیں فیتہ کاٹنا ہوتا ہے۔ کئی استقبالیہ جلسوں میں جانا ہوتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ملک کو ترقی کی طرف لے جانا ہوتا ہے۔ ایک آدمی کیا کیا کرے۔ اگر وہ املا ٹھیک کرانے میں لگ گئے تو ملک کیسے ترقی کرے گا۔ پھر سوچنے والی بات یہ ہے کہ خود جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اُردو کا ایک بڑا شعبہ موجود ہے جس سے ملک کے کئی نامی گرامی اساتذہ اور نقاد وابستہ ہیں بلکہ بعض کے گھر تو اسی سائین بورڈ کے عقب میں واقع ہیں۔ نام ہم ان کے نہیں بتائیں گے کیونکہ ان سے ہمارے گہرے مراسم ہیں اور ہم ان کے علم و فضل کے نہ صرف قایل ہیں بلکہ قتیل بھی ہیں۔ یہ بھی تو روزانہ اسی سائین بورڈ کے سامنے سے آتے جاتے ہیں۔ لیکن دیکھا جائے تو اُردو اساتذہ کا بھی یہ منصب نہیں ہے کہ وہ سڑکوں پر لگے ہوئے سائین بورڈوں کو کتابت کی غلطیوں سے پاک کراتے پھریں۔ پھر جب وہ اپنے طالب علموں کے املا ہی ٹھیک نہیں کرا سکتے تو دلی سرکار کے املا ٹھیک کرانے کی زائد ذمہ داری ان پر کیوں عائد کی جائے۔ ہر آدمی اپنی تنخواہ کے حساب سے کام کرتا ہے۔ زائد ذمہ داری عائد کیجئے تو پھر تنخواہ میں بھی اضافہ فرمائیے۔ ہم پچھلے ستائیس برسوں سے دہلی میں مقیم ہیں اور ہمیں یہاں رہنے کا اتنا تجربہ ہو چکا ہے کہ کبھی سائین بورڈ پر اُردو عبارت کو نہیں دیکھتے۔ انگریزی عبارت سے کام چلا لیتے ہیں۔ اسی

لیے آج تک کبھی نہیں بھٹکے۔ پندرہ سولہ برس پرانی بات ہے جب راؤز ایونیو میں نئی دہلی میونسپل کارپوریشن کی جانب سے ایوان غالب کی سڑک کا کتبہ لگایا گیا تو اس پر نہایت جلی حروف میں اُردو عبارت لکھی گئی تھی 'ایوان گالب مارغ'۔ یہ اصل میں 'ایوان غالب مارگ' کا آسان املا تھا۔ اس پر پنجابی کے مشہور شاعر اور ہمارے دوست تارا سنگھ کامل نے (جو اب آنجہانی بن چکے ہیں) بڑا ہنگامہ مچایا تھا اور اس کی تصویر انگریزی اخبار 'اسٹیٹسمین' میں شائع کرائی تھی۔ ہم نے اس وقت بھی تارا سنگھ کامل کو سمجھایا تھا کہ بظاہر اس املا میں کوئی فاش غلطی نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ غالب کے 'غ' کو مارگ کے 'گ' کی جگہ لکھا گیا ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیونکہ حروف کی تعداد میں تو کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اہل نظر جب بھی اس کتبہ کو دیکھیں گے تو مارغ کے 'غ' کو گالب کے 'گ' کی جگہ رکھ دیں گے۔ مگر تارا سنگھ کامل نے جو غالبؔ کے پرستار اور عاشق تھے وہ شور مچایا کہ دو تین دن کے اندر ہی نئی دہلی میونسپل کارپوریشن نے اس بورڈ کو کتابت کی غلطی سے پاک کر دیا تھا۔ یہ پندرہ سولہ برس پرانی بات ہے جب بیشتر سکھ حضرات بھی بہت اچھی اُردو جانتے تھے۔ اب یہ بھی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ جب احتجاج کرنے والے ہی نہیں رہے تو ایسی غلطیوں کی طرف کس کی نظر جائے۔ پھر ان میں سے بیشتر سڑکوں کے سائین بورڈ ایسے خطاط حضرات کی مدد سے لکھوائے جاتے ہیں جو سرے سے یا تو اُردو ہی نہیں جانتے یا پھر قیاس اغلب ہے کہ خطاطی کے عالمی شہرت یافتہ ماہر ہوتے ہیں کیونکہ بعض مشہور و معروف خطاط حضرات کے بنائے ہوئے طغروں کو دیکھ کر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں لکھا کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ان طغروں کا ایک حرف دوسرے حرف کا گریبان کچھ اس طرح پکڑا رہتا ہے اور تیسرا حرف چوتھے سے کچھ اس طرح نبرد آزما رہتا ہے اور پانچواں حرف چھٹے حرف سے کچھ یوں بغلگیر ہوتا رہتا ہے کہ ہمارے پلّے کچھ بھی نہیں پڑتا۔ اور جو چیز آدمی کی سمجھ میں نہ آئے وہ بالآخر آرٹ بن جاتی ہے۔ ہم دہلی کی سڑکوں کے سائین بورڈوں کو بھی کسی ماہر خطاط کے بنائے ہوئے طغرے ہی سمجھتے ہیں۔ اس لیے اُردو میں کیا لکھا ہے اسے سمجھنے کے لیے انگریزی عبارت کو پڑھ لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ہم ایک سڑک 'بھیشم انیم بھارتی روڈ' سے اکثر گزرتے ہیں جس کے سائین بورڈ کے اُردو کاتب کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ جلیبیاں کھانے کا بڑا شوقین معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس جلیبی رقم کاتب نے اس سڑک کے پورے نام کو کچھ اس ڈھنگ سے لکھا ہے کہ ہمیں اس

میں جگہ جگہ جلیبیاں ہی جلیبیاں نظر آتی ہیں۔ پھر بھارتی میں جو دو چشمی ''ھ'' ہے اس کی شکل کچھ ایسی بنائی ہے کہ آپ کو نہ صرف جلیبی دکھائی دیتی ہے بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اس میں سے شیرہ بھی ٹپکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مزید غور سے دیکھیں تو بعد میں خود آپ کے منہ سے رال ٹپکنا شروع ہو جاتی ہے۔

صاحبو! ہم یہ مانتے ہیں کہ ہماری پیشین گوئی کے باوجود اُردو آج بھی زندہ ہے لیکن ذرا یہ بھی تو سوچیے کہ کس طرح زندہ ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' (فروری ۲۰۰۰ء)

مہرباں کیسے کیسے

صاحبو! یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ہم مذاق مذاق میں بہت سی غیر ضروری باتیں یونہی لکھ جاتے ہیں جن کا مقصد تفریح طبع کے سوائے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اب اگر کچھ لوگ ٹھٹھا مخول والی ہماری باتوں پر سنجیدہ ردعمل کا اظہار کرنے لگے ہیں تو یہ سراسر غلط بات ہے اور اس کے جو بھی نتائج برآمد ہوں گے اس کے وہی ذمہ دار ہوں گے، ہم نہ ہوں گے۔ ایک بات اور عرض کردیں کہ ہم اپنے بارے میں کچھ کہنے سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں۔ پھر بھی لوگ ہمیں کچھ ایسے ڈھنگ سے چھیڑتے ہیں کہ ہمیں کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر کچھ عرصہ پہلے ہماری ایک خاتون کرم فرما نے یہ شکایت کی تھی کہ ہمارے کالم کے ساتھ چھپنے والی تصویر اتنی سنجیدہ کیوں ہے اور یہ کہ ہم مسکراتے کیوں نہیں۔ خیر اس کا جواب تو ہم نے جیسے تیسے دے دیا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے ہم نے مذاق مذاق میں لکھا تھا کہ ہم گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کے انتظار میں دہلی میں رُکے ہوئے ہیں ورنہ ہم اب تک حیدرآباد واپس چلے جاتے۔ اپنی بات کو مزید مزیدار بنانے کے لئے ہم نے آخر میں ایک جملہ یہ بھی لکھا تھا کہ ''حیدرآباد میں ہماری مٹی ہمارا انتظار کر رہی ہے''۔ ارے صاحب! لوگوں نے بس اس ایک جملہ کو پکڑ لیا اور ہمارے پورے کالم کو بالکل بھول گئے۔ حیدرآباد سے دوستوں کے فون تو آئے ہی لیکن بعض احباب نے حیدرآباد کی مٹی کے حوالہ سے تحریری طور پر بھی ہماری مٹی پلید کرنے کی کوشش کی۔ ان میں پیش پیش ہمارے دوست ڈاکٹر طیب انصاری تھے جو کسی کی بھی مٹی پلید کرنے کے معاملہ

میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے تو اخبار میں ایک مراسلہ چھپوا کر ہمیں پابند کیا کہ ہم حیدر آباد بالکل نہ آئیں اور جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔ اس مراسلہ کو پڑھ کر ہمیں معاً شکسپئر کا ڈرامہ 'جولیس سیزر' یاد آ گیا جس میں جولیس سیزر اپنے قتل سے پہلے اپنے حبیب لبیب بروٹس کو دشمنوں کی صف میں پا کر حیرت اور تاسف کے ساتھ کہتا ہے "You too Brutus"۔ بھلا بتائیے طیب انصاری جیسے دوست بھی ہم سے کہنے لگے ہیں کہ ہم حیدر آباد واپس بالکل نہ آئیں اور جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔ آپ نے اُس افیونی کا قصہ تو ضرور سنا ہوگا جو ترنگ میں کہیں چلا جا رہا تھا کہ اس کے کانوں میں "بچاؤ بچاؤ" کی آوازیں آنے لگیں۔ اُس نے کچھ دیر تک رُک کر صورتحال کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ ایک آدمی مین ہول میں گر کر باہر نکلنے کی ساری کوشش میں ناکام ہو چکا ہے اور وہ کسی کی مدد کا طلبگاری ہے۔ افیونی نے پہلے تو مین ہول میں جھانک کر دیکھا۔ کچھ سوچا، پھر آگے کی طرف جاتے ہوئے کہنے لگا "میاں! جہاں بھی رہو خوش رہو"۔ طیب انصاری نے بھی ہمارے ساتھ کم و بیش ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے پرانے دوست ہونے کے ناتے ہم ان کے مشورے پر ضرور عمل کریں گے اور جہاں بھی رہیں گے خوش ہی رہیں گے۔ انھیں ہمارے اس جملہ پر سخت اعتراض ہے جس میں ہم نے کہا تھا "حیدر آباد میں ہماری مٹی ہمارا انتظار کر رہی ہے"۔ ان کا کہنا ہے کہ اس جملہ نے انھیں دہلا کر رکھ دیا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ایک اعتبار سے ہم یہاں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے کیونکہ ہم طیب انصاری کو سچ مچ دہلانا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جب بھی ان کے تنقیدی مضامین پڑھتے ہیں تو انھیں پڑھتے کم ہیں اور دہلتے زیادہ ہیں۔ ہمارا ایک جملہ انھیں کیا دہلا سکتا ہے جو ان کے مضامین ہمیں مستقلاً دہلاتے رہتے ہیں۔

ہمیں طیب انصاری سے شکایت ہے کہ انھوں نے 'حیدر آباد کی مٹی' والے جملہ کو نہایت سنجیدگی سے قبول کیا ہے حالانکہ ہم نے یہ بات بھی مذاق میں کہی تھی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ جو کوئی بھی حیدر آباد کی مٹی میں مل جاتا ہے وہ کم از کم مرنے کے بعد بہت 'پرسکون زندگی' گذار سکتا ہے۔ دوسرے شہروں میں تو 'حیات بعد الموت' کے نظریہ کے زیر اثر آدمی کو پوری طرح مرنے نہیں دیا جاتا کیونکہ ان شہروں کے باسی اس شخص کو اُس کی سالگرہ اور برسی پر بھولے بھٹکے یاد بھی کر لیتے ہیں۔ جب کہ حیدر آباد میں مرنے کے بعد مُردے کو اس طرح تنگ نہیں کیا جاتا۔ غالب نے کہا تھا ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

کیسے کیسے گوہر نایاب حیدر آباد کی مٹی میں مل گئے لیکن آج انھیں کوئی یاد نہیں کرتا۔ حیدر آباد کی مٹی کی خوبی یہ ہے کہ آدمی ایک بار اس میں مل جائے تو پھر لوگوں کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ مٹی کے نیچے کیا کر رہا ہے بلکہ یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ جب وہ مٹی کے اوپر تھا تو کیا کرتا تھا۔ مُردے کو جو ابدی سکون چاہئے وہ اس مٹی میں کچھ زیادہ ہی میسر آجاتا ہے۔ اور ہم نے اسی خیال کو ذہن میں رکھ کر اپنی مٹی کی بات کی تھی۔ طیب انصاری نے یہ سمجھا کہ ہم اپنی مٹی کی طرف محض اس خیال سے آنا چاہتے ہیں کہ لوگ ہمیں یہاں بعد میں یاد رکھیں گے۔ ہر دم ہمارے نام کی مالا جپتے رہیں گے، سال کے سال ہمارا عرس وغیرہ منائیں گے اور قوالی کی محفلیں منعقد کر کے مچھروں کا خاتمہ کریں گے۔ بھئی ہم نے تو صرف مذاق میں یہ بات لکھی تھی۔

سچ پوچھئے تو ہمارے اس جملہ کو نہ صرف حیدر آباد کے احباب نے بلکہ دہلی کے احباب نے بھی غلط رنگ میں لیا ہے۔ اب دہلی کے احباب ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ ہم جلد از جلد حیدر آباد واپس ہوں بلکہ دو چار احباب نے واپسی کے کرایہ کی رقم بھی ہمیں پیشگی ادا کردی ہے۔ انھیں یہ غلط فہمی ہے کہ ہم محض اس وجہ سے دہلی میں رُکے ہوئے ہیں کہ ہمارے پاس واپسی کا کرایہ نہیں ہے۔ گویا ہماری حالت بھی حالیہ اسمبلی انتخابات کے بعد بھارتیہ جنتا پارٹی کی سی ہوگئی ہے جو ریاستوں میں تو اقتدار سے محروم ہو چکی ہے اب اس سے کہا جا رہا ہے کہ وہ مرکز میں بھی اقتدار کی کرسی چھوڑ دے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ یہ پہلا موقع ہے جب ہمیں بھارتیہ جنتا پارٹی سے دلی ہمدردی ہو رہی ہے کیونکہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے بہی خواہ اور ہمدرد بھی ویسے ہی ہیں جیسے ہمارے حق میں طیب انصاری ہیں۔

بات صرف طیب انصاری کی ہوتی تو ہم تب بھی خاموش رہتے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہماری ایک اور کرم فرما طیبہ سلطانہ ضیائی نے بھی اپنے ایک مراسلے کے ذریعہ طیب انصاری کی حمایت کرتے ہوئے ہمیں ''جہاں رہو خوش رہو'' والے مشورہ سے نوازا ہے۔ آخر میں یہ دعا بھی فرمائی ہے کہ ہمارے بول پھول کی وہ پتی بن جائیں جس سے ہیرے کے جگر کو کاٹا جا سکے۔ اگر خدانخواستہ یہ دعا قبول ہوگئی تو بہت جلد ہم قلم چلانے کی بجائے بڑھئی کا رندا چلاتے ہوئے پائے جائیں گے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان دنوں ٹیلی ویژن پر 'فیوی کول' (Fevicol) کا ایک اشتہار آرہا ہے جس میں ایک باورچی انڈے کو توڑنا چاہتا ہے مگر وہ اتنا مضبوط ہے کہ ہتھوڑے کی ضرب

کے باوجود نہیں ٹوٹتا۔ اس ناکام کوشش میں انڈا اچھل کر پیتل کے برتن سے جاٹکراتا ہے۔ نتیجہ میں برتن ٹوٹ جاتا ہے مگر پھر بھی انڈا نہیں ٹوٹ پاتا۔ بالآخر باورچی حیرت سے اُس مرغی کی طرف دیکھتا ہے جو اس انڈے کی خالق ہے۔ تب اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ مرغی 'فیوی کول' کھا رہی ہے۔ اچانک اسے پتہ چل جاتا ہے کہ اس انڈے کے نہ ٹوٹنے کا اصل سبب کیا ہے۔ یقین مانئے طیبہ سلطانہ ضیائی کا مراسلہ پڑھنے کے بعد ہمارا جی یہ چاہ رہا ہے کہ ہم لکھنے سے پہلے اپنے قلم میں روشنائی کی بجائے 'فیوی کول' ڈال لیا کریں تاکہ ہماری باتیں ہیرے کے جگر کو کاٹنے کی اہل بن سکیں۔ سنا ہے کہ علامہ اقبالؔ کے زمانہ میں پھول کی پتی سے ہیرے کے جگر کو کاٹنے کا رواج عام تھا۔ اب تو پھول کی پتی سے کسی کی جیب تک نہیں کاٹی جاسکتی۔ یہ نہ سمجھئے کہ ہمیں اپنے مہربانوں سے کوئی شکایت ہے کیونکہ وہ تو پوری نیک نیتی کے ساتھ ہمارے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ہم کتنے غیر سنجیدہ اور نالائق آدمی ہیں۔ پچھلے ہفتہ ہی ہمارے ایک اور بزرگ کرم فرما جوّاد رضوی نے پیاز کے بارے میں ہمارے ایک کالم کے حوالے سے لکھا تھا کہ ہماری تحریریں سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ جوّاد رضوی ہمارے بزرگ ہونے کے علاوہ جہاندیدہ آدمی بھی ہیں۔ انھیں ہماری حالت کا اندازہ ہے اور وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہی تو وہ واحد دعوت ہے جو ہم دوستوں کو دے سکتے ہیں۔ کھانے پینے کی دعوت دینے کے ہم اہل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آئے دن اپنے پڑھنے والوں کو 'دعوت فکر' دیتے ہیں، شاعر دوستوں کو 'دعوت کلام' اور 'دعوت سخن' بھی دیتے ہیں۔ بیچارے اتنا خوش ہوتے ہیں کہ بریانی کی دعوت میں شرکت کرکے بھی اتنا خوش نہ ہوں۔ ایک بار ہم نے پوری نیک نیتی کے ساتھ اپنے گھر پر ایک 'دعوت فکر' کا اہتمام کیا تھا۔ باضابطہ دعوت نامہ بھی چھپوایا تھا کہ ''مکرمی۔ تسلیم! فلاں تاریخ کو ہمارے غریب خانہ پر 'دعوت فکر' کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ جس میں شرکت کرکے ہمیں ممنون ہونے کا موقع عطا فرمائیں۔ نوٹ! دعوت فکر میں شرکت کے خواہشمندوں سے التماس ہے کہ وہ بھلے ہی اپنے ساتھ اپنی فکر کو نہ لائیں مگر اپنا کھانا اپنے ساتھ ضرور لیتے آئیں۔ چشم براہ'' اب آپ سے کیا بیان کریں کہ ایک بھی دوست اس 'دعوت فکر' میں نہ آیا۔ یہ بات ہمارے لئے تب بھی 'لمحہ فکر' تھی اور آج بھی ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۶ر دسمبر ۱۹۹۸ء)

☆☆

حُب الوطنی کی خوراک

صاحبو! ویسے تو ہم شروع ہی سے بڑے محب وطن اور دیش بھگت وغیرہ رہے ہیں لیکن پچھلے دنوں ہم نے غلطی سے حب الوطنی اور دیش بھگتی کی خوراک ضرورت سے کچھ زیادہ ہی لے لی۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ پچھلے ہفتہ ہم نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ ٹریننگ کے اس ورکشاپ میں چلے گئے تھے جس میں ہندوستانی زبانوں کے ماہرین کو اس مقصد سے بلایا گیا تھا کہ وہ آزادی سے پہلے کے اُن مشہور گیتوں اور نظموں کو جمع کریں جنہوں نے ملک کی آزادی کی تحریک میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کیا تھا اور جن گیتوں کو ملک کے کونے کونے میں گایا جاتا تھا۔ نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ ہمارا وہ پرانا دفتر ہے، جہاں سے ہم نے سترہ برسوں تک کوئی معقول کام کیے بغیر، ہر مہینہ نہایت معقول تنخواہ حاصل کی ہے۔ سوچا کہ جس دفتر میں سترہ برسوں تک کوئی کام نہیں کیا اب اگر وہاں سات دن بھی جی لگا کر کام کر لیا جائے تو کیا بُرا ہے۔ آسامی، بنگالی، بھوجپوری، گجراتی، مراٹھی، کنڑ، کشمیری، ملیالم، منی پوری، اڑیا، پنجابی، راجستھانی، سندھی، تلگو، کونکنی، ہندی اور اُردو کے عالم جمع تھے۔ ہمیں اُردو کے ماہر کی حیثیت سے اس لئے بھی بلایا گیا تھا کہ پچیس برس پہلے ہم نے ڈاکٹر خلیق انجم کے ساتھ مل کر ایک کتاب مرتب کی تھی جس میں برطانوی راج کے زمانہ میں ضبط شدہ گیتوں اور نظموں کو اکٹھا کیا گیا تھا۔ شریمتی اندرا گاندھی نے 1974 میں اس کتاب کی رسم اجرا انجام دی تھی۔ اتنی سی بات پر لوگوں نے سمجھ لیا کہ ہم پکے محب وطن اور دیش بھگت ہیں۔

اس پس منظر کے ساتھ جب ہم ان نظموں اور گیتوں کا از سر نو جائزہ لینے بیٹھے تو کتنی ہی باتیں یاد آ گئیں۔

......سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

......تو زندہ ہے تو زندگی کی جیت میں یقین کر

......قدم قدم بڑھائے جا خوشی کے گیت گائے جا

......یہ جنگ ہے جنگ آزادی، آزادی کے پرچم کے تلے

یہ وہ نظمیں ہیں جو ہمیں آج بھی یاد ہیں بلکہ نوجوانی کے دنوں میں تو ہم انھیں باقاعدہ گایا بھی کرتے تھے۔ کچھ دیر کے لیے خیال آیا کہ ہمارے ہم وطنوں کی اُس حب الوطنی کو آخر کیا ہو گیا جو ابھی پچاس ساٹھ برس پہلے تک ہم میں موجود تھی۔ لوگ ہتھیلی پر اپنا سر رکھ کر نکلتے تھے کہ ملک کی آزادی کے لئے اس کی ضرورت ہو تو لے لو۔ کتنے ہی نوجوان تھے جو ہنستے ہنستے پھانسی کے تختہ پر چڑھ جایا کرتے تھے۔ پہلے ہر ایک کے دل میں 'سرفروشی' کی تمنا ہوتی تھی مگر اب 'ضمیر فروشی' کی تمنا ہر ایک کے دل میں پائی جاتی ہے۔ پچاس ساٹھ برس کے اندر اندر ہماری حب الوطنی کیا سے کیا ہو گئی۔ شہریوں کی بھلائی کی بات تو دور کی رہی اب تو ہم مویشیوں کا چارہ تک کھا جاتے ہیں۔ ہمیں اپنی نوجوانی کے وہ ہنگامہ خیز دن یاد آ گئے جب ہم بھی جدوجہد آزادی میں کود پڑنے کو تیار ہو گئے تھے۔ اگر چہ اس وقت تک خود انگریزوں نے اپنا بوریا بستر باندھنا شروع کر دیا تھا لیکن پھر بھی ہماری خواہش تھی کہ ہم بھی جاتے ہوئے انگریز کو ایک زوردار دھکا دیں تا کہ آزادی کے متوالوں میں ہمارا شمار بھی ہونے لگے۔ لیکن ہمارے ساتھ مشکل یہ تھی کہ ان دنوں ہم سے بڑے پانچ بھائی پہلے ہی سے جدوجہد آزادی میں حصہ لے رہے تھے۔ یہ مڈل اسکول کے دنوں کی بات ہے۔ ہمارے والد صاحب نے ہمیں آزادی کے لئے نکلنے والے ایک جلوس میں سرگرم حصہ لیتے ہوئے دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ ہمارا کان پکڑ کر گھر لے آئے اور ڈانٹا کہ "میاں تمہارے پانچ بھائی تو پہلے ہی سے اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر تم بھی جدوجہد آزادی میں کود پڑو تو گھر کا سودا سلف کون لائے گا۔ پانی بجلی کا بل کون جمع کرے گا۔ تم لوگوں نے گھر کے کاموں سے بچنے کا ایک اچھا بہانہ ڈھونڈھ لیا ہے۔ انگریز تو اپنے آپ ہی جا رہا ہے۔ اگر اُس نے کسی جلوس میں تم جیسے نوجوانوں کو دیکھ لیا تو کہیں جانے کا ارادہ نہ بدل دے"۔ اگر چہ بعد میں گھر کا کام کاج ہی کرتے

رہے لیکن وہ ہنگامہ خیز دن ہمیں آج بھی اچھی طرح یاد ہیں۔ بہرحال پورا ایک ہفتہ ہم نے حب الوطنی کے ان گیتوں کے درمیان گذارا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ حب الوطنی کے ان گیتوں میں ایک ہی بات کوئی بار دوہرایا جاتا ہے۔ جیسے موہن لال دویدی کا مشہور گیت ہے ''بڑھے چلو بڑھے چلو''۔ اس میں ہر بند کے بعد نوجوانوں کو پھر سے کہا جاتا ہے۔ ''بڑھے چلو۔ بڑھے چلو''۔ دوسری نظموں میں بھی دوہرانے کا یہی عمل جاری رہتا ہے۔ گویا ''سُنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر'' والا معاملہ ہوتا ہے۔ اب آپ سے کیا چھپائیں کہ پورے ایک ہفتہ تک ان گیتوں کا ورد کرنے کی وجہ سے ہمیں ایک ہی بات کو دو دو مرتبہ کہنے کی عادت سی پڑ گئی۔ ہم نے بے خیالی میں اپنی بیوی سے کہہ دیا ''کھانا لگاو۔ کھانا لگاو، پانی پلاؤ۔ پانی پلاؤ''۔ اس پر ہماری اہلیہ نے کہا ''میں دیکھ رہی ہوں کہ پچھلے ایک ہفتہ سے تم ایک ہی بات کو بار بار دوہرانے لگے ہو''۔ ہم نے وجہ بتائی کہ دیش بھگتی کے گیتوں کو بار بار پڑھنے کی وجہ سے یہ عادت پڑ گئی ہے۔ بولیں ''کیا تم مجھے بھی قوم سمجھتے ہو کہ جب تک بات کو دوہرایا نہ جائے تب تک بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی''۔ ان گیتوں کا انتخاب کرتے وقت یہ احساس بھی ہوا کہ جدوجہد آزادی کے جو مقبول ترانے تھے وہ زیادہ تر اُردو میں ہی لکھے گئے تھے اور ان کے لکھنے والے کوئی بڑے شاعر بھی نہیں تھے۔ آزاد ہند فوج کے اکثر ترانے تو گمنام لوگوں کے لکھے ہوئے تھے۔ بعض تو ایسے بھی تھے جن میں علم عروض کی پابندیوں کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ ان کا مقصد تو صرف یہ ہوتا تھا کہ لوگوں میں آزادی کے لئے ایک جوش اور ولولہ پیدا کیا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ ان گیتوں نے ایک زمانہ میں حب الوطنی کے جس بے پناہ جذبہ کو فروغ دیا تھا آج وہ جذبہ مفقود ہو چکا ہے۔ آج آپ کسی کو ''بڑھے چلو۔ بڑھے چلو'' کہتے ہیں تو وہ حیرت سے آپ کا منہ تکنے لگ جاتا ہے۔ ایک پرانی بات یاد آ گئی۔ ایک بار ہم ٹرین میں سفر کر رہے تھے کہ ایک بھکاری ہمارے پاس چلا آیا۔ ہم نے اس سے کہا ''میاں! آگے بڑھو''۔ اس پر وہ بولا ''صاحب! آگے بڑھ کر کیا کروں۔ آگے بھی تو آپ ہی کی طرح کے ننگے بھوکے بیٹھے ہوئے ہیں''۔

اس ورکشاپ کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہماری ملاقات کئی زبانوں کے ماہرین سے ہوگئی۔ تلگو کے ماہر پروفیسر رام کرشنا ملے، بھوجپوری کے آدتیہ نارائن سنگھ بھی ملے جنھوں نے Collected Works of Mahatma Gandhi کے پراجکٹ پر برسوں کام کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے

کہ وہ گاندھی جی کے بارے میں خود گاندھی جی سے زیادہ جانتے ہیں۔ پنجابی کے ماہر ڈاکٹر چمن لال بھی ملے جو پٹیالہ یونیورسٹی میں ہندی شعبہ کے سربراہ ہیں۔ ان سے ہماری پرانی یاد اللہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پنجاب نے آزادی کے جتنے متوالے پیدا کئے اتنے کسی اور علاقہ نے پیدا نہیں کئے۔ مگر افسوس کہ انگریز جب گئے تو پنجاب کے دو ٹکڑے کر گئے۔ کسی نے سچ کہا تھا کہ انگریز جب تک اس ملک میں رہے تاریخ بناتے رہے۔ جاتے وقت اس ملک کا جغرافیہ بگاڑ گئے۔

انگریزی کے اُستاد ناصر الدین خان نے ان گیتوں کا انگریزی میں بے حد خوبصورت ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس پر ہماری رائے تھی کہ ان نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کرنے میں ان لوگوں نے بہت دیر کر دی۔ اگر آزادی سے پہلے ہی ان نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا جاتا تو ہو سکتا ہے انگریز اس ترجمہ کو پڑھ کر اپنے آپ ہی اس ملک کو چھوڑ کر چلے جاتے۔ انھیں تو پتہ ہی نہیں تھا کہ ان نظموں میں کیا لکھا ہے۔ اس ورکشاپ کے داعی ہمارے دوست پروفیسر ارجن دیو اور ان کی اہلیہ اندرا ارجن دیو تھے۔

غرض اس ورکشاپ کے ذریعہ اپنے اندر حب الوطنی کو از سر نو چمکا کر فارغ ہوئے تو اطلاع آئی کہ ہمیں امریکہ کے سفر پر روانہ ہونا ہے۔ ہم جب بھی ملک سے باہر جاتے ہیں تو ہماری حُب الوطنی کی لو کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جب ملک میں ہوتے ہیں تو نہ جانے ہماری حُب الوطنی کو کیا ہو جاتا ہے۔ امریکہ جیسے امیر ملک میں بھی ہمیں اپنی 'غریب الوطنی' کا احساس ستاتا رہے گا۔ ؎

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

یوں بھی ہم جب یہاں نہیں ہونگے تو آپ خوش تو رہیں گے ہی۔

روزنامہ ''سیاست'' (۲۳/اپریل ۲۰۰۰ء)

فون کے ڈیڈ رہنے کے فائدے

مرکزی وزیر مواصلات رام ولاس پاسوان ان وزیروں میں سے ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے کم از کم اڑتالیس گھنٹے تو ضرور کام کرتے ہیں اور جس محکمہ کے بھی وزیر بنتے ہیں اس محکمہ سے کہیں زیادہ خود کام کرتے ہیں۔ یہ جب ریلوے کے وزیر تھے تو نہ صرف ریلوں کی رفتار بلکہ ریلوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔ ایک صاحب تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں ریلوں کے حادثے بھی بڑھ گئے تھے۔ وہ نہایت ملنسار، خوش اخلاق اور نہایت فعّال آدمی ہیں۔ روزانہ کم از کم ڈھائی تین سو نئے لوگوں سے تو ضرور ملتے ہیں۔ رمضان کے مہینے میں دوسرے وزیر تو صرف ایک ہی افطار پارٹی رکھتے ہیں مگر یہ دو دو افطار پارٹیاں رکھتے ہیں۔ دن کے کسی بھی وقت آپ اُن کے گھر کے سامنے سے گزریں تو آپ کو ہمیشہ ضرورت مندوں کی ایک بھیڑ نظر آئے گی۔ یہی حال دفتر میں بھی ہوتا ہے۔

پچھلے دنوں اُن کے جی میں نہ جانے کیا بات آئی کہ انہوں نے ہمیں دہلی ٹیلی فون مشاورتی کمیٹی کا رکن بنا دیا۔ یہ ان کا کرم نہیں تو اور کیا ہے کہ انہوں نے ہمیں اس قابل سمجھا۔ یہ اور بات ہے کہ جس دن ہمارے ٹیلی فون مشاورتی کمیٹی کا رکن بننے کی اطلاع آئی عین اُسی دن ہمارا فون ڈیڈ ہو گیا اور لگاتار پانچ دنوں تک ڈیڈ رہا۔ ٹیلی فون مشاورتی کمیٹی کا رکن بننے کی خوشی تو اپنی جگہ تھی ہی لیکن ٹیلی فون کے ڈیڈ ہونے نے ہماری خوشی کو دوبالا کر دیا۔ یہ بات ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ صحافت اور ادب سے تھوڑا بہت تعلق ہونے کی وجہ سے ہمارا ٹیلی فون پہلے ہی سے

’خصوصی ٹیلی فونوں‘ کے زمرے میں آتا ہے۔ ہمارے ٹیلی فون کے خراب ہونے کی صورت میں خرابی کی شکایت درج کرانے کے لئے الگ سے جوسیل مقرر کیا گیا ہے وہ خود بھی خصوصی ہے۔ ادھر آپ شکایت درج کرائیں تو اُدھر دیکھتے ہی دیکھتے لائین مین ہاتھوں میں اوزار لئے یوں دوڑے دوڑے چلے آتے ہیں جیسے ٹیلی فون کی نہیں بلکہ خود ہماری مرمت کرنے کے لئے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے پانچ چھ برسوں میں ہمارا ٹیلی فون آدھے گھنٹے سے زیادہ کبھی خراب نہیں رہا۔ اگر خدانخواستہ کبھی ہمارا ٹیلی فون معمولی نزلے، زکام وغیرہ میں مبتلا ہو جائے اور ہم غلطی سے شکایت درج کرا بیٹھیں تو یقین مانیئے فون کی بجائے خود ہماری صحت خراب ہونے لگتی ہے۔ اس لئے کہ پورا ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ ہمارے اکیلے فون کے علاج میں جٹ جاتا ہے۔ لائین مین تو آتے ہی ہیں۔ بعد میں نہ جانے کہاں کہاں سے یہ چیک کرنے کے لئے فون آتے ہیں کہ حضور آپ کا فون ٹھیک ہوا یا نہیں۔ اور ہم جواب دیتے دیتے عاجز آجاتے ہیں۔ حسرت رہ گئی کہ کبھی ہمارا فون بھی خراب ہو اور ہم اطمینان کے کچھ دن گزار سکیں بلکہ ہماری بیوی کو تو اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ ”پاس پڑوس کے سارے فون خراب ہوتے رہتے ہیں لیکن ہمارا نگوڑا فون خراب نہیں ہوتا۔ میں تو تمہارے فون ریسیو کرتے کرتے تھک جاتی ہوں۔ پھر فون ٹھیک رہتا ہے تو اس گھر میں جھوٹ بولنے کا چلن بڑھ جاتا ہے۔ تم جن لوگوں سے بات نہیں کرنا چاہتے تو مجھ سے کہلوا دیتے ہو کہ تم گھر پر نہیں ہو یا ڈرائینگ روم میں بیٹھے رہنے کے باوجود کہلوا دیتے ہو کہ تم باتھ روم میں ہو۔ یوں بھی تم ڈرائینگ روم میں کم اور باتھ روم میں زیادہ پائے جاتے ہو۔ تمہیں فون کرنے والے بھی تمہاری اس عادت سے واقف ہو چکے ہیں۔ بعض تو ایسے بھی ہیں جو ریسیور اٹھاتے ہی پوچھتے ہیں کہ کہیں تم باتھ روم میں تو نہیں ہو۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ بھیا پہلے اپنا نام بتاؤ۔ پھر میں تمہیں بتا پاؤنگی کہ وہ باتھ روم میں ہیں یا سرے سے گھر میں ہی نہیں ہیں۔ یقین مانو اس فون کے خراب نہ ہونے کی وجہ سے مجھے جھوٹ بولنے کی عادت پڑتی جارہی ہے۔ کوئی دن تو ایسا گزرے جب میں سچ کے سوائے کچھ نہ بولوں۔“ ہماری بیوی کی شکایت بالکل واجبی ہے کیونکہ اس ٹیلی فون کی وجہ سے اور پھر خود ہماری وجہ سے اکثر اوقات اسے جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ پھر ٹیلی فون اچھا ہو تو اکثر اس پر رانگ کالیں آتی رہتی ہیں۔ کبھی فون آتا ہے ”گیس کا سلنڈر اب تک نہیں آیا۔ دو دن ہو گئے تمہاری ایجنسی کیا کرتی رہتی ہے۔“ ایک دن کسی نے جلد بازی میں ہم سے پوچھا ”جنازہ کتنے

بجے اُٹھنے والا ہے اور یہ کہ ہم سیدھے قبرستان آجائیں یا پہلے گھر آجائیں۔''اس پر ہم نے اسے سمجھایا''میاں! ہماری ایسی قسمت کہاں کہ ہمارا جنازہ اُٹھے۔ برسوں سے آس لگائے بیٹھے ہیں لیکن یہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتا ہے۔''تب اس بے چارے نے''سوری رانگ نمبر'' کہہ کر فون رکھ دیا۔ ایک دن کسی نے ہم سے کہا''اس بار جو تم نے اپنے اسٹور سے چائے کی پتی بھیجی ہے اس میں چائے کی پتی کم اور گھوڑے کی لید زیادہ ہے۔ اگر یہی حال رہا تو ہم تمہاری دکان سے مال نہیں خریدیں گے۔''ایک دن ایک لڑکی کی سریلی آواز آئی۔''شام میں ٹھیک چھ بجے شنکر مارکیٹ کے سپر بازار والے گیٹ کے سامنے تمہارا انتظار کرونگی۔ کل کی طرح دیر نہ کردینا۔ بائی بائی''اور ہم شام میں یونہی ایک گمنام سی جستجو میں شنکر مارکیٹ چلے گئے۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ دیکھیں یہ سُریلی آواز کس کے گلے سے نکلی تھی۔ آپ یقین کریں اس لڑکی کو دیکھ کر ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دل مسوس کر رہ گئے کہ اے کاش اس لڑکی کی کال سچ مچ ہمارے صحیح نمبر پر آئی ہوتی۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کو تو آنا ہی نہیں تھا جس کا وہ انتظار کر رہی تھی اور ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ہم جا کر اُسے یہ بات بتاتے۔ رانگ کالوں کی بات تو چھوڑیئے۔ یہ جو ہمارے ٹیلی فون پر اصلی کالیں آتی رہتی ہیں تو وہ بھی کونسی کام کی ہوتی ہیں۔ کبھی اطلاع آتی ہے کہ ہم فلاں تاریخ کو دہلی آرہے ہیں گاڑی لے کر اسٹیشن آجایئے۔ کوئی چاہتا ہے کہ ہوائی جہاز میں اس کی سیٹ کا ریزرویشن کروادیں۔ کوئی دوست ہم سے اُدھار پیسے مانگتا ہے۔ بھلا ایسی کالوں کو ریسیو کرنے کا کیا فائدہ۔ اس سے تو فون کا ڈیڈ رہنا ہی اچھا ہوتا ہے بلکہ ڈیڈ رہنے والا فون تو زیادہ فائدہ بخش ہوتا ہے۔ نوجوانی کے دنوں میں ہمارے ایک دوست تھے جن کے گھر میں ٹیلی فون کا کنکشن تو نہیں تھا لیکن ٹیلی فون کا ایک آلہ ضرور ان کے ڈرائینگ روم میں رکھا ہوتا تھا۔ ہمیں اس کی اصلیت کا پتہ تھا۔ ایک دن ہم نے ان کے نقلی ٹیلی فون رکھنے پر اعتراض کیا تو بولے''اس کے کئی فائدے ہیں۔ اول تو یہ کہ ٹیلی فون نہیں آتا۔ دوسرے یہ کہ رانگ کالیں نہیں آتیں۔ تیسرے یہ کہ ٹیلی فون ایک اسٹیٹس سمبل (Status Symbol) ہے۔ ٹیلی فون چلے یا نہ چلے آدمی تو سماج میں چل جاتا ہے۔''ایک اور پرانی بات یاد آگئی۔ ایک زمانہ میں ہم ہر شام کو پابندی سے ایک ہوٹل میں جایا کرتے تھے جس کے کاؤنٹر پر ایک ٹیلی فون رکھا ہوتا تھا جو اکثر ڈیڈ رہتا تھا۔ ایک دن دو نوجوان کسی بات پر لڑتے جھگڑتے کاؤنٹر پر آئے۔ ان میں سے ایک نوجوان نے مالک سے پوچھا''کیا میں آپ کا فون

استعمال کر سکتا ہوں؟''۔اس نے ٹیلی فون استعمال کرنے کی اجازت دیدی تو نوجوان نے ریسیور اُٹھا کر دوسرے نوجوان کے سر پر دے مارا اور ایک کال کے پیسے مالک کو دیدیئے حالانکہ فون اس وقت ڈیڈ تھا۔

پرسوں ہم نے یونہی پریس کلب میں اپنے دوستوں کو بتایا کہ جب سے ہم ٹیلی فون مشاورتی کمیٹی کے رکن بنے ہیں تب سے ہمارا فون ڈیڈ ہے۔اس پر ایک صحافی دوست نے کہا'' یہ ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ کا قاعدہ ہے کہ جسے بھی صلاح کار کمیٹی کا رکن بناتے ہیں اس کا فون ڈیڈ کردیتے ہیں تاکہ اسے یہ پتہ چلے کہ ٹیلی فون ڈیڈ ہو جائے تو عام آدمی کو کتنی دشواری پیش آتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جانے بغیر تم مشاورتی ،کمیٹی کو کیا مشورہ دے سکتے ہو۔''شاید ہمارے دوست کا کہنا درست بھی ہو۔بہر حال پورے پانچ دنوں تک ہمارا ٹیلی فون خراب رہا۔ہم تو خیر اطمینان سے تھے لیکن پانچویں دن ہماری بیوی نے شکایت کی'' پانچ دنوں سے بیٹی سے بات نہیں ہوئی۔وہ تو خیر ہو جائے گی لیکن لگاتار پانچ دنوں سے جھوٹ نہ بولنے کی وجہ سے میرا پیٹ پھولتا جا رہا ہے۔سچ کہنے کی اپنی جگہ اہمیت ضرور ہے لیکن زمانہ اتنا خراب آگیا ہے کہ چھوٹے موٹے جھوٹ بولے بغیر نارمل زندگی گزارنا مشکل نظر آنے لگا ہے۔اب تو تم اپنا فون ٹھیک کروا ہی لو۔'' پانچویں دن ہم نے رام ولاس پاسوان جی کے ایڈیشنل پرائیوٹ سکریٹری عبدالفہیم سے فون کو ٹھیک کروانے کی بات کی۔ تو بولے'' آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا؟''۔ہم نے کہا'' اس لئے کہ صلاح کار کمیتی کے ایک رکن کی حیثیت سے ہم یہ جاننا چاہتے تھے کہ فون ڈیڈ ہو تو عام آدمی کو کیا کیا مشکلات پیش آتی ہیں۔'' وہ حیرت سے ہمارا منہ تکنے لگے اور اس کے کچھ ہی دیر بعد ہمارا فون پھر سے ٹھیک ہو گیا۔

روزنامہ ''سیاست''(٣٠/اپریل ٢٠٠٠ء)

ویرپّن! کبھی ہمیں بھی اغوا کرو

ویرپّن جی! ہم آپ کو یہ خط ''نکیرن'' کے ایڈیٹر آر آر گوپال کی معرفت ہی بھیجنا چاہتے تھے، کیونکہ وہی آپ کے اکیلے ڈاکیہ ہیں، لیکن چوں کہ وہ فلم اسٹار راج کمار کو آپ کے چُنگل سے آزاد کرانے کے سلسلے میں لگاتار جنگل میں منگل مناتے چلے آرہے ہیں، اس لئے انھیں زحمت نہ دے کر اس خط کو اخبار میں شائع کرا رہے ہیں۔ ہمیں پتہ نہیں کہ یہ خط آپ کو ملے گا بھی یا نہیں، کیونکہ ہم یہ خط اُردو میں لکھ رہے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ جب اُردو والے ہی اُردو نہیں پڑھتے تو آپ کیا پڑھیں گے۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا (ویرپن کے سوائے)۔ پھر بھی آس بڑی چیز ہوتی ہے۔ کیا عجب کہ اُردو کا کوئی غیرت مند قاری آپ کو یہ خط پہنچا ہی دے۔ ویسے ہم یہ خط جان بوجھ کر اُردو میں لکھ رہے ہیں، کیونکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ اب اُردو کی بھی تھوڑی سی خدمت انجام دیں۔ راجکمار کی رہائی کے سلسلے میں آپ نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ کرناٹک کے اسکولوں میں نہ صرف تامل زبان کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے، بلکہ اسے سرکاری زبان کا درجہ بھی دیا جائے۔ آپ کے اس مطالبہ کو کرناٹک کی حکومت نے اصولاً مان بھی لیا ہے۔ جب آپ راجکمار کو رہا کر دیں گے تو کرناٹک میں جگہ جگہ تامل کا بول بالا ہوگا۔ اس مثال کو سامنے رکھ کر ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ پہلے تو ہمارا اغوا کریں اور پھر ہندی بولنے والی ریاستوں سے مطالبہ کریں کہ وہ اپنے اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کا بندوبست کریں اور اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیں۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک فائدہ تو یہ کہ ہمارے اغوا کے بعد ہمیں پتہ چل سکے گا کہ ہمارے اغوا کے خلاف کہاں

کہاں احتجاجی مظاہرے ہوتے ہیں اور کہاں کہاں صف ماتم بچھتی ہے، بسیں کتنی جلتی ہیں، توڑ پھوڑ کے کتنے واقعات پیش آتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ اس طرح اُردو کو اس کا جائز مقام دلانے کے مطالبہ میں شدّت پیدا ہو جائے گی۔ یہ بات ہم اس لئے لکھ رہے ہیں کہ اب اس زبان کی سچی خدمت کرنے والا ہمیں تو کوئی نظر نہیں آتا۔ پہلے آپ کسی کا اغوا کرتے تھے تو اس کی رہائی کے لیے بھاری رقم کا مطالبہ بھی کرتے تھے لیکن اب آپ نے یہ روش ترک کر دی ہے اور رہائی کی شرط کو زبان اور کلچر وغیرہ سے جوڑ دیا ہے۔ ماشاء اللہ اب آپ میں بڑی خوش آئند تبدیلیاں رونما ہوتی جا رہی ہیں، جس کے لئے ہماری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

ویرپّن جی! حالات کے ہاتھوں بے حد بے بس اور مجبور ہونے کے بعد ہی ہم اپنے آپ کو 'مغویہ' بننے کی پیشکش کر رہے ہیں، ورنہ آج کے زمانے میں کون اپنے آپ کو اغوا کے لئے پیش کرتا ہے۔ پھر آپ تو لوگوں کو دو دو تین تین مہینوں تک یرغمال بنا کر رکھنے لگے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اب اُردو کا کوئی سرپرست اور پرُسانِ حال نہیں رہا۔ ہمارے پاس بڑی بڑی انجمنیں ہیں، لیکن اُردو کی ترقی کے لئے کچھ نہیں کر رہی ہیں۔ اُردو کے جو استاد ہیں وہ کسی اور کام کے ہی استاد ہیں، اپنے بچوں کو تو اُردو نہیں پڑھاتے، البتہ جو معصوم نوجوان ان کے پاس اُردو پڑھنے کے لیے آتے ہیں ان سے شخصی اور گھریلو کام لیتے ہیں۔ ان استادوں کا زیادہ تر وقت جوڑ توڑ میں گزرتا ہے، وہ اُردو کے نہیں بلکہ اپنی روٹی پر دال کھینچنے کے استاد بن گئے ہیں۔ اُردو اکیڈمیاں اپنوں میں ریوڑیاں بانٹ رہی ہیں۔ ان اکیڈمیوں کی حیثیت اب اُردو کی ناقابل اشاعت کتابوں کے پبلشروں کی ہوگئی ہے۔ شعراء حضرات صرف مشاعرے پڑھتے ہیں کتابیں بالکل نہیں پڑھتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان حالات میں اگر آپ تامل کے ساتھ ساتھ اُردو کی خدمت کا بیڑہ اٹھالیں تو یقین مانیے چار دانگ عالم میں آپ کی شہرت کا ڈنکا بجنے لگے گا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ اُردو والے بڑے فراخ دل واقع ہوئے ہیں، اگر آپ ان کا کوئی معمولی سا کام بھی کریں تو وہ آپ کے گرویدہ ہو جائیں گے اور فرط مسرت اور وفور جذبات میں آپ کو محسن اُردو، مسیحائے اُردو، فخر اُردو اور 'اسمگلر اُردو' جیسے خطابات سے نوازنے کے علاوہ آپ کو ''شمس العلماء ویرپّن، لسان العصر ویرپّن'' اور ''ملک الشعراء ویرپّن'' وغیرہ جیسے القاب سے مخاطب کرنے لگ جائیں گے۔ آپ کے اعزاز میں جگہ جگہ تہنیتی تقاریب منعقد ہوں گی، مشاعروں کی صدارت بھی

آپ سے کرائی جائے گی۔ یہ نہ سمجھئے کہ مشاعروں کی صدارت کرنے کے لئے آدمی کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہوتا ہے، بلکہ مشاعرہ کا صدر جتنا جاہل ہوگا مشاعرہ اتنا ہی کامیاب ہوگا، کیونکہ یہاں سوچ سمجھ کر داد دینے کی پابندی نہیں ہوتی۔صدر کے ساتھ اگر شعراء بھی جاہل ہوں تو کیا کہنے،سونے پر سہاگہ ہو جائے گا۔ یہ تو ہم ان معمولات کی بات کر رہے ہیں جو ان دنوں اُردو معاشرہ میں رائج ہیں۔مشاعروں اور آپ کے اعزاز میں ہونے والی تقاریب کے علاوہ ،ہمیں یقین ہے کہ یونیورسٹیوں کے اُردو شعبوں میں آپ پر پی ایچ ڈی کے لئے مقالے لکھے جائیں گے (ویرپّن جی! آپ حیرت کریں گے کہ ہم جیسے کم سواد آدمی کے بارے میں بھی دو یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کے لئے اور چار یونیورسٹیوں میں ایم فل کے لئے مقالے لکھے جا چکے ہیں یا لکھے جا رہے ہیں)۔آپ سوچیں گے کہ آپ کے کونسے پہلو پر ریسرچ کی جا سکتی ہے،آپ فکر نہ کریں، اُردو والے مقالوں کے ایسے ایسے عنوانات ڈھونڈ نکالتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔چند موضوعات آپ کی شخصیت کے پس منظر میں ہم ہی تجویز کئے دیتے ہیں ''ویرپّن۔بن اور شخصیت''۔ ''جدلیاتی اسمگلنگ،کی تخلیقی اساس''۔ ''اُردو ادب میں مغرب سے ساختیات کی اسمگلنگ، ویرپّن کی نظر میں''۔ ''اُردو میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے اغوا کا سماجی پس منظر''۔ ''اُردو ادب میں سرقہ اور ڈکیتی کی وارداتیں۔ویرپّن سے پہلے اور ویرپّن کے بعد''۔اُردو کی رومانی شاعری پر صندل کی خوشبو کے اثرات''۔ ''اُردو ادب میں جنگل راج۔تہذیبی اور سماجی پس منظر''۔ ''اُردو ادب میں مابعد الطبیعاتی اسمگلنگ کی اخلاقی اساس''، ''ہاتھی دانت اور ویرپّن کے دانت۔ایک تقابلی مطالعہ'' وغیرہ۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ اُردو کی خدمت کرنے کا بیڑہ اٹھائیں تو تب آپ کو پتہ چلے گا کہ اس میں آپ کی شہرت کے کتنے امکانات پوشیدہ ہیں۔

غرض یہ چند فائدے ہیں جو ہمیں اغوا کرنے کی صورت میں آپ کو حاصل ہو سکتے ہیں، تاہم آپ ہم سے یہ ضرور پوچھ سکتے ہیں کہ بھلا تم کونسے ایسے اہم آدمی ہو کہ ہم تمہیں اغوا کریں۔ آپ کا سوال اپنی جگہ نہایت معقول ہے،لیکن آج کی دنیا میں کونسی ایسی معقول بات ہے،جس پر عمل کیا جا رہا ہو۔ہمیں بھی اندازہ ہے کہ ہم اہم آدمی نہیں ہیں 'من آنم کہ من دانم' جگہ جگہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

لیکن اگر آپ ہمارا اغوا کریں تو اس بہانے آپ کی شہرت کے سہارے ہماری شہرت میں بھی اضافہ ہوسکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آج تک کسی نے ہمارا اغوا نہیں کیا۔ بڑی پرانی آرزو ہے کہ کوئی ہمارا بھی اغواء کرے۔ نوجوانی کے دنوں میں ہماری دلی تمنا یہ تھی کہ کوئی لڑکی ہمیں اغوا کر کے لے جائے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ بزدلی اور شرافت دونوں ہم معنی لفظ ہوتے ہیں، یہ آرزو پوری نہ ہوئی تو والدین نے ہمیں اپنی موجودہ بیوی کا ''بندھک'' بنادیا۔ آپ اغوا کرنے کا اتنا وسیع تجربہ رکھتے ہیں، آپ کے ہاتھوں ہم اغواہوں گے تو اخباروں میں ہمارا چرچا ہوگا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بچپن میں ہم نے سرسری طور پر جنگل وغیرہ دیکھے تھے، اس کے بعد سے سمنٹ کے جنگلوں میں رہنے کی عادت ڈال لی ہے۔ عمر کے آخری حصہ میں ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ جنگل کیسا ہوتا ہے۔ آپ جس جنگل میں رہتے ہیں اس کا بڑا شہرہ ہے۔ ایک طویل عرصہ سے تین تین سرکاروں کی پولیس آپ کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن آپ پھر بھی ہاتھ نہیں آتے۔ ہم شہروں میں رہتے رہتے عاجز آچکے ہیں۔ دہلی میں بجلی اب اکثر غائب رہتی ہے، پانی بھی اب نلوں کے بجائے خود اپنی آنکھوں میں نظر آنے لگا ہے۔ سڑکوں کا عالم یہ ہے کہ ہم سڑک پر چلتے کم ہیں اور ٹھوکریں زیادہ کھاتے ہیں۔ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ آدمی آپ کے ساتھ جنگل میں رہے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم ناگپا کی طرح آپ کے چُنگل سے آزاد ہو کر جنگل سے بھاگ کر نہیں آئیں گے۔ آپ ہماری وفاداری تو دیکھیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ خود ہمیں آزاد کر کے بھاگ جائیں۔ عمر کے آخری حصہ میں ہم ذرا اطمینان قلب کے ساتھ گیان دھیان میں مصروف رہنا چاہتے ہیں۔ شہر کی زندگی نے ہمارا چین چھین لیا ہے۔ آپ کے ساتھ کچھ دن جنگل میں رہیں گے تو قدرت سے قریب رہنے کا موقع بھی ملے گا۔ یوں بھی ہمیں جلد ہی قدرت کا حصہ بن کر لالہ وگل میں تبدیل ہونا ہے۔ آپ کو ہمیں اغواء کرنے کے لئے دہلی نہیں آنا پڑے گا جس طرح آپ ''نکیرن'' کے ایڈیٹر آر گوپال کو جنگل میں آنے کا وقت بتادیتے ہیں اسی طرح ہمیں بھی بتادیں۔ ہم خود بہ نفس نفیس اغواء ہونے کے لئے مقررہ وقت پر جنگل کے کنارے پہنچ جائیں گے۔ آپ ہمیں وہاں سے اٹھالیں۔ ایک بات اور سن لیں کہ ہمارے اغواء کے سلسلہ میں آپ 'نکیرن' کے ایڈیٹر کو بیچ میں نہ ڈالیں۔ ہمیں تو ان کی مونچھیں آپ کی مونچھوں سے زیادہ خطرناک نظر آتی ہیں۔

روزنامہ ''سیاست'' (اکتوبر ۲۰۰۰ء)

☆☆

اپنے حالات کو زلزلہ پروف بنائیے

آپ نے وہ لطیفہ تو سنا ہوگا کہ ایک علاقہ میں زلزلہ کے مسلسل جھٹکے محسوس کئے جانے لگے تو لوگ ہراساں ہو گئے۔ بعض تو پریشانی میں اپنی جان بچانے کے لئے اس علاقے کو ہی چھوڑ کر چلے گئے، مگر جن لوگوں کے پاس جان کے علاوہ مال بھی تھا اور وہ اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے تو وہ مجبوراً وہیں رک گئے۔ ایسے ہی ایک صاحب نے سوچا کہ خود تو وہیں رک جائیں، مگر اپنے دو بیٹوں کو اپنے ایک عزیز کے پاس کسی اور شہر میں بھیج دیں تا کہ کوئی بڑی آفت آئے تو کم از کم ان کی نسل ہی اس دنیا میں باقی رہ جائے۔ اب یہ ایک اتفاق ہے کہ ان کے دونوں بیٹے نہایت نٹ کھٹ، شریر اور پاکھنڈی تھے۔ رشتہ دار کے پاس پہنچے تو انھوں نے شرارت کا وہ بازار گرم کیا اور وہ دھاچوکڑی مچائی کہ سارے گھر کو سر پر اٹھا لیا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر عزیز نے ان دونوں شریر لڑکوں کو ان کے والد کے پاس واپس بھیجتے ہوئے لکھا ”حضور! میں آپ کے بیٹوں کو واپس بھیج رہا ہوں، آپ براہ کرم ان کی جگہ زلزلے کو ہی ہمارے پاس بھیج دیں“۔

ہمیں یہ لطیفہ یوں ہی یاد نہیں آ گیا، بلکہ اس کے یاد آنے کی کئی معقول وجوہات بھی ہیں، لگ بھگ دو ہفتوں کے عرصہ میں ذرائع ابلاغ نے گجرات کے بھیانک زلزلہ کی تفصیلات کو پیش کرنے میں بڑی جرأت اور مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ خود ٹیلی ویژن پر خبروں کے پانچ چھ چینل آتے ہیں، جنہوں نے ان تفصیلات کو اتنی باریک بینی سے پیش کرنے کی کوشش کی کہ لگتا تھا بھج میں آیا زلزلہ واحد زلزلہ نہیں تھا، بلکہ یہ پانچ چھ الگ الگ زلزلے تھے۔ گرے ہوئے مکانوں کو

دکھایا گیا ، ملبے میں سے لوگوں کو نکالتے ہوئے دکھایا گیا،ان کے تاثرات پیش کیے گئے، بلکہ دوردرشن کے ایک کیمرہ مین نے عین زلزلہ کے دوران ایک ٹاور اور بجلی کے ایک کھمبے کو زلزلہ کے زیر اثر ہلتے ہوئے دکھایا تھا۔ ذرائع ابلاغ میں مسابقت بہت اچھی بات ہے، لیکن ذرائع ابلاغ جب بال کی کھال نکالنے لگتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ بال کو دوبارہ اس کی کھال میں واپس ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔اب جب کہ گجرات کے زلزلہ کی تباہی کے سارے مناظر کو پیش کیا جاچکا ہے اور اخباروں میں زلزلہ کے بارے میں اتنے مضامین شائع ہو چکے ہیں کہ بچہ بچہ 'ماہر زلزلیات' بن چکا ہے،خود ہمارے چھ سالہ نواسے نے پچھلے ایک ہفتہ میں تین مرتبہ ہمیں یہ کہہ کر گھر سے باہر نکال دیا کہ ''بھاگو زلزلہ آرہا ہے''۔زلزلہ سے ہمارا بڑا پرانا تعلق ہے،کوئی مہینہ ایسا نہیں جاتا جب کسی نہ کسی بات پر ہمارے پیروں تلے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس نہ ہوتی ہو۔متوسط طبقہ کا آدمی یوں بھی نہ تو زمین کا رہتا ہے اور نہ ہی آسمان کا۔سماج میں بھی وہ معلق ہی دکھائی دیتا ہے۔

تین چار دن پہلے اخبارات میں ملک کے ان علاقوں کی فہرست شائع ہوئی ہے، جو آسانی سے زلزلہ کی زد میں آسکتے ہیں۔اس فہرست میں ازراہ کرم دہلی کو بھی شامل کیا گیا ہے اور پھر دہلی کے ان علاقوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جو زلزلہ کی صورت میں سب سے زیادہ متاثر ہوسکتے ہیں۔اب ہم کیسے بتائیں کہ ان علاقوں میں اس علاقہ کو سرفہرست دکھایا گیا ہے، جہاں ہم جیسے ناچیز کا گھر واقع ہے، جس میں ہم اپنا سر چھپانے کے علاوہ اپنی عزت کو بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ ہماری مراد مشرقی دہلی سے ہے (خدا کا شکر ہے کہ فہرست بنانے والوں نے ہمارا نام اور ہمارے گھر کا پتہ نہیں لکھا)۔ بتایا گیا ہے کہ جمنا کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ زلزلہ کی صورت میں سب سے زیادہ متاثر ہوسکتا ہے۔جب سے یہ خبر پڑھی ہے ،ہم 'دیوار کی بلی' بنے ہوئے ہیں۔گھر میں ایسی جگہ بیٹھتے ہیں، جہاں سے راہ فرار اختیار کرنے میں آسانی ہو،سانس بھی اس قدر آہستہ لیتے ہیں کہ کہیں اس کے زور سے دیوار ہی سر پر نہ آگرے، چھینک آئے تو بالکنی میں جا کر چھینکتے ہیں۔سنا ہے کہ اس خبر کے زیر اثر ہمارے فلیٹ کی رائج الوقت قیمت میں اچانک دو ڈھائی لاکھ روپیوں کی کمی واقع ہوگئی ہے۔بعض کھاتے پیتے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس علاقہ میں اپنے مکانوں کو بیچ کر دوسرے علاقوں میں جانے لگے ہیں۔کیا کریں ہمارا شمار ایسے لوگوں میں نہیں

ہوتا کیونکہ ہم نے تو اپنی ساری زندگی کرائے کے مکانوں میں گزاری ہے۔ عمر کے آخری حصہ میں کہیں جا کر یہ چھوٹا سا ذاتی مکان خریدا تھا تو اب اس کے بارے میں اطلاعیں ملنے لگی ہیں کہ یہ بھی زلزلہ کی زد میں ہے۔ علامہ اقبال نے ٹھیک ہی کہا تھا

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ، بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس اطلاع کو پڑھنے کے بعد ہماری اہلیہ نے کل ہم سے کہا ''میری بات مانو تو اس مکان کو فروخت کر دو، تا کہ ہم لوگ کہیں اور منتقل ہو جائیں''۔ ہم نے کہا ''محترمہ! اس گھر میں تمہاری حیثیت خود ایک زلزلہ سے کم نہیں ہے، جس گھر میں پچھلے ساتھ آٹھ برسوں سے خود زلزلہ مقیم ہو، اسے بیرونی زلزلوں سے گھبرانے کی کیا ضرورت ہے''۔ بولیں ''تم تو ہر بات کو مذاق میں ٹال دیتے ہو''۔ ہم نے کہا '' آدمی کی زندگی میں ایک وقت وہ بھی آتا ہے، جب مذاق ہی اصل سچائی بن جاتا ہے۔ ہماری عمر ایسی نہیں ہے کہ ہم ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں منتقل ہوتے پھریں۔ یہ وہ وقت ہے جب ہمیں اُصولاً اس دنیا سے نکل کر کسی اور دنیا میں منتقل ہونے کے بارے میں سوچنا چاہئے''۔ خدا کا شکر ہے کہ عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ہماری اہلیہ کی عقل میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری یہ بات ان کی سمجھ میں تو آگئی ہے لیکن اس گھر میں رہنے کے لئے اب وہ اس گھر کی تزئین اور سجاوٹ کچھ اس ڈھنگ سے کر رہی ہیں کہ زلزلہ آنے کی صورت میں گھر کے مکینوں کو کم سے کم چوٹ آئے۔ گھر کی جس دیوار میں دروازے اور کھڑکیاں زیادہ ہیں، وہاں سے پلنگوں کو ہٹا دیا گیا ہے کیونکہ ذرائع ابلاغ میں یہی چھپ رہا ہے کہ کسی دیوار میں کھڑکیاں اور دروازے زیادہ ہوں تو زلزلہ کے وقت اس دیوار کے پاس نہ رہیں۔ اس کے علاوہ دیوار پر سے ہماری تصویریں ہٹا دی گئی ہیں تا کہ ان کے گرنے سے کسی کو چوٹ نہ آئے۔ ہمیں زندگی میں جتنے بھی ایوارڈ اور اعزازات وغیرہ ملے ہیں ان سے متعلق شیلڈ اور اسنادات وغیرہ کو بھی دیواروں اور محرابوں میں سے ہٹایا جا رہا ہے۔ ہم نے اس پر اعتراض کیا تو ہماری اہلیہ نے کہا ''مانا کہ ان اعزازات کے ذریعہ سماج میں تمہیں ایک مقام اور رتبہ حاصل ہوا تھا، لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ ایسے ہی کسی بھاری بھر کم اعزاز کے ذریعہ تمہارا کام بھی تمام ہو''۔ اعزازات دینے والوں کو چاہئے کہ وہ اتنے وزنی شیلڈ نہ دیا کریں بلکہ انھیں اتنا ہلکا پھلکا رکھیں کہ یہ 'زلزلہ پروف' بن جائیں۔ چنانچہ اب ان شیلڈوں اور اعزازات کو گودام میں رکھ دیا گیا ہے۔ ذرائع ابلاغ نے یہ بھی کہا ہے کہ زلزلہ کے

آنے کی صورت میں گھر کے مکینوں کو چاہئے کہ وہ کسی مضبوط فرنیچر جیسے ڈائننگ ٹیبل، بڑے صوفہ یا رائٹنگ ٹیبل کے نیچے چھپ جائیں تاکہ دیوار یا چھت کا ملبہ گرے تو آدمی فرنیچر کے نیچے محفوظ رہ سکے اور بعد میں چار پانچ دن بعد انھیں فرنیچر کے نیچے سے صحیح وسلامت نکالا جاسکے۔ اس ہدایت کی روشنی میں ہماری اہلیہ بازار سے ایک بڑا اور مضبوط سا ڈائننگ ٹیبل لے کر آگئی ہیں جو کم و بیش ہمارے ڈائننگ روم کے سائز کے برابر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پہلے ہم ڈائننگ ٹیبل کے اوپر کھانا رکھ کر کھاتے تھے اب اس کے نیچے بیٹھ کر کھانے لگے ہیں۔ آپ سے کیا چھپانا کہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم اسی ڈائننگ ٹیبل کے نیچے سو بھی جاتے ہیں۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ ہم اپنے سالم گھر کو 'زلزلہ پروف' بنائیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ دہلی کی ایک تہائی آبادی جھگیوں اور جھونپڑیوں میں رہتی ہے اور یہ ایک اتفاق ہے کہ جتنی بھی جھگیاں اور جھونپڑیاں ہوتی ہیں، وہ سب کی سب 'زلزلہ پروف' ہوتی ہیں۔ دیواروں کی جگہ ٹاٹ کے پردے بندھے ہوتے ہیں، چھتیں بھی ہلکے پلائی وڈ کی بنائی جاتی ہیں، جن پر پولی تھن یا موم جامے کی پرتیں چڑھادی جاتی ہیں۔ اگر ایسا ہلکا پھلکا مکان آدمی کے اوپر گرے بھی تو وہ آدمی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ یوں بھی ان جھگیوں اور جھونپڑیوں میں رہنے والوں کی زندگی پہلے ہی سے اتنی بگڑ چکی ہوتی ہے کہ قدرت ان کا کچھ بگاڑنا چاہے تو تب بھی بگاڑ نہیں سکتی۔ جب سے ذرائع ابلاغ نے دہلی کے سلسلے میں ایسی خطرناک پیشین گوئیاں کرنی شروع کردی ہیں، تب سے ہمیں کسی جھگی یا جھونپڑی میں جاکر رہنا اچھا معلوم ہونے لگا ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۱ر فروری ۲۰۰۱ء)

اپنے اسکوٹر کی یاد میں

جیسا کہ آپ جانتے ہیں دہلی میں فضائی آلودگی بہت ہوتی ہے لیکن ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ دہلی کی اس فضائی آلودگی کا اصل سبب ہمارا وہ اسکوٹر ہے جو پچھلے ستائیس (۲۷) برسوں سے ہمارا رفیق رہا ہے۔ ایک دن دہلی سرکار نے بیٹھے بٹھائے یہ حکمنامہ جاری کر دیا کہ دہلی میں پندرہ سال پرانی جتنی بھی موٹریں اور اسکوٹریں ہیں انھیں یکم جنوری ۲۰۰۱ء کے بعد دہلی کی سڑکوں پر چلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ دہلی میں جہاں ہر طرح کی گندگی سیاسی رہنماؤں کے ذریعہ پھیلائی جاتی ہے اس کے مقابلہ میں ہمارے دو پہیوں والے اسکوٹر کی فضائی آلودگی کیا حقیقت رکھتی ہے۔ لیکن کیا کریں دہلی سرکار کا حکمنامہ تو جاری ہو گیا تھا۔ کباڑی والے ہمارے پیچھے پڑ گئے کہ دو چار سو روپے لیجئے اور اس سے اپنی جان چھڑائیے۔ اگرچہ دنیا کی نظر میں ہمارے اسکوٹر کی حیثیت دو کوڑی کی بھی نہیں رہ گئی تھی لیکن ہم تو اس کی قدر و قیمت کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے اپنی زندگی کے پورے ستائیس برس اس اسکوٹر کی رفاقت میں گذارے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دہلی میں اتنے برس رہ کر ہم نے جو کچھ بھی حاصل کیا ہے وہ اسی اسکوٹر کے بل بوتے پر کیا ہے۔ آج ہم اسے کیونکر کباڑی والے کے حوالے کر دیں۔ اگرچہ ہم خود بھی پچھلے چار مہینوں سے اس اسکوٹر کو استعمال نہیں کر رہے تھے۔ لیکن ہر روز اس کی صفائی یوں کرواتے تھے جیسے ابھی اس پر بیٹھ کر چل نکلیں گے۔ اصل میں اس اسکوٹر سے ہمارا جذباتی رشتہ کچھ ایسا نازک ہے کہ ہم اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے۔ یہ ہمیں ۱۹۷۴ء میں اُس وقت ملا تھا جب

بجاج کے اسکوٹر کو حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ لوگ اس کی بکنگ کروانے کے بعد برسوں اسکوٹر کے انتظار میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے۔ اگر یہ کسی کو مل جاتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے اس کی لاٹری نکل آئی ہے کیونکہ بلیک میں اس کے دام اس کے اصل دام سے دو ڈھائی گنا زیادہ ہوا کرتے تھے۔ شروع ہی سے ہمارا یہ اصول رہا ہے کہ اپنی چادر کو دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ بلکہ چادر چھوٹی ہو تو اس کے پھیلاؤ میں اضافہ کرنے کے بجائے اپنے پاؤں کو ہی کٹوا لو۔ اسی لئے دہلی میں اپنے قیام کے ابتدائی ڈیڑھ برس میں ہمارے پاس ایک آٹو سائیکل ہوا کرتی تھی جس پر بیٹھ کر ہم دہلی کے جان لیوا فاصلوں کو قابو میں کر لیا کرتے تھے۔ یہ ۱۹۷۴ء کی بات ہے جب ہمارے کرم فرما مسٹر محمد علی کرناٹک کے وزیر ٹرانسپورٹ ہوا کرتے تھے۔ وہ جب بھی بنگلور سے دہلی آتے تو ہمیں بطور خاص یاد فرمایا کرتے تھے۔ جب تک وہ دہلی میں رہتے ہمارا زیادہ تر وقت ان ہی کے ساتھ گذرتا تھا۔ ایک رات ہم دیر گئے کرناٹک بھون سے واپس ہونے لگے تو محمد علی صاحب نے اپنے ڈرائیور سے کہا کہ وہ ہمیں گھر چھوڑ آئے۔ اس پر ہم نے کہا ''اس زحمت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم اپنی سواری پر ہیں۔'' یہ سن کر محمد علی صاحب ہمارے ساتھ کرناٹک بھون سے باہر نکل آئے تا کہ یہ دیکھ سکیں کہ ہمارے پاس کونسی سواری ہے۔ جب ہم نے اپنی آٹو سائیکل نکالی تو محمد علی صاحب نے کہا ''تم جیسے بڑے ادیب کو آٹو سائیکل پر گھومتے ہوئے شرم نہیں آتی ؟۔'' ہم نے مذاق میں کہا ''حضور! وزیر ٹرانسپورٹ آپ ہیں۔ بھلا مجھے شرمانے کی کیا ضرورت ہے؟'' ہمارا یہ جملہ انھیں تیر کی طرح لگا۔ فوراً ہمارا ہاتھ پکڑ کر کرناٹک بھون میں واپس لے گئے۔ اپنے پرائیوٹ سکریٹری سے ایک کاغذ نکلوایا اور اس سادہ کاغذ پر ہمارے دستخط لے لئے۔ ہم نے سوچا کہ شاید ہمارے آٹوگراف لئے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے ہمیں گھر واپس جانے کی اجازت دیدی۔ دوسرے دن محمد علی صاحب کو بنگلور واپس جانا تھا۔ چوتھے دن ہم دفتر میں بیٹھے تھے کہ آصف علی روڈ سے بجاج اسکوٹر کے ایجنٹ کا فون آیا کہ حضور کرناٹک کے وزیر ٹرانسپورٹ نے اپنے خصوصی کوٹہ میں سے آپ کے لئے ایک اسکوٹر الاٹ کیا ہے۔ آکر لے جائیے۔ ہمیں یقین نہ آیا۔ دوسرے دن ہم وہاں پہنچے تو سچ مچ ایک نیا نویلا اسکوٹر ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم نے اس وقت اس کے دام ۴۴۴۴ روپے ادا کئے تھے۔ ہم اسکوٹر لے کر گھر پہنچے تو اسی شام پٹنہ سے سہیل عظیم آبادی آ گئے۔ وہ پہلے اُردو ادیب تھے جنھیں اس اسکوٹر پر ہمارے

ساتھ بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ یوں نومبر ۱۹۷۴ء کے آخری ہفتہ میں ہم نے اس اسکوٹر کو دہلی کی سڑکوں پر چلانے کا آغاز کیا تھا۔ ہمیں یہ اسکوٹر اس لئے بھی عزیز رہا ہے کہ اسے ہمارے ایک بزرگ کرم فرما کی دین کی حیثیت حاصل تھی۔ اسے ہم نے ہمیشہ ان کی ایک انمول نشانی کے طور پر جی جان سے سنبھال کر رکھا۔ کبھی اس کی سرویسنگ میں دیر نہ ہونے دی۔ چنانچہ اتنے برس گذر جانے کے بعد آج بھی وہ نئے اسکوٹر کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ ان دنوں دہلی میں موٹریں بھی کم تھیں اور اسکوٹر بھی۔ لہٰذا ہمارا یہ اسکوٹر ہماری پہچان اور ہم اس اسکوٹر کی پہچان بنتے چلے گئے۔ اس اسکوٹر کو حاصل کرنے کے بعد ہمیں یوں لگا جیسے دہلی کے سارے فاصلے سمٹ کر ہمارے ہاتھ کی لکیروں میں سمٹ گئے ہیں۔ بہت عرصہ پہلے ہمارے ایک اور کرم فرما ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی نے ایک بار اسکوٹر چلانے والوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا "کبھی اسکوٹر نہ خریدو کیونکہ ہم نے آج تک کسی کتے اور اسکوٹر چلانے والے کو آہستہ چلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ سرپٹ دوڑتا ہوا اور بلا وجہ بھاگتا ہوا"۔ ان کا یہ بیان بعد میں سچ بھی ثابت ہوا کیونکہ اس اسکوٹر کے آنے کے بعد ہم خواہ مخواہ ہی نقل و حرکت میں رہنے لگے۔ دہلی کی کوئی سڑک اور کوئی گلی ایسی نہ تھی جہاں ہمارا اسکوٹر نہ گیا ہو۔ لوگ آج بھی دہلی کی گلیوں اور سڑکوں کے بارے میں ہماری گہری واقفیت کو جان کر دانتوں میں انگلی دبا لیتے ہیں۔ یہ سب اسی اسکوٹر کا فیض ہے۔ دس برس پہلے تک اس کا رفتار والا میٹر کام کرتا تھا۔ ایک دن ہم نے یونہی حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ ہم پوری دنیا کا دو مرتبہ اس اسکوٹر پر بیٹھ کر چکر لگا چکے ہیں۔ اس اسکوٹر پر بیٹھ کر ہم نے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ادبی، سماجی اور تہذیبی محفلوں میں شرکت کی۔ یہاں تک کہ یہ اسکوٹر نہ صرف ہماری پہچان بن گیا بلکہ اسے ہم سے بھی زیادہ شہرت حاصل ہوگئی ایک زمانہ میں ہم دیر سے گھر واپس جانے کے لئے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ گھر واپس جانے کے لئے بسا اوقات ہم راتوں میں اُس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے گھر کے سامنے سے گذرا کرتے تھے۔ ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی لاگو ہوئی تو وزیر اعظم کی کوٹھی کے آس پاس حفاظتی انتظامات سخت کردیئے گئے۔ کبھی کبھار یہاں سے گذرنے والی گاڑیوں کی چیکنگ بھی ہو جایا کرتی تھی۔ کم از کم دو مرتبہ ایسا ہوا کہ رات ہم دیر گئے یہاں سے گذرنے لگے تو اچانک گاڑیوں کی چیکنگ شروع ہوگئی۔ چنانچہ ایک کانسٹیبل نے ہمارے اسکوٹر کو بھی روک لیا۔ لیکن ادھر ہم نے بریک لگایا اور ادھر دور کھڑے ہوئے ہیڈ کانسٹیبل

نے پکار کر کانسٹیبل سے کہا ''اسے جانے دو یہ ۸۷۵ ۳ ہے۔ یہ روز کی گاڑی ہے۔اسے جانے دو۔'' اس وقت ہمیں احساس ہوا کہ ہمارا اسکوٹر اب ہم سے زیادہ مشہور ہو گیا ہے۔اب آپ سے کیا بتائیں کہ کتنی ہی نامور ہستیوں نے اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ہمارے اسکوٹر کی عزت میں اضافہ فرمایا ہے۔اُردو کا شاید ہی کوئی ایسا ادیب اور شاعر بچ رہا ہو جو اس اسکوٹر پر ہمارے ساتھ نہ بیٹھا ہو۔ یہاں تک کہ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی بھی دو ایک بار مختصر فاصلے تک اس پر بیٹھ چکے ہیں۔ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ سیکڑوں آرٹسٹوں، عہدیداران بالا، ارکان پارلیمنٹ اور سیاسی لیڈروں نے ہمارے اسکوٹر کو رونق بخشی ہے۔ نتیجہ میں بعض تو بعد میں مرکزی کابینہ میں وزیر بنے اور بعض تو ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ بھی بنے۔لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے لیکن ہم نے اپنے اسکوٹر کے ساتھ خوش اور مطمئن رہنے کو ضروری جانا۔ وفاداری بشرط استواری اسی کو تو کہتے ہیں۔اگر چہ ملک کے مایہ ناز آرٹسٹ ایم ایف حسین بھی ہمارے اسکوٹر کو رونق بخش چکے ہیں لیکن پاکستانی آرٹسٹ صادقین مرحوم کو ہمارا اسکوٹر کچھ اتنا پسند تھا کہ ٹیکسی لے کر ہمارے گھر آتے تھے اور ہمارے اسکوٹر پر بیٹھ کر دہلی کی سیر کو نکلتے تھے۔ واپسی میں ہمیں اور ہمارے اسکوٹر کو گھر چھوڑ کر پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے ٹھکانے پر روانہ ہو جاتے تھے۔ جتنی دیر پیچھے بیٹھتے تھے اتنی دیر تک اپنی انگشت شہادت کی مدد سے ہماری پیٹھ پر یا تو کوئی خیالی تصویر بنایا کرتے تھے یا آیات قرآنی کی خطاطی فرماتے تھے۔ گرمی کے دنوں میں ایک رات پاکستانی گلوکار غلام علی ہمارے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ شدید حبس کا عالم تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس حبس سے بچنے کے لئے ہم یونہی اسکوٹر چلاتے رہیں لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ پیچھے بیٹھے بیٹھے کوئی نہ کوئی راگ الاپنا شروع کر دیتے تھے۔ نتیجہ میں ہمیں آگے بیٹھے بیٹھے پیٹھ پیچھے الٹی داد بھی دینی پڑتی تھی۔ بیشتر اُردو شاعروں کو اپنے اسکوٹر پر بٹھانے کی وجہ سے ہمیں اس طرح کے پوز میں داد دینے کی خاصی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔اب کیسے بتائیں کہ اس اسکوٹر سے ہماری کتنی ہی قیمتی اور خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔ ہم ان نامور خواتین کے نام یہاں نہیں لکھنا چاہتے جنھوں نے ہمارے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ کو رونق بخشی ہے کیونکہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں (ایک تو ہماری اہلیہ محترمہ ہی ہیں)۔

ستائیس برس کے لمبے عرصے میں دو مرتبہ ہم اس اسکوٹر سے گرے بھی لیکن بعد میں اس کی کچھ ایسی مرمت کروائی کہ یہ بالکل نیا نظر آنے لگا۔ اگر چہ پانچ چھ برس پہلے ہمارے پاس

موٹر بھی آ گئی تھی۔ ہم اس میں بیٹھے ضرور لیکن اسے ہمارے بچّے ہی چلاتے رہے۔ جب بھی ہم اکیلے نکلے اپنے اسکوٹر پر ہی نکلے۔ چار پانچ مہینے پہلے جب گھٹنوں کی سرجری کے بعد ہم اس کو چلانے کے قابل نہیں رہ گئے اور بعد میں دہلی کی سرکار نے بھی اس اسکوٹر کو دہلی کی سڑکوں پر چلنے کی قابل نہیں رکھا اور ایک کباڑی والا چار سو روپیوں میں اسے خریدنے کے ارادہ سے ہمارے گھر کے چکر لگانے لگا تو ہم نے پچھلے دنوں اپنے اس اسکوٹر کو بادیدہ نم پورے ایک ہزار روپے خرچ کر کے حیدرآباد روانہ کر دیا تا کہ یہ یاقوت پورہ میں ہمارے بڑے بھائی کے داماد عبدالجبار کے گھر میں محفوظ رہ سکے۔ جس اسکوٹر کی رفاقت میں ہم نے اپنی زندگی کے کئی مرحلے طے کئے تھے آج وہ حیدرآباد میں چپ چاپ کھڑا ہے۔ دہلی میں بیٹھ کر ہم جب بھی اس اسکوٹر کو یاد کرتے ہیں تو داغؔ کا شعر یاد آ جاتا ہے۔

ہوش و حواس، تاب و تواں داغؔ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

روزنامہ ''سیاست'' (۲۵ر فروری ۲۰۰۱ء)

کچھ خواب تھے ہمارے

لگ بھگ بیس برس بعد کل رات گہری نیند میں ہم نے سچ مچ ایک خواب دیکھا۔ایک ایسا خواب جو خوبصورت تھا اور حسین بھی۔ڈراؤنے خواب تو ہمیں پہلے بھی نہیں دکھائی دیتے تھے۔ جب بھی کوئی خواب دیکھا تو اچھا خواب ہی دیکھا۔یوں بھی ان دنوں ڈراؤنے خواب دیکھنے کے لئے آنکھیں بند کر کے نیند کی آغوش میں جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ ماشاءاللہ اب زندگی خود اتنی ڈراؤنی ہوگئی ہے کہ اس کے واقعات کے آگے بڑے سے بڑا ڈراؤنا خواب بھی شرما جائے۔ڈراؤنے خوابوں کے معاملہ میں جب عملی زندگی اپنے آپ ہی خود مکتفی ہوگئی ہو تو ڈراؤنے خواب دیکھنے کی تمنا کون کرے۔البتہ ہمیں اچھے اور حسین خوابوں کی حاجت ہمیشہ رہی۔مگر ادھر نہ جانے کیا بات ہوگئی تھی کہ بیس بائیس برسوں سے ہم نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔نہ اچھا نہ برا۔یہ ضرور ہے کہ بیس بائیس برس پہلے جب ہم ٹوکیو گئے تھے تو ہمیں وہاں ایک ایسے کمرہ میں ٹھہرایا گیا تھا جو بہت چھوٹا تھا۔یوں بھی جاپانیوں کی ہر شئے چھوٹی ہوتی ہے سوائے کردار کے۔گھروں کے علاوہ وہاں ہوٹلوں میں بھی وسیع وعریض کمروں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔اس چھوٹے سے کمرہ میں جب ہم صبح بستر سے جاگتے ہی عادت کے مطابق بھرپور انگڑائی لیتے تھے تو اس انگڑائی میں کبھی ٹیلی فون کا تار پھنس جاتا تھا یا کبھی یہ انگڑائی ٹیلی ویژن یا لکھنے کی میز سے ٹکرا جاتی تھی۔ایک روز رات کو ہم سونے کے لئے اس کمرہ میں جانے لگے تو کسی نے انگریزی محاورے اور آداب کے مطابق کہا'' آج رات کوئی اچھا سا خواب دیکھئے''۔اس پر ہم نے کہا'' کیا کریں! ہوٹل کا کمرہ اتنا

چھوٹا ہے کہ اس میں کسی خواب کے داخل ہونے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ سچ پوچھئے تو خود ہم بھی اس کمرے میں بڑی مشکل سے داخل ہوتے ہیں"۔ ہمارے اس تبصرے کی اطلاع ہوٹل کے انتظامیہ کو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ "اگر آپ کو خواب دیکھنے کے لئے بڑے کمرہ کی ضرورت ہو تو وہ آپ کو مل جائے گا۔ پانچ ہزار رین کی بجائے دس ہزار رین کرایہ دینا ہوگا"۔ کرایہ میں اضافہ کی بات کو سن کر ہم اتنے خوفزدہ ہوئے کہ خواب دیکھنا تو بہت دور کی بات ہے ہمیں اُس رات نیند تک نہیں آئی۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے اس واقعہ کے بعد سے ہمیں خواب آنے بند ہوگئے۔ ہم خود حیران تھے کہ ہمارے ان حسین خوابوں کو کیا ہوگیا جو شعر کی طرح ہم پر نازل ہوا کرتے تھے۔ یوں بھی ہماری زندگی میں ان خوابوں کے سوائے رکھا بھی کیا ہے۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ نوجوانی میں ہمیں جو خواب آیا کرتے تھے ان میں صنف نازک سے تعلق رکھنے والے کرداروں کی بھرمار ہوا کرتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہمارے خواب میں آنے کے لئے یہ کردار ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے ہیں۔ ہمیں یہ خواب اچھے بھی لگتے تھے کیونکہ ان ہی کے سہارے تو زندگی بخیر و خوبی گذر جایا کرتی تھی۔ نیند تو خیر نیند ہے ہم تو جاگتے میں بھی ایسے خواب بڑی روانی کے ساتھ دیکھا کرتے تھے۔ حد ہوگئی کہ شادی کے بعد بھی ہم کچھ اسی نوعیت کے خواب دیکھا کرتے تھے جن کی وجہ سے ہماری بیوی سے ہمارا جھگڑا بھی ہو جایا کرتا تھا۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے ڈراؤنے خواب ہمیں کبھی نہیں آتے مگر اس کے باوجود ایک ڈراؤنا خواب ہم نے ایسا دیکھا تھا جس کی وجہ سے ہم نیند سے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے تھے۔ بیوی نے پوچھا "کیا ہوا؟"۔ ہم نے بتایا کہ ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے جس کے باعث گھبرا کر اٹھ بیٹھے ہیں۔ اور کوئی بات نہیں۔ بعد میں دو تین مرتبہ یہی ڈراؤنا خواب دیکھا تو بیوی نے پوچھا "آخر تم ایسا کونسا ڈراؤنا خواب دیکھتے ہو جس کی وجہ سے تم گہری نیند سے بیدار ہو جاتے ہو؟"۔ بیوی نے جب بہت اصرار کیا تو اسے اصلیت بتانی پڑی کہ اس ڈراؤنے خواب میں تم ہی چلی آتی ہو۔ اور میں ہر بار یہ منظر دیکھتا ہوں کہ میری تم سے شادی ہو رہی ہے۔ شادی تو ہماری کب کی ہو چکی ہے لیکن اب خواب میں آکر مجھے ڈرانے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ہی بستر پر سو جاتی ہو جہاں تم بھی موجود رہتی ہو اور میں بھی۔ ایسی صورت میں خواب میں آنے کا تکلف کیوں کرتی ہو۔ یہ بات تو تم مجھے جگائے بغیر بھی کہہ سکتی ہو کہ میری تم سے شادی ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب اس بات کو لے کر بار بار خواب میں آکر ڈرانے کی کیا

ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد بیوی ہم سے ناراض رہنے لگی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس ڈراؤنے خواب کے علاوہ ہم نے کوئی اور ڈراؤنا خواب نہیں دیکھا۔ دوسری طرف ہم اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انسان بسا اوقات خواب کا سہارا لے کر دلیری اور شجاعت کی باتیں بھی کر جاتا ہے۔ نوجوانی کے دنوں میں ہمارے ایک دوست ہوا کرتے تھے۔ انھیں ایک لڑکی سے محبت ہوگئی تھی۔ لہٰذا انہوں نے اس لڑکی سے ربط ضبط بڑھایا اور ان کا زیادہ تر وقت اس لڑکی کے ساتھ گذرنے لگا۔ برسوں تک ان دونوں کی ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا لیکن ہمارے یہ دوست تھے ڈرپوک آدمی۔ اظہار محبت کے معاملہ میں اپنی طرف سے پہل کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ طویل انتظار کے بعد ایک دن انہوں نے ہمت جٹا کر لڑکی سے کہا "کل رات میں نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا"۔ لڑکی نے پوچھا "کیا خواب دیکھا؟"۔ نظریں نیچی کر کے بولے "میں نے کل خواب میں تمہیں دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ میں تم سے شادی کرنے کی درخواست کر رہا ہوں، سچ بتاؤ یہ خواب کس بات کی علامت ہے؟"۔ اس پر لڑکی نے کہا "یہ خواب اس بات کی علامت ہے کہ تم نیند میں زیادہ سمجھداری کی باتیں کرتے ہو۔ کاش کہ تم جاگتے میں بھی ایسی ہی سمجھداری کی باتیں کرسکتے"۔

بہر حال ہم نے زندگی میں بے شمار خواب دیکھے۔ ایسے خواب بھی دیکھے جن میں ہمیں مرکزی اہمیت حاصل ہوا کرتی تھی۔ ایسے خواب دیکھتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے ساری دنیا ہماری مٹھی میں ہے۔ ہماری مرضی اور ہمارے حکم کے بغیر اس دنیا کا کوئی کام نہیں ہوسکتا لیکن جب عملی زندگی میں داخل ہوئے اور ہمیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہونے لگا تو اپنے خوابوں میں ترمیم کرنے لگے۔ ایک خواب یہ تھا کہ ہمارا ایک عالیشان مکان ہو جس کے آگے پانچ چھ موٹریں کھڑی ہوں، نوکر چاکر ہوں، ہمارے آگے پیچھے لوگوں کی بھیڑ ہو، لیکن جب زندگی کا بڑا حصہ کرایہ کے مکانوں میں گذار دیا اور برسوں بسوں میں دھکے کھاتے رہے تو ہم نے اس خواب میں حسب ضرورت ترمیم کرنی شروع کردی۔ اب عالیشان مکان کے خواب دیکھنے کی بجائے ہم ایک ایسے مالک مکان کا خواب دیکھنے لگے جو پہلی تاریخ کو کرایہ مانگنے نہ آیا کرے۔ اس میں اتنی انسانیت تو رہے کہ ہم مہینوں مکان کا کرایہ ادا نہ کریں اور وہ کرایہ کا تقاضہ نہ کرے بلکہ ہوسکے تو ہمارے گھر کے خرچ کے لئے بھی کچھ رقم دیدیا کرے تاکہ ہمیں ایروں غیروں سے قرض مانگنے کی نوبت نہ آئے۔ موٹر نشینی کا خواب چکنا چور ہوا تو ہم ایسے خواب دیکھنے لگے کہ کاش ہمیں بس اسٹاپ پر بسوں کا بڑی دیر تک

انتظار نہ کرنا پڑے اور ہمیں جاتے ہی بس میں جگہ مل جائے۔ بعد میں ہم نے ایسے خوابوں سے بھی مطمئن رہن لگے کہ کاش ہمارے گھر میں بجلی کبھی فیل نہ ہو، تاجر چیزوں میں ملاوٹ نہ کریں اور ان کے ناپ تول میں بے ایمانی نہ کریں۔ بالآخر جب ہمارے ترمیم شدہ چھوٹے موٹے خواب بھی پورے نہیں ہونے لگے تو ہم نے خواب دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ مگر ہم کیا اور ہمارے خواب کیا۔ اس دنیا میں بڑی بڑی ہستیوں کے خواب بھی پورے نہیں ہوئے۔ ابھی پچھلی دو صدیوں میں کارل مارکس اور لینن نے خواب دیکھا تھا کہ اس دنیا میں نہ کوئی غریب ہو اور نہ امیر، ساری دنیا میں مساوات کا بول بالا ہو اور کوئی کسی کا استحصال نہ کرے۔ مگر جب ان کے خوابوں کے پورے ہونے کی صورت نکلنے لگی تو لوگوں نے ان کے خوابوں کو ہی بیچنا شروع کر دیا۔ جب خواب جیسی حسین چیز بھی بکاؤ مال بن جائے تو پھر آدمی خواب کو دیکھ کر کیا کرے۔ یوں بھی دنیا اب بے بہرہ، بے عقیدہ، بے معنی اور بے ہنگم ہوتی جا رہی ہے۔ خواب تو خیر خواب ہیں لفظ اور ان کے معنی تک ہمارے قابو میں نہیں رہنے لگے ہیں۔ ہم اس بے خواب دنیا کے بارے میں سوچتے ہیں تو شکر بجالاتے ہیں کہ ہم نے خواب دیکھنے کی عادت ترک کر دی ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۲۱/اکتوبر ۲۰۰۱ء)

فصیح اُردو بولیے اور حوالات کی ہوا کھایئے

انگریزی روزنامہ 'ٹائمس آف انڈیا' نے عوام النّاس اور خاص طور پر اُردو بولنے والوں کی سہولت کے لے یہ خبر شائع کی ہے کہ اگر آپ کبھی دہلی کے انٹرنیشنل ہوائی اڈے پر کسی کام سے جائیں تو خدارا فصیح و بلیغ اُردو میں بات نہ کریں کیونکہ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کو حوالات میں نہ بند کر دیا جائے۔ مانا کہ اُردو کے بہت سے دشمن ہیں اور اس بیچاری زبان کے ساتھ ہمارے ملک میں پچھلے پچاس برسوں سے معاندانہ رویہ اختیار کیا جارہا ہے۔ لیکن معاندانہ رویے کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اگر کوئی یہ زبان بولے تو اسے پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا جائے۔

'ٹائمس آف انڈیا' نے اپنی تفصیلی خبر میں بتایا ہے کہ پچھلے دنوں تین نوجوان مسعود، ارشد اور محمد اپنے استاد مولوی عبدالعزیز ندوی کا استقبال کرنے کے لئے بطور خاص رام پور سے دہلی ئے تھے۔ چونکہ مولوی عبدالعزیز ندوی، دوبئی سے واپس ہونے والے تھے اس لئے یہ تینوں نوجوان رات میں دوبئی کی پرواز کی آمد کے وقت اندرا گاندھی بین الاقوامی ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ بڑی دیر تک وہ اپنے استاد کے ایرپورٹ سے باہر نکلنے کا انتظار کرتے رہے لیکن جب وہ ہوائی اڈے سے باہر نہیں نکلے تو ان نوجوانوں میں سے ایک نے کہا "پتہ نہیں کیا مسائل ہیں، یہاں تو ایک نہیں کئی مسائل ہیں۔ پہلا کسٹم دوسرا ایمگریشن۔ ہمارے ہاں مسائل کی کوئی کمی تھوڑی ہے"۔ جب یہ باریش نوجوان اپنے دیگر باریش ساتھیوں سے "مسائل" کی بات کر رہا تھا تو برابر

میں بیٹھا ہوا ایک حساس نوجوان بھی ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اُسے فصیح و بلیغ اُردو نہیں آتی تھی، اس نے جب یہ جملہ سنا کہ "ہمارے ہاں مسائل کی کوئی کمی نہیں ہے" تو اس نے یہ سمجھا کہ ان نوجوانوں کے پاس 'مزائیلوں' کی کوئی کمی نہیں ہے اور یہ کہ وہ ان مزائیلوں کی مدد سے ہوائی اڈے کو اُڑا دینا چاہتے ہیں۔ اس ذمہ دار نوجوان نے فوراً پولیس کو اطلاع دیدی کہ یہ نوجوان مزائیل کی مدد سے ایرپورٹ کو اُڑا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہماری پولیس کے بارے میں آپ تو جانتے ہیں کہ جہاں فوری کارروائی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تو کوئی کارروائی نہیں کرتی لیکن غیر اہم معاملوں میں بڑی چاق و چوبند ہو جاتی ہے۔ چنانچہ چند ہی منٹوں کے اندر پولیس نے ان نوجوانوں کو گرفتار کرلیا اور بارہ گھنٹوں تک ان سے شدید باز پرس کی گئی۔ پہلے تو ان کی جامہ تلاشی لی گئی کہ کہیں مزائیل ان کی جیبوں میں تو نہیں رکھے ہوئے ہیں۔ نوجوانوں نے وضاحت کی کہ وہ تو صرف ان 'مسائل' کی بات کر رہے تھے جو ہوائی اڈہ پر مسافروں کو پیش آتے ہیں۔ پھر یہ بھی سمجھایا گیا کہ فصیح اُردو میں 'مسائل' کا مطلب Problems ہوتا ہے اور ہم تو صرف مسئلوں کی بات کر رہے تھے۔ مزائیل سے ہمارا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے مگر پولیس تو صرف ڈنڈے کی زبان جانتی ہے۔ اُردو وہ کیا جانے۔ ان نوجوانوں سے پوچھا جانے لگا کہ وہ کتنی بار پاکستان جا چکے ہیں اور "جیش محمد" سے ان کا کیا تعلق ہے۔ ان نوجوانوں کے انگوٹھوں کے نشانات لئے گئے اور مختلف زاویوں سے ان کی تصویریں کھینچی جانے لگیں۔ ہوائی اڈہ کی پولیس نے چار گھنٹوں تک ان سے باز پرس کی اور بعد میں انھیں انٹلی جنس بیورو کے عہدیداروں کے حوالہ کردیا گیا۔ لگاتار بارہ گھنٹوں تک ان نوجوانوں کو پولیس نے اپنی حراست میں رکھا۔ ان نوجوانوں نے ہزار بار کہا کہ رام پور پولیس سے ان کے کردار کی توثیق کرلی جائے لیکن ہوائی اڈے کی پولیس کو "مسائل" اور "مزائیل" کا فرق معلوم نہ ہوسکا۔ بعد میں ان نوجوانوں کو 'مسائل' سے نجات اُس وقت ملی جب ان میں سے ایک نے اپنے چچا حافظ عمر صادق سے رابطہ قائم کیا جو اتر پردیش کے سابق وزیر اور سابق رکن پارلیمنٹ رہ چکے ہیں۔ حافظ عمر صادق صاحب نے مراد آباد میں پولیس کے اعلیٰ عہدیداروں سے بات کی تب کہیں جا کر ان نوجوانوں کی رہائی عمل میں آئی۔ بارہ گھنٹوں کی شدید باز پرس کے بعد یہ نوجوان اتنے خوفزدہ ہوگئے تھے کہ جب انھیں رہا کرنے کا مرحلہ آیا تو انھیں یہ اندیشہ بھی ہوا کہ رہائی کے وقت کہیں کسی فرضی انکاؤنٹر میں انھیں ہلاک نہ کردیا جائے۔ لہذا انھوں نے ایک ممتاز مسلم

رہنما سے ربط پیدا کیا کہ وہ انھیں اپنی نگرانی میں رہائی دلوائیں۔

بہر حال بارہ گھنٹوں کی طویل آزمائش کے بعد جب وہ باہر نکل آئے تو انھیں پتہ چل گیا کہ اُردو کے 'مسائل' بھی 'مزائیل' سے کچھ کم نہیں ہیں، آپ نے دیکھا کہ آج کے زمانہ میں فصیح وبلیغ اُردو بولنے کے کتنے نقصانات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم عام بات چیت میں کبھی فصیح وبلیغ اُردو کا استعمال نہیں کرتے۔ اگر آپ کہیں سانس کے 'زیر و بم' کا غلطی سے ذکر کردیں تو کیا عجب کہ پولیس آپ کو بم رکھنے کے جرم میں پکڑ لے اور بارہ گھنٹوں کی تفتیش کے بعد ہی چھوڑے۔ بہت عرصہ پہلے ہمارے ایک شناسا بیمار ہوئے تو ہم ان کی مزاج پرسی کرنے کے لئے گئے اور آداب کے مطابق جب ان سے کہا "سنا ہے کہ مزاج دشمناں ناساز ہے" تو اتنا سنتے ہی موصوف خوشی سے اُچھل کر بستر علالت پر اٹھ بیٹھے اور بصد اشتیاق پوچھنے لگے "بتائیے میرے کس کس دشمن کی طبیعت ناساز ہے۔ ان بدمعاشوں کی وجہ سے ہی تو میں بیمار ہو گیا ہوں۔ اگر میرے سارے دشمن بیمار ہو جائیں تو مجھے بیمار پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔" پھر وہ اپنے ایک ایک دشمن کا ذکر تفصیل سے کرنے لگے کہ کس کس نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ ہم گئے تو تھے ان کی مزاج پرسی کرنے لیکن واپسی میں ان کے دشمنوں کی تعداد معلوم کر کے آگئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم عام بات چیت میں اُردو محاوروں اور استعاروں وغیرہ کا استعمال کم سے کم کرتے ہیں۔ ہمارے ایک پہلوان دوست سے ہمیں اپنا کوئی مدعا بیان کرنا تھا۔ ہم نے احتراماً جب ان سے کہا "حضور آپ کی طبع نازک پر گراں نہ گذرے تو ایک بات عرض کریں"۔ اتنا سنتے ہی وہ بپھر گئے اور بولے "میاں! میں نامی گرامی پہلوان ہوں، میری شہرت کے ڈنکے ہر جگہ بجتے ہیں، میں سراسر طاقت اور توانائی ہوں۔ میرے بدن میں کوئی چیز نازک ہے ہی نہیں۔ پھر تم کس طبع نازک کی بات کررہے ہو"۔ ان کی یہ بات ہماری طبع نازک پر اتنی گراں گذری کہ ہم اپنا مدعا بیان کئے بغیر ہی وہاں سے واپس آگئے۔ فصیح و بلیغ اُردو بولنے کے نقصانات سے تو ہم واقف ہی ہیں لیکن کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اُردو بولنے کے بعد آدمی کو حوالات کی ہوا بھی کھانی پڑتی ہے۔ اب وہ زمانے گزر گئے جب لوگ طلسم ہوش رُبا اور فسانہ عجائب کی زبان میں بات کیا کرتے تھے۔ ہمیں اس وقت ساغر نظامی مرحوم یاد آگئے جو عام بات چیت میں بھی اُردو کے طوطا مینا بنایا کرتے تھے۔ سنا ہے کہ نوجوانی میں وہ ایک خاتون کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے لیکن اس سے اپنے دل کا مدعا بیان

کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ یہ خاتون اُردو زبان اور تہذیب سے بالکل نابلد تھیں۔ ایک دن ساغر نظامی نے دفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی فصیح و بلیغ اُردو میں اپنے دل کا مدعا کچھ اس طرح بیان کیا ''محترمہ! میں ہجر کی جان لیوا کیفیت سے عاجز آ گیا ہوں۔ ہجر کے عذاب نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ اب میں وصل کی راحتوں اور لذتوں سے ہمکنار ہونا چاہتا ہوں اور آپ کی آغوش میں اپنی زندگی کے بقیہ ایام گذارنا چاہتا ہوں۔'' خاتون کو پتہ نہیں تھا کہ ہجر کس چڑیا کا نام ہے اور وصل کس کو کہتے ہیں۔ جب اس نے ساغر نظامی سے کہا'' کیا آپ مجھے اپنی مشکل اُردو کا آسان مطلب سمجھا سکتے ہیں؟'' تو اس پر ساغر نظامی نے کہا'' کیا آپ میرے بچوں کی ماں بننا پسند کریں گی؟''۔ اس آسان سوال کے جواب میں خاتون کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بڑی معصومیت سے پوچھا'' پہلے یہ تو بتائیے کہ آپ کے بچے کتنے ہیں تاکہ میں ان کی ماں بننے کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکوں''۔ گویا مشکل اُردو بولنے کے نقصانات ہی نقصانات ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اُردو تو نہیں جانتے لیکن انھیں اُردو کے مشکل الفاظ بولنے کا بڑا جنون ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک صاحب نے ہمیں کسی ادبی تقریب میں بلایا تھا۔ انھیں کسی نے بتا دیا تھا کہ 'بدعنوانی' اور 'کم ظرفی' کے الفاظ کسی کی اعلیٰ صفات کو بیان کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہمارے لئے جو تعارفی تقریر کی وہ کچھ اس طرح تھی۔'' آپ نے ہمارے جلسہ میں شرکت کر کے اپنی 'کم ظرفی' کا ثبوت دیا ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں آپ کا تعارف کراؤں حالانکہ آپ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ کم ظرفی میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ آپ کی ذات بابرکات میں کم ظرفی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور جگہ جگہ آپ کی 'بدعنوانیوں' کے چرچے ہیں۔ آپ اپنی بدعنوانیوں کی وجہ سے تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔'' لوگ تو ان کی تقریر کو سن کر ہنسنے لگے اور ہم شرم سے پانی پانی ہوتے چلے گئے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۰ر فروری ۲۰۰۲ء)

☆☆

کویل کی کُوک کو سُن کر

نہ جانے کتنے ہی برسوں بعد کل سویرے آنکھ کُھلی تو کانوں میں اچانک کویل کی کوک سنائی دی۔ہمیں تو یقین ہی نہ آیا کہ یہ ہمارے اپنے کان ہیں،کویل تو بہت دور کی بات ہے، کچھ دیر کے لئے شبہ ہوا کہ شاید کسی ٹیلی ویژن یا ریڈیو پروگرام میں کوئی کویل کوک رہی ہو لیکن ٹیلی ویژن اور ریڈیو دونوں بند تھے۔صبح کی سپیدی بھی اچھی طرح افق پر نمودار نہیں ہوئی تھی۔بستر میں پڑے پڑے سوچتے رہے کہ اتنے برسوں تک یہ کویل کہاں غائب رہی یا ہم ہی کویل سے دور رہے۔ انسان اپنی غلطی کہاں تسلیم کرتا ہے۔اسے تو الزام عائد کرنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ان دنوں جبکہ انسانوں نے ایک دوسرے کی باتوں کو سننا اور سمجھنا چھوڑ دیا ہے ایک کویل کی آواز نے اچانک ہم سے بہت کچھ کہہ دیا۔ایک زمانہ تھا جب کویل کی کوک ہمارے روزمرہ میں شامل تھی۔روز ہی کویل کی کوک سنائی دیتی تھی اور دل میں کتنے ہی جذبوں کو بیدار کر دیتی تھی۔ہماری نوجوانی کے وہ دن جو کبھی دیہاتوں اور کھیتوں کے درمیان گذرا کرتے تھے وہاں کویل کی کوک کوئی نئی بات نہیں تھی۔کویل ہم سے کیا کہنا چاہتی تھی ہمیں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر اس کوک کو سن کر ہمارے سارے وجود پر ایک سرشاری سی طاری ہو جاتی تھی۔کویل سے تو ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے لیکن کویل کی کوک کے حوالے سے ہمیں وہ سب کچھ یاد آ جاتا تھا جو ہم کسی سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا تھا کہ کویل کی یہی کوک جب اس ہستی کے کان میں پڑے گی جس سے ہم کچھ کہنا چاہتے تھے تو ہو سکتا ہے ہمارے دل کی ساری باتیں اس ہستی تک پہنچ جائیں۔ترسیل کا یہ

عجیب وغریب انداز بھلے ہی کسی کو مضحکہ خیز لگے لیکن یہ تھا بڑا توانا اور مستحکم۔ آپ یقین کریں کہ ایک عرصہ تک کویل کی یہ کوک ہمارے سارے وجود میں پیار، محبت، خلوص اور انسانیت کی شمعیں جلا دیتی تھی۔ کہنے کو کویل ایک پرندہ ہے لیکن اس کی معرفت ہم پیار اور محبت کا درس لیا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں جب ہم بڑے شہروں میں رہنے لگے تو کویل اور اس کی آواز ہم سے دور ہوتی چلی گئی۔

کل جب سویرے سویرے اچانک اس کویل کی آواز کانوں میں پڑی تو احساس ہوا کہ اس کویل نے ہم سے ڈھیروں ایسی باتیں کہہ دی ہیں جنھیں ہم لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے۔ کتنے ہی جذبے اچانک بیدار ہو گئے، کتنی ہی یادیں روشن ہو گئیں۔ اس عرصہ کی بازیافت ہو گئی جس میں پچاس ساٹھ برس پہلے ہم سانس لیا کرتے تھے۔ ہم سوچنے لگے کہ انسانوں کی بھیڑ میں رہتے رہتے جب ہمیں خود انسانوں کی باتیں سمجھ میں نہیں آنے لگی ہیں بلکہ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آنے لگا ہے تو افراتفری اور نفسا نفسی کے اس ماحول میں اس کویل نے اپنی ایک کوک کے ذریعہ ایسی کیا بات کہہ دی کہ ہمارے جذبوں کے تار جھنجھنا اُٹھے ہیں۔ کائنات اور انسانیت پر پھر سے اعتماد بحال ہونے لگا ہے۔ جہاں انسانیت پر اعتماد کی بحالی کے لئے اب کسی انسان کی بات پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا وہاں ایک ادنیٰ کویل نے ہم میں انجان اور معصوم جذبوں کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ کہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم انسانوں کی باتوں سے دُور اور پرندوں کی بولیوں سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ بخدا اب تو کبھی اپنے انسان ہونے پر شرم سی آتی ہے اور ندامت کا احساس ہوتا ہے۔ قدرت نے انسان کو اظہار کے لئے لاکھوں لفظ عطا کئے ہیں لیکن بیچاری کویل کو صرف ایک کوک عطا کی ہے لیکن یہ اکیلی کوک نہ جانے ہم سے اتنی ساری باتیں کس طرح کہہ گئی کہ اس کے آگے سارے لفظ ہیچ اور بے معنی نظر آنے لگے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ جس کویل کی آواز ہم نے کل سنی اس کے پرکھوں کی آواز ہم نے کئی برس پہلے کب سنی تھی۔ اس کی کئی پشتیں اب تک گذر چکی ہونگیں۔ پرندوں کی عمر ہی کتنی ہوتی ہے۔ پانچ دس برس میں اپنی زندگی کے سارے کاروبار سے فراغت پا کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اسی میں ان کا بچپن آتا ہے، جوانی کے آتے ہیں، مرادوں کی راتیں آتی ہیں۔ قدرت نے ان کے ذمہ جو کام سونپا ہے اسے انجام دے کر چپ چاپ اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ انسان اب برسوں زندہ رہنے لگا

ہے۔قدرت نے اس کے ذمہ جو کام سونپا ہے اُسے انجام دینے کی بجائے اب وہ کائنات ہی سے بدلہ لینے لگا ہے۔ہم یہ سوچ کر حیران ہو جاتے ہیں کہ قدرت نے لاکھوں برس پہلے کویل کو جو کوک عطا کی تھی وہ اسی پر قانع اور مطمئن ہے اور اسی ایک کوک کے ذریعہ وہ اپنی زندگی کا سفر طے کر لیتی ہے۔انسان نے صدیوں کے لمبے سفر میں اپنے اظہار کے لئے بے شمار لفظ ایجاد کر لئے ہیں۔کئی زبانیں اپنائی ہیں لیکن لفظوں کی اس بہتات میں لگتا ہے انسان اپنی آواز کو کھوتا جا رہا ہے۔لفظ اپنے معنی بدلتے جا رہے ہیں۔انسان نے ہزاروں ڈکشنریاں تیار کر رکھی ہیں لیکن ان میں شامل کتنے ہی لفظوں کے وہ معنی نہیں جانتا۔لفظوں کی اس بہتات میں وہ گونگا اور بہرہ ہوتا جا رہا ہے۔لفظ اب اس کے قبضۂ قدرت میں نہیں رہے۔جو لفظ وہ بولتا ہے خود ان پر عمل کرنے کا وہ اہل نہیں رہا۔ڈکشنریوں کی حیثیت اب لفظوں کے تابوتوں کی ہو گئی ہے۔کیا انسان کو زندہ رہنے کے لئے اب واقعی اتنے سارے لفظوں کی ضرورت ہے۔کیا ان سارے لفظوں کو ملا کر انسان کے لئے بھی ایک ایسی کوک ایجاد نہیں کی جا سکتی جو سب کی سمجھ آ سکے۔اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے بعد انسانوں نے اب ایک ایسا ماحول تیار کر لیا ہے جہاں وہ ایک دوسرے کی بات کو سمجھنے کے اب قابل نہیں رہے ہیں۔قومی اور بین الاقوامی سطح پر اب ایسے دانشور اور سیاستدان ہمیں جا بجا نظر آنے لگے ہیں کہ جب وہ محبت اور بھائی چارے کی بات کرتے ہیں تو لگتا ہے قتل دغا رنگری اور بربادی کی باتیں کر رہے ہیں۔جب وہ آپس میں گلے ملتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ گلے نہ مل رہے ہوں بلکہ ایک دوسرے کے گلے دبوچ رہے ہوں۔ان کے قول اور فعل میں ہمیں کہیں بھی کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔اسی لیے تو ہم لفظوں اور ان کے مفہوم سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔کس کی بات سنیں اور اگر سنیں تو اس پر یقین کس طرح کریں۔لگتا ہے انسانوں نے لفظ اس لئے ایجاد نہیں کئے کہ ان کی مدد سے اپنی بات دوسرے تک پہنچا سکیں بلکہ لفظ اس لئے ایجاد کئے ہیں کہ ان کی مدد سے ایک دوسرے کو دھوکہ دے سکیں اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچا سکیں۔ان لفظوں کی مدد سے وہ انسانیت کا دامن تار تار کرتے چلے جا رہے ہیں۔انسانوں کا قتل تو ہوتا ہی جا رہا ہے۔اب الفاظ کا بھی قتل عام ہونے لگا ہے اور لفظوں کے قتل عام کو ہم انسانیت کا قتل عام سمجھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کل اچانک کئی برس بعد کویل کی آواز سنی تو اس کی کوک نے ہم سے کئی باتیں کہہ دیں۔لاکھوں برسوں سے کویل کے پاس صرف ایک کوک ہے۔نہ وہ کوئی زبان جانتی

ہے اور نہ ہی اس کی بولی کی کوئی ڈکشنری ہے۔ کوا ہزاروں برسوں سے صرف کائیں کائیں کرتا چلا آرہا ہے اور اپنی زندگی کے سارے کام انجام دے کر دنیا سے چپ چاپ چلا جاتا ہے۔ انسان پہلے بات کرنا نہیں جانتا تھا۔ پھر اس نے بات کرنا سیکھا، سیکڑوں زبانیں ایجاد کیں، کئی بولیاں اختیار کیں، کئی لفظ بنائے اور انھیں مفہوم عطا کیا، مگر اب انسانؔ کے یہ لفظ کھوکھلے ہوتے جارہے ہیں اور ان کا مفہوم بدلتا جارہا ہے۔ انسان ان لفظوں کے ذریعہ اب اپنے دل کا مدعا ایک دوسرے سے بیان کرنا نہیں چاہتے بلکہ ان لفظوں کی مدد سے ایک دوسرے کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے اب ہمیں کویل کی کوک کے آگے ساری زبانوں کے لفظ بے توقیر اور بے معنی نظر آنے لگے ہیں۔ صدیوں کے سفر کے بعد کویل کی کوک نے اپنا مفہوم نہیں کھویا البتہ انسانوں کے لفظ اب اپنے مفاہیم کھوچکے ہیں، کھوکھلے اور ننگے ہوچکے ہیں۔ کویل کی آواز سن کر ہمیں لندن کے علاقہ ہیمپسٹیڈ میں واقع مشہور شاعر کیٹسؔ کا وہ گھر یاد آیا جہاں کسی بلبل کی آواز کو سن کر کیٹس نے اپنی شہرہ آفاق نظم ''Ode to Nightingale'' لکھی تھی۔ اس نظم میں کیٹسؔ نے کتنی ہی خوبصورت باتیں کہی تھیں۔ کیا اکیسویں صدی کا انسان کیٹسؔ کی اس نظم کے پیغام کو سمجھ سکتا ہے۔ اسی لئے تو ہمیں اب کویل کی کوک اور بلبل کا نغمہ انسانوں کی باتوں سے کہیں زیادہ معتبر، سچے اور مستحکم نظر آنے لگے ہیں۔

روزنامہ ''سیاست'' (۳۱/مارچ ۲۰۰۲)

فُٹ بال کا بخار

فٹ بال کا بخار اب اپنے نقطہ عروج کو پہنچنے والا ہے اور سیمی فائنل مقابلوں کے بعد اب فائنل مقابلہ کی باری آئے گی۔ اس کے بعد پھر چار برسوں تک کوئی فٹ بال کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ یہ بھی یاد نہیں رہے گا کہ فٹ بال گول ہوتا ہے یا چوکور۔ اس کی جسامت ٹینس کی گیند کے برابر ہوتی ہے یا ٹیبل ٹینس کی گیند کے برابر۔ یہ نہ سمجھئے کہ ہمیں کھیلوں سے خصوصی دلچسپی ہے۔ آج تک ہم نے کوئی کھیل نہیں کھیلا (سوائے انڈور گیمس کے) کھیلوں کو ہم محض اس لئے دیکھتے ہیں کہ اس طرح ہم ٹیلی ویژن پر بری خبریں دیکھنے اور سننے سے بچ جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں ہم حیدر آباد میں تھے تو فٹ بال کے بین الاقوامی مقابلوں کا آغاز ہوا تھا۔ ابتدائی مقابلے چل رہے تھے اور ایسے میں کبھی ہم اپنے دوست حمایت اللہ کے گھر ان سے ملنے کے لئے جاتے تو دیکھتے کہ ان کی نصف بہتر ڈاکٹر رشید موسوی (جو اُردو کی استاد رہ چکی ہیں اور اپنی شاگردوں کے درمیان بیت بازی اور مضمون نویسی وغیرہ کے مقابلہ منعقد کرتی رہی ہیں) ٹیلی ویژن پر فٹ بال کو ایسی دلجمعی، تجسس اور اشتیاق کے ساتھ دیکھنے میں مصروف نظر آئیں جیسے وہ خود بھی کبھی فٹ بال کی کھلاڑی رہ چکی ہوں۔ دوسری طرف حمایت اللہ بھی ایک وفادار شوہر کی طرح ان مقابلوں کو اسی اشتیاق کے ساتھ دیکھنے میں ڈاکٹر رشید موسوی کا ہاتھ بٹاتے نظر آتے۔ ہم نے ان دونوں سے پوچھا تو نہیں کہ فٹ بال میں ان کی دلچسپی کب سے ہے اور کب تک برقرار رہے گی۔ تاہم ہماری سمجھ میں یہ آسان سی بات آگئی کہ ٹیلی ویژن پر یہ جو ہم آئے دن بری خبریں سنتے رہتے ہیں تو ان سے

محفوظ رہنے کو موثر طریقہ یہ ہے کہ ٹیلی ویژن کھول کر فٹ بل کے مقابلے دیکھتے رہو۔ ہمیں اس سے کیا مطلب کہ کونسی ٹیم کھیل رہی ہے، کیسے کھیل رہی ہے اور فٹ بال کے میدان میں عالمی سطح پر اس ٹیم کا کیا مقام ہے۔ کوئی ٹیم جیتے یا کوئی ٹیم ہارے ہمیں اس سے کیا مطلب ہے۔ کھیل جاری رہنا چاہئے۔ یہ جو ٹیلی ویژن پر خبریں پڑھنے والی خواتین اپنی دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ چوبیسوں گھنٹے حادثوں اور فسادات میں مارے جانے والوں کی تعداد سناتی رہتی ہیں، دہشت گردوں کی کارستانیاں دکھاتی رہتی ہیں، تباہی اور بربادی کے مناظر کو عیاں کرتی رہتی ہیں، سیاستدانوں کی دھاندلیوں کا پردہ فاش کرتی رہتی ہیں، مظلوم اور مفلس عوام کی مشکلات کو بھی ایک ادا کے ساتھ ہنستے ہنستے بیان کر دیتی ہیں، انھیں سننے سے بہتر تو یہ ہے کہ سامنے کچھ کھلاڑی ہوں، ایک فٹ بال ہو اور ہزاروں شائقین پاگل ہوئے جا رہے ہوں۔ اس میں جو لطف ہے وہ بری خبریں سننے اور دیکھنے میں کہاں۔ بعد میں دہلی آنے کے بعد ہم نے بھی یہ روش اپنائی ہے کہ صبح سے شام تک فٹ بال کے مقابلے دیکھتے رہتے ہیں۔ مہاراشٹر کے چیف منسٹر ولاس راؤ دیشمکھ جب اپنی سرکار کو بچانے کے لئے اپنے ارکان اسمبلی کو بنگلور اور اندور وغیرہ بھیج رہے تھے اور شیوسینا نے اپنے ارکان کو ایک گیسٹ ہاؤس میں بھیڑوں اور بکریوں کی طرح بند کر رکھا تھا تو ہم ان مناظر کو دیکھ کر اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ کبھی ٹیلی ویژن پر خبریں نہیں دیکھیں۔ اپنے ملک میں جمہوریت کے اس افسوسناک اور دردناک مقابلہ کو دیکھنے سے بہتر ہمیں یہ لگا کہ فٹ بال کے مقابلے دیکھتے رہیں۔ پتہ نہیں بعد میں ولاس راؤ دیشمکھ اپنی سرکار کو بچا پائے یا نہیں۔ اس کا حال ہم فٹ بال کے مقابلوں کے بعد ہی جاننے کی کوشش کریں گے۔ لیکن ایک خیال دل میں یہ آیا کہ اپنے ارکان اسمبلی کو یہاں وہاں محفوظ مقامات پر بھیجنے کی بجائے وہ ان ارکان کو بینکوں کے 'لاکرس' میں کیوں محفوظ نہیں رکھتے۔ بینکوں نے اپنے کھاتہ داروں کے مال ومتاع اور قیمتی اشیاء کو محفوظ رکھنے کے لئے 'لاکروں' کی سہولت پہلے ہی سے فراہم کر رکھی ہے۔ وہاں لیجا کر انھیں بند کر دیں اور رائے دہی کے دن انھیں لاکروں میں سے نکال کر لے آئیں۔ اہل سیاست کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ ابھی پچھلے دنوں چینل بدلتے ہوئے ہم نے ٹیلی ویژن پر سائنسدان ڈاکٹر عبدالکلام کی جھلک بھی دیکھی جنھیں لوگ ہار وغیرہ پہنا رہے تھے۔ انھیں بھارت رتن تو پہلے ہی مل چکا ہے۔ اب شائد کوئی اور انعام ملا ہوگا۔ ہم نے غور سے نہیں دیکھا۔ وہ سائنس کے آدمی ہیں، سائنس کے میدان میں ہی کوئی اور

کارنامہ کر دکھایا ہوگا۔ فٹ بال کے مقابلہ میں تو وہ گول بنانے سے رہے۔ بہر حال اب تیس جون کے بعد ہی معلوم کریں گے کہ ڈاکٹر عبدالکلام نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے یا کارستانی دکھائی ہے؟

اس وقت ہمیں فٹ بال کا وہ مقابلہ یاد آ رہا ہے جو جرمنی اور سعودی عرب کی ٹیموں کے درمیان ہوا تھا۔ سعودی ٹیم نے اس اہتمام سے ہارنے کا مظاہرہ کیا کہ ہارنے کے بارے میں عالمی ریکارڈ کو توڑ دیا ہے۔ ادھر ہماری نظر چُوکی اور اُدھر جرمنی نے ایک اور گول داغ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جرمنی نے کئی گول بنائے اور سعودی ٹیم کی بے نیازی، قلندری، استغنا اور توکل کا یہ عالم تھا کہ جواباً ایک گول بھی نہیں بنایا۔ ہمیں اس ٹیم کا یہ حوصلہ بہت اچھا لگا۔ بھلا سعودی ٹیم کیوں گول بنائے۔ ایک معمولی گولڈ میڈل یا سلور میڈل کے لئے اپنی جان کیوں ہلکان کرے۔ ان کے ملک میں سونے کی کمی تھوڑی ہے۔ تیل اور معدنیات کے بے پناہ ذخائر ہیں۔ مالدار ملکوں کے کھلاڑیوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ایسی چھوٹی چیزوں کے پیچھے بھاگتے رہیں۔ وہ اس مقابلہ میں شامل ہو گئے یہی بہت بڑی بات ہے۔ ایسی ہی باتوں کی وجہ سے تو کھیل کا ماحول بنتا ہے۔ ہارنا بھی کھیل کا ایک لازمی حصہ ہے اور ہارنے کا عالمی ریکارڈ قائم کرنا بھی تو ایک اہم واقعہ ہے۔ دیکھا جائے تو ہارنے سے خود ہم ہندوستانیوں کا بھی بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ کسی زمانہ میں ہاکی کے میدان میں ہماری ٹیم سب سے آگے تھی۔ اب اولمپک کھیلوں میں ہم نے لگاتار ہار کے ذریعہ دوسری ٹیموں کو جیتنے کا موقع عطا کیا ہے۔ یہ ہماری بڑائی اور دریا دلی نہیں تو اور کیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مختلف کھیلوں میں ہمارے ہارنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ان کھیلوں کے مناسب 'کوچ' نہیں ہیں۔ کون کہتا ہے کہ 'کوچ' نہیں ہیں۔ کوچ ضرور ہیں اور وہ فی الحال ہمیں یہ تربیت دے رہے ہیں کہ ہارنے کی صورت میں ہمیں اپنا حوصلہ کس طرح بلند رکھنا چاہئے۔ ہار کو خوش اسلوبی اور خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرنے کے لئے بھی تو 'کوچنگ' کی ضرورت پیش آتی ہے۔ پہلے یہ کوچنگ ہو جائے تو پھر کھیلوں کی 'کوچنگ' کا نمبر آئے گا۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ فٹ بال کے ان مقابلوں کو ہم نہایت کھلے دل کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کیونکہ ان مقابلوں میں ہمارے ملک کی کوئی ٹیم شامل ہی نہیں ہے۔

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

اس لئے ہم نہایت بے لوث اور بے غرض انداز میں ان مقابلوں کا دیدار کر رہے ہیں،

پھران مقابلوں میں ہمیں ہر طرف رنگارنگی اور گہما گہمی ہی نظر آتی ہے۔ چونکہ یہ مقابلے کوریا اور جاپان میں ہو رہے ہیں اس لئے انواع واقسام کے کھلاڑیوں کو دیکھنے کے علاوہ جاپانیوں کے دیدار بھی ہو رہے ہیں جہاں برسوں پہلے ہم نے اپنی زندگی کی کچھ خوشگوار ساعتیں گذاری ہیں۔ ایسے بیتے لمحات اسی طرح یاد آتے رہیں تا کہ ہمیں بھی اپنی اہمیت کا احساس ہوتا رہے۔

کام نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے عشق کے

فٹ بال کے بعض شائقین ہمیں ایسے بھی نظر آئے جنہوں نے مختلف رنگوں کے ذریعہ اپنے چہروں کو رنگین بنا رکھا ہے۔ بعض نے تو اپنے چہرے بالکل فٹ بال کی طرح بنا رکھے ہیں۔ بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ ہم انھیں کک لگائیں۔ لیکن جب وہ خود اپنے آپ کو کک کر رہے ہوں تو ہم کیوں اس تکلف میں پڑیں۔ بعض کھلاڑیوں کے بالوں کو دیکھ کر بھی ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ان کھلاڑیوں نے چار سال پہلے کے عالمی مقابلوں میں شرکت کے بعد سے اپنے بالوں میں کنگھی نہیں کی ہے۔ ایسے ہی دلچسپ مناظر کو دیکھنے میں ہمارا وقت بہت آرام سے کٹ رہا ہے۔

ہم نے سینیگال کی ٹیم کی کامیابیوں کو بھی نہایت حیرت واستعجاب کے ساتھ دیکھا، سینیگال کی ٹیم پہلی بار ان مقابلوں میں حصہ لے رہی ہے۔ اس نے پہلے ہی دن کے مقابلہ میں اپنے پرانے آقا اور سابق عالمی چمپئن فرانس کی ٹیم کو ہرا کر اپنی صدیوں پرانی غلامی کا بدلہ لے لیا۔ ہم اکثر سوچتے ہیں کہ ہمارے کھلاڑی آخر اس طرح کے بدلے کیوں نہیں لیتے۔

بہر حال فٹ بال کے مقابلوں کو دیکھنے میں خوب گذر رہی ہے۔ لیکن ہمیں ابھی سے وحشت ہونے لگی ہے کہ جب تیس جون کے بعد دنیا کے سارے کھلاڑی اپنے اپنے ڈھول تاشے اور فٹ بال اٹھا کر چلے جائیں گے تو ہمارا کیا ہوگا۔ ہم پھر سے خود 'فٹ بال' میں تبدیل ہو کر رہ جائیں گے اور بے عقیدہ سیاستدان، بدعنوان افسر، نام نہاد دانشور وغیرہ ہمیں پھر سے 'کک' لگانے میں مصروف ہو جائیں گے۔ افسوس کہ آپ اس کھیل کو ٹیلی ویژن پر نہیں دیکھ سکیں گے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۲۳ رجون ۲۰۰۲ء)

☆☆

آج کوئی موضوع نہیں ملا

آج ہمیں کوئی موضوع نہیں مل رہا ہے۔ کس پر لکھیں اور کیا لکھیں۔ خیر موضوع مل بھی جاتا تو کیا ہوتا۔ اب تک جن موضوعات پر ہم نے لکھا ہے ان کا کیا نتیجہ برآمد ہوا، جواب برآمد ہوگا۔ ہمیں رہ رہ کر یہ احساس ستا رہا ہے کہ ہمیں لکھنا بالکل نہیں آتا۔ ہماری حالت اس مشہور مغربی ادیب کی سی ہوگئی ہے جس نے چالیس برس تک تصنیف و تالیف کا کام انجام دینے کے بعد لکھا تھا کہ اب مجھے یقین ہو چکا ہے کہ مجھے لکھنا بالکل نہیں آتا لیکن کیا کروں اس عرصہ میں میری شہرت چاروں طرف پھیل چکی ہے۔ لوگ مجھ سے زبردستی لکھواتے ہیں اور میں لکھتا چلا جارہا ہوں اور لوگ تعریف کرتے چلے جارہے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ پچھلے پندرہ دنوں سے دہلی میں ایسی شدید گرمی پڑ رہی ہے کہ آدمی خود اپنے قابو میں نہیں ہے۔ کسی بھی موضوع کے بارے میں سوچتے ہیں تو پسینے چھوٹنے لگتے ہیں۔ پھر جب سے دہلی میں بجلی کی سپلائی کی ذمہ داری خانگی کمپنیوں کو سونپی گئی ہے تب سے بجلی کچھ زیادہ ہی غائب رہنے لگی ہے۔ بجلی آتی ہے تو کوئی موضوع ہمارے ذہن میں ضرور آتا ہے۔ لیکن جیسے ہی اس پر کچھ لکھنے کے لئے بیٹھتے ہیں تو بجلی اچانک غائب ہو جاتی ہے (بڑی سخن فہم بجلی ہے)۔ ہم پچھلے تیس برسوں سے دہلی میں مقیم ہیں۔ یہاں کی سردی اور گرمی دونوں سے بخوبی واقف ہیں لیکن ایسی سڑی ہوئی، تکلیف دہ اور اذیت ناک گرمی کبھی محسوس نہیں کی۔ یہاں ایک محکمہ موسمیات بھی ہے جو خوش آئند پیشین گوئیوں کے ذریعہ جہاں دہلی والوں کے حوصلوں کو بلند

رکھتا ہے وہیں خود اپنے آپ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھتا۔ دہلی میں عموماً ۲۹؍جون کو مانسون آجاتا ہے۔ چنانچہ محکمہ موسمیات نے جون کے تیسرے ہفتہ میں یہ خوش خبری سنائی تھی کہ ہوسکتا ہے اس بار مانسون وقت سے پہلے آجائے۔ ہم نے احتیاطاً اپنا رین کوٹ بکسے میں سے نکال کر رکھ لیا تھا کہ پتہ نہیں کب اس کی ضرورت پیش آجائے۔ جون بھی گزر گیا لیکن برسات نہیں آئی۔ بعد میں محکمہ موسمیات نے بڑی شرمساری کے ساتھ یہ وضاحت کی تھی کہ کسی موسمی دباؤ کی وجہ سے مانسون کے آنے میں ذرا دیر ہو رہی ہے۔ اب یہ ۳؍جولائی تک آجائے گا۔ تاہم محکمہ موسمیات نے یہ نہیں بتایا کہ مانسون بس میں بیٹھ کر آئے گا، ٹرین میں یا ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آئے گا۔ ہمارا خیال تھا کہ مانسون ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آئے گا۔ کیونکہ مانسون کے بادل بھی تو آسمان میں ہی پائے جاتے ہیں۔ وہیں سے پلین میں سوار ہو کر آجائیں۔ (پھر ادھر ہوائی سفر کے کرایوں میں غیر معمولی کمی بھی تو ہوگئی ہے)۔ زمین پر اُتر کر ٹرین یا بس پکڑنا مناسب نہیں ہے۔ لگتا ہے مانسون نہ تو ہوائی جہاز میں سوار ہوا اور نہ ہی بس یا ٹرین میں۔ ہمارے یہاں ٹرینیں ضرور لیٹ ہوتی ہیں لیکن اتنی بھی لیٹ نہیں ہوتیں۔ یقیناً بیل گاڑی میں بیٹھ کر آرہا ہوگا۔ بعد میں محکمہ موسمیات نے اپنی خفت مٹانے کے لئے اعلان کیا کہ مانسون اب اڑتالیس گھنٹوں کے اندر آئے گا۔ اڑتالیس گھنٹے بھی بیت گئے بلکہ اڑتالیس گھنٹوں کی پیشین گوئی کے بعد تو مزید ایک سو بیس گھنٹے بیت چکے ہیں لیکن پھر بھی مانسون ندارد۔ اس کے بعد سے محکمہ موسمیات نے ایک لمبی سی چپ سادھ رکھی ہے۔ نہ کوئی پیشین گوئی کرتا ہے اور نہ ہی اس سلسلہ میں اپنی زبان کھولتا ہے۔ مانسون کو اور دہلی کے باشندوں کو اُن کے حال پر چھوڑ رکھا ہے کہ میاں اب ہمارے بھروسے نہ رہو بلکہ جب بھی مانسون آئے تو ہمیں بھی اطلاع کر دینا۔ آپ کا بھلا ہوگا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سارے ملک میں بارش ہو رہی ہے سوائے دہلی کے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دہلی ہندوستان کی راجدھانی ہے اور یہ ایک ایسا ظالم شہر بن گیا ہے کہ جس پر قدرت بھی مہربان نہیں رہی۔ ہمیں پتہ نہیں کہ سب سے پہلے کس حکمران نے دہلی کو راجدھانی بنایا تھا۔ یہ بھی سنا ہے کہ دہلی سات بار اُجڑی اور سات بار اسے پھر سے بسایا گیا۔ اس کو اجاڑنے والے اور اسے پھر سے بسانے والے آج اگر زندہ ہوتے تو ہم اجاڑنے والوں کو انعام و اکرام سے نوازتے اور اسے پھر سے بسانے والوں کو سخت ترین سزائیں دیتے۔ بھلا یہ بھی کوئی شہر ہے رہنے کا۔ گرمی ہوتی ہے تو آدمی کو سر تا پا پسینہ میں نہلا

دیتی ہے اور سردی ایسی کہ پورے بتیس دانتوں کو بجوا دیتی ہے بلکہ اگر کسی کے منہ میں مصنوعی دانت ہوں تو وہ اتنا بجتے ہیں کہ بسا اوقات منہ سے باہر نکل آتے ہیں۔ لوگ محمد بن تغلق کے بارے میں چاہے کچھ بھی کہیں وہ اس معاملہ میں بے حد سمجھدار تھا کہ اپنے پایہ تخت کو دہلی سے اُٹھا کر دولت آباد لے گیا تھا لیکن بعد میں پھر کسی نے اس پایہ تخت کو دولت آباد سے اُٹھا کر دہلی میں رکھ دیا۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ اگر دہلی ہندوستان کی راجدھانی نہ ہوتی تو آج ہندوستان کی تاریخ ہی مختلف ہوتی۔ یہاں کے شدید موسم میں بیٹھ کر جو بھی حکمران فیصلہ کرے گا اس کے غلط ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا۔ موسم کا اثر نہ صرف آدمی کے مزاج پر بلکہ اس کے دل و دماغ پر بھی پڑتا ہے۔ آپ اسے موسم کا اثر نہیں تو اور کیا کہیں گے کہ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی گجرات میں جا کر جو بیان دیتے ہیں اسی بیان کی تردید گوا میں جا کر کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے متضاد بیانات دینے کی ضرورت عموماً موسم کی تبدیلی کی وجہ سے ہی پیش آتی ہے۔ اگر دہلی کا موسم خوشگوار اور معتدل ہوتا تو ہمارے حکمران ایسے اوٹ پٹانگ فیصلے نہ کرتے اور نہ ہی ایسے اول جلول بیانات دیتے۔ وزیر اعظم نے گوا میں جو بیان دیا تھا وہ ان کا اپنا تھوڑی تھا وہ تو موسمی حالات کے زیر اثر دیا گیا بیان تھا۔

ابھی پرسوں کی بات ہے کہ سابق وزیر مواصلات سکھ رام کو جب دہلی کے پٹیالہ ہاؤس کی ایک عدالت میں تین سال قید با مشقت کی سزاء سنائی گئی اور اُن پر دو لاکھ روپئے جرمانہ عائد کیا گیا تو اس فیصلہ کو سن کر ان کے چہرے پر شرم اور ندامت کے کوئی آثار نہیں دکھائی دیئے بلکہ ہمیں تو یوں لگا جیسے وہ اس فیصلہ سے بہت خوش ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے کہا ''یار! ذرا ان کی ڈھٹائی تو دیکھو کہ تین سال کی قید با مشقت کی سزاء کو یوں قبول کر رہے ہیں جیسے انہیں کوئی بڑا اعزاز عطا کیا گیا ہو۔'' ہم نے کہا ''تم یہ تبصرہ گھر میں نہایت آرام سے بیٹھ کر ٹیلی ویژن پر سکھ رام کو دیکھ کر کر رہے ہو۔ ذرا باہر نکل کر دیکھو کیسی شدید گرمی پ ہی ہے۔ ایسی جان لیوا گرمی میں آدمی اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتا۔ سکھ رام کو یہ احساس ہی نہیں ہے کہ ان کے اطراف کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو جیسے تیسے اس گرمی کو برداشت کر رہے ہیں۔ ایسے موسم میں اگر کوئی ہمیں پھانسی کی سزاء بھی دیدے تو بلا شبہ ہم بے حد خوش ہوں گے کیونکہ ایسی سڑی ہوئی گرمی کو برداشت کرنے سے بہتر تو یہ ہے کہ آدمی ہنستے ہنستے سولی کے تختہ پر چڑھ جائے۔ ویسے دیکھا جائے تو سکھ رام کے لئے تین سال قید با مشقت کی سزاء اور دو لاکھ روپئے جرمانے کی سزاء ایک خوش خبری کی حیثیت رکھتی

ہے۔سکھ رام اب عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں وہ کوئی مشقت طلب کام انجام نہیں دے سکتے۔جھاڑو وہ لگا نہیں سکتے،لکڑیاں وہ پھوڑ نہیں سکتے،زمین پر پھاوڑا اور کدال چلا نہیں سکتے۔ گویا یہ سزاء یوں بھی بے معنی اور بے مطلب سی ہے۔رہی دو لاکھ روپئے جرمانے کی بات تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ سکھ رام جی کے گھر سے تین کروڑ روپیوں کی مالیت کے کرنسی نوٹ برآمد ہوئے تھے۔اس اعتبار سے دو لاکھ روپئے جرمانے کی رقم تو بہت معمولی ہے۔یوں کہیئے کہ وہ تو بہت سستے میں چھوٹ گئے۔کیا عجب کہ وہ اس سزاء کو سن کر خوش ہو رہے ہوں اور ہم اسے شدید گرمی کا ردعمل سمجھ رہے ہوں۔ ہمارے سیاستدانوں کا حال بھی موسم کی طرح ہوتا ہے۔جس طرح موسم بدلتا ہے اسی طرح یہ بھی اپنے رنگ ڈھنگ بدلتے رہتے ہیں۔یہی دیکھئے کہ جب سکھ رام کے ٹیلی کام اسکام کا انکشاف ہوا تھا تو بھارتیہ جنتا پارٹی نے اس وقت احتجاجاً پارلیمنٹ کے اجلاس کو پندرہ دنوں تک چلنے نہیں دیا تھا۔آپ اسے اتفاق نہ سمجھیں کہ سکھ رام اب بھارتیہ جنتا پارٹی کے حلیف ہیں۔جس طرح موسم بدلتا ہے سکھ رام بھی بدل گئے اور بھارتیہ جنتا پارٹی بھی بدل گئی۔بھئی جب موسم بدلتا ہے تو ہمارے سیاسی قائدین اور ہماری سیاسی پارٹیاں کیوں نہ بدلیں۔

آج ہمیں کوئی موضوع نہیں ملا تو ہم دہلی پر برس پڑے اور خواہ مخواہ سکھ رام کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ہمارے کہنے سے یا ہمارے لکھنے سے نہ تو موسم بدلتا ہے اور نہ ہی سیاستدانوں پر اس کا کوئی اثر ہوتا ہے۔ایسی باتوں پر کیوں ہم اپنا اور آپ کا وقت برباد کریں۔آج تک آپ نے کسی بدعنوان سیاستدان کو سزاء کاٹتے ہوئے دیکھا ہے؟نہیں دیکھا تو پھر خاموش ہو جائیے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۴؍جولائی ۲۰۰۲ء)

کیا نیا سال آگیا؟

ہر سال ہم نئے سال کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے ہیں کیونکہ نیا سال ہر سال جو آجاتا ہے۔ تاہم اس بار ہمارا نیا سال کچھ اس طرح آیا کہ اس کی آمد کے ابتدائی چھ گھنٹے تو ہم نے حیدرآباد میں گذارے اور اس کے بعد دہلی کے لئے روانہ ہوگئے۔ گویا اس نئے سال میں ہم ادھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ جب نیا سال آیا تو ہم اتفاق سے حیدرآباد کے پرانے شہر میں تھے۔ رات کے بارہ بجے حسب معمول نیا سال آیا تو ہم نے اس ارادے سے سونے کا قصد کیا کہ پتہ نہیں نئے سال میں پھر سونے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ لیکن جیسے ہی بستر کی طرف بڑھے دبیر پورہ، یاقوت پورہ اور چنچل گوڑہ کے محلوں سے زوردار پٹاخوں کی آوازیں آنے لگیں، اس بات سے ہم حیران رہ گئے کہ ماشاء اللہ اب تو حیدرآباد کے پرانے شہر میں بھی نیا سال آنے لگا ہے۔ برسوں پرانی بات ہے کہ حیدرآباد میں نئے سال کا جشن منانے کی غرض سے ہمیں نہ صرف نئے شہر کی طرف بلکہ سکندرآباد تک جانا پڑتا تھا۔ اب جب کہ ہم نئے سال کا جشن منانے کے قابل اور قائل نہیں رہ گئے تو یہ وبا اب خود سے چل کر پرانے شہر میں بھی آنے لگی ہے۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ چندرا بابو نائیڈو کے دور میں حیدرآباد سچ مچ ترقی کرنے لگا ہے۔ افسوس کہ جب ہم نوجوان تھے تو چندرا بابو نائیڈو پیدا ابھی نہیں ہوئے تھے۔ اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔

بہر حال نئے سال میں دہلی واپس آنے کے چار دن بعد کی بات ہے کہ ہم حسب معمول چہل قدمی کے لئے نکلے تو ہمارے پڑوسی کے دادا جان، جو اب ماشاء اللہ نوّے برس کے ہو چکے ہیں، ایک پارک میں بنچ پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے۔ موصوف ایک زمانہ میں حکومت ہند

کے بہت بڑے افسر رہ چکے ہیں۔ ابھی چار پانچ برس پہلے تک بہت مزے مزے کے قصے سنایا کرتے تھے لیکن کچھ عرصہ سے ان کی یادداشت کمزور ہونے لگی ہے اور وہ کبھی کبھی بہکی بہکی باتیں بھی کر جاتے ہیں۔ (یہ اور بات ہے کہ ان کی یہ بہکی بہکی باتیں نہایت سچی لگتی ہیں)۔ وہ ہمیں بے حد عزیز رکھتے ہیں اور ہمارے دل میں ان کے لئے بڑا احترام بھی ہے۔ کئی دنوں بعد وہ ہمیں نظر آگئے تو ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ ہم نے قریب جا کر انھیں سلام کیا تو ان کے کمزور ہاتھوں میں جتنی بھی توانائی بچ رہی تھی اسے بروئے کار لاتے ہوئے ہمارے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔ ہم نے انھیں نئے سال کی مبارکباد دی تو حیرت سے پوچھا ''کیا نیا سال پھر آ گیا ہے؟''۔ ہم نے کہا ''اسے تو آئے ہوئے چار پانچ دن بیت چکے ہیں، کیا آپ کو اب تک خبر نہ ہوئی''۔

بولے ''مجھے لگتا ہے ابھی دو چار مہینے پہلے بھی ایک نیا سال آیا تھا۔ وہ کہاں گیا؟۔ کیا دو تین مہینوں میں ہی ختم ہو گیا؟''

ہم نے کہا ''حضور! نیا سال آتا ہے تو پورے تین سو پینسٹھ دن گذار کر ہی جاتا ہے۔ دو تین مہینوں میں کیسے چلا جائے گا''۔

بولے ''آج کی دنیا میں حساب کے اتنے گھپلے ہو رہے ہیں کہ کسی بات کا کوئی بھروسہ نہیں رہا۔ کیا ضروری ہے کہ سال کے تین سو پینسٹھ دن ہی ہوں۔ ساٹھ دن بھی ہو سکتے ہیں۔ نیا سال آتا ہی اس لئے ہے کہ ہم جیسوں کو اپنے ساتھ لے جائے۔ نئے سال کے دن جتنے کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ پورے تین سو پینسٹھ دنوں تک میں اس بنچ پر بیٹھا نئے سال کے آنے اور اس کے ساتھ خود چلے جانے کا انتظار کرتا رہوں''۔

ہم ان کی باتیں سن کر ہنسنے لگے تو پوچھا ''تم سے ملاقات ہوئی نئے سال کی؟۔ دیکھنے میں کیسا ہے؟۔ تمہارے گھر آیا تھا کیا؟''

ہم نے کہا ''ہم خود سفر میں تھے۔ ہم سے تو ملاقات نہیں ہوئی، یہاں آنے کے بعد پتہ چلا کہ نیا سال آ چکا ہے''۔

پوچھا ''کونسا ہے یہ نیا سال؟''

ہم نے کہا ''۲۰۰۳ء کا ہے''

حیرت سے پوچھا ''کیا بیسویں صدی بھی گذر گئی؟''

ہم نے کہا ''اسے گذرے ہوئے تو پورے دو برس بیت گئے۔ اب آپ کو پتہ چل رہا ہے''

بولے" پتہ بھی ہوتا تو میں کیا کر لیتا۔ پچھلے پانچ چھ برسوں سے میں نے وقت کا حساب رکھنا چھوڑ دیا ہے اور برسوں اور صدیوں کے پیمانوں سے بے نیاز ہو چکا ہوں"۔

ان بزرگ سے بات چیت کے بعد ہم نے خود اپنا جائزہ لیا تو احساس ہوا کہ وقت کے تعلق سے اب ہمارا رویہ بھی کم وبیش ایسا ہی ہوتا جارہا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہم نئے سال کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا کرتے تھے اور پھر پورا نیا سال بھی اسی دھوم دھام سے ہماری زندگی میں سے اور ہم نئے سال میں سے گذرتے رہتے تھے۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وقت کیسے گذر جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایک ہی دن بلکہ ایک ہی لمحے میں پوری ایک صدی کی زندگی جی لیتے تھے۔ یوں بھی ان دنوں صرف نئے سال کے پہلے دن ہی نئے سال کی آمد کی دھوم دھام دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بعد نیا سال ایسی بے دلی اور بے کیفی کے ساتھ گذرتا ہے کہ لگتا ہے آپ وقت کو نہیں گذار رہے ہیں بلکہ کوئی سزا کاٹ رہے ہوں۔ تیس چالیس برس پہلے جب ہم نیا سال مناتے تھے تو ہماری جھولی میں نہ صرف پچھلی صدیوں کا اثاثہ ہوتا تھا بلکہ آنے والی کئی صدیوں کی آرزوئیں، تمنائیں اور خواہشیں بھی موجود ہوتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم بیتے ہوئے وقت کا تسلسل اور آنے والے وقت کے نقیب ہیں۔ ہماری زندگی اور ہمارا وقت بھی تیز رفتار تھا۔ نوجوانی میں ہمارا وقت پہاڑی نالے کی طرح بہتا تھا۔ شور مچاتا ہوا، اُچھلتا ہوا، بل کھاتا ہوا، آبشار کی صورت میں گرتا ہوا۔ پھر جوں جوں ہماری عمر پختہ ہوتی چلی گئی ہم کُھلے میدان میں بہنے والے دریا کی شکل اختیار کر گئے جس میں روانی تو تھی لیکن گہرائی بھی تھی۔ تاہم اب جب کہ کچھ ہی عرصہ بعد ہم وقت کے سمندر میں مل کر معدوم ہو جانے کی تیاری کر رہے ہیں تو ہمارا حال اُس دریا کا سا ہو گیا ہے جو اپنے ڈیلٹا میں پہنچ گیا ہے۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہم بہہ بھی رہے ہیں یا جامد و ساکت ہیں۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم کس سمت میں بہہ رہے ہیں۔ یہ بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ ہم بدستور دریا ہیں یا سمندر میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

سچ بات تو یہ ہے کہ اکیسویں صدی تک آتے آتے وقت نے اپنی ساری ندرت، ساری افادیت اور اپنی ساری تجسس آفرینی کھو دی ہے۔ وقت پہلے خود سے گذرتا تھا اب اسے گذارنا پڑتا ہے۔ پہلے وقت کوئی نہ کوئی خوش خبری ضرور لاتا تھا۔ اب خوش خبریاں آنی بند ہو گئی ہیں۔ اگر آپ پندرہ دن پرانا اخبار بھی پڑھیں تو یوں لگتا ہے جیسے آپ آج کا اخبار پڑھ رہے ہیں۔ وہی فسادات، وہی ہنگامے، وہی مار دھاڑ، سیاستدانوں کی وہی بدعنوانیاں اور کارستانیاں، حادثے،

زنا، اغوا اور ڈکیتی کے ویسے ہی واقعات۔ بری خبروں میں بھی اتنی یکسانیت پیدا ہوگئی ہے کہ اگر کسی روز پچاس ساٹھ آدمی یونہی بلاوجہ نہیں مرجاتے تو لگتا ہے کہ یہ دن تو بس یونہی ضائع ہوگیا۔ اخباروں میں بری خبروں کی اتنی بہتات ہوتی ہے کہ اخبار کھولتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے آپ سانپ کے بل میں ہاتھ ڈال رہے ہوں۔

اُردو کے ممتاز ادیب اور شاعر مظہر امام دہلی میں ہمارے پڑوسی ہیں۔ پچھلے سال گودھرا کے واقعہ کے بعد اخباروں میں فسادات کی جو بھیانک خبریں آئے دن شائع ہونے لگیں تو کچھ دن تک تو وہ انھیں پڑھتے رہے۔ اس کے بعد ان پر مایوسی، اداسی اور قنوطیت کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ پہلے تو انھوں نے اپنے ہاں آنے والے اُردو اور انگریزی کے اخبارات بند کروادئے۔ پھر اپنی اہلیہ سے کہا کہ وہ ٹیلی ویژن کو بھی اٹھا کر کہیں رکھ دیں۔ ایک دن کہنے لگے "ایسی بھیانک خبریں جاننے کے بعد زندگی پر سے میرا اعتماد متزلزل ہوتا جارہا ہے۔ اب میں یہ خبریں پڑھتا یا سنتا ہی نہیں تو بڑے اطمینان سے ہوں۔ یوں بھی دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے وہ میری مرضی اور اجازت کے بغیر ہورہا ہے۔ پھر میں کیوں ایسی وحشتناک خبروں کے ذریعہ اپنے آپ کو ہلکان کروں۔ زندگی میں اب دن ہی کتنے باقی رہ گئے ہیں۔ روز کی زندگی روز جیتا ہوں۔ ایسی وحشتناک خبریں پڑھنے کے بجائے کیوں نہ میں میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، شکسپیرؔ، ورڈسورتھؔ، کیٹسؔ، بائرنؔ وغیرہ کی کتابیں پڑھوں تاکہ اپنے زندہ رہنے کا خود اپنے آپ کو احساس دلاسکوں"۔ ہمیں جب پتہ چلا کہ انھوں نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا یہ طریقہ ایجاد کرلیا ہے تو روزانہ انھیں فون کرکے دنیا بھر کی بری خبریں خوشی خوشی سنانے لگے۔ ایک دن بولے "جناب اگر آپ نے اسی طرح مجھے فون پر بری خبریں سنانے کا سلسلہ جاری رکھا تو مجھے ایک دن اپنے فون کا کنکشن کٹوانا پڑے گا"۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ اس کے بعد ہمیں تین چار ہفتوں کے لئے حیدرآباد جانا پڑگیا۔ واپس آکر ہم نے انھیں فون کیا تو خود مظہر امام نے فون اُٹھایا۔ دوسری طرف سے جب وہ "ہیلو ہیلو" کہنے لگے تو نہ جانے کیوں ہمیں چپ سی لگ گئی۔ ہم نے سوچا کہ شاید انھیں نئے سال کی آمد کا علم نہ ہو اور شاید یہ بھی نہ معلوم ہو کہ گجرات میں نریندر مودی کی سرکار بن گئی ہے۔ ہم نے ان کے سکون کی خاطر چپ چاپ فون کا ریسیور رکھ دیا"۔

روزنامہ "سیاست" (۱۲رجنوری ۲۰۰۳ء)

☆☆

چار مینار۔ دوراہے پر

پچھلے ہفتہ ایک ہی دن میں ہمیں چار مینار کے بارے میں دو متضاد اطلاعات ملیں۔ پہلی اطلاع تو 'ٹائمس آف انڈیا' کے ذریعہ یہ ملی کہ حیدر آباد کی اس تاریخی عمارت کو ٹریفک کے مضر اثرات سے بچانے کے لیے اس کے اطراف جو حصار حال ہی میں باندھا گیا ہے غالباً اس کی تعمیر کے نتیجہ میں اس عمارت میں دراڑیں پیدا ہوگئی ہیں اور یہ کہ اس تاریخی عمارت کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ نامہ نگار نے اس تشویش کا اظہار بھی کیا ہے کہ اگر چار مینار کی بروقت مرمت نہ کی گئی تو یہ عمارت، جس سے حیدر آباد آج ساری دنیا میں پہچانا جاتا ہے، برباد ہو جائے گی۔ اس اطلاع کو پڑھ کر ہمیں دہلی کی ایک پرانی تقریب کی یاد آگئی جس میں ہمارے بے حد مخلص اور عزیز ترین دوست شرددت نے جو غلو کرنے میں بھی خاصا غلو کر جاتے ہیں ہمارا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ حیدر آباد کی دو چیزیں بہت مشہور ہیں۔ ایک چار مینار اور دوسرے مجتبیٰ حسین۔ ہم تو خیر اس تعارف پر ہنس کر خاموش ہوگئے تھے کیونکہ ایسی باتیں ہنسنے کے لئے ہی ہوتی ہیں۔ تاہم اب جب کہ ہماری موجودہ حالت خود چار مینار کی سی بلکہ چار مینار سے بھی ابتر ہوتی جارہی ہے تو اس اطلاع کو پڑھ کر ایک لمحہ کے لئے خود ہماری تشویش میں بھی اس خیال سے اضافہ ہوگیا کہ اگر خدانخواستہ چار مینار کو کچھ ہوگیا تو حیدر آباد کی پہچان بننے کی ذمہ داری کہیں اکیلے ہم پر عائد نہ ہو جائے اور اب جب کہ خود ہماری حالت دگرگوں ہوتی جارہی ہے تو ایسے میں ہم اس بھاری ذمہ داری کے بوجھ کو کیسے سنبھالیں۔ لہٰذا حیدر آبادیوں سے بلا تکلف یہ کہنے کو جی چاہ رہا ہے کہ وہ اس

معاملہ میں ہمارے بھروسے بالکل نہ رہیں اور چار مینار کی حفاظت کریں۔ آدمی بھی کیسی مضحکہ خیز خوش فہمیوں میں مبتلا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دن بھر چار مینار کی عمارت آنکھوں میں گھومتی رہی۔ تاہم شام کو ہم نے ٹیلی ویژن کھولا تو یہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا کہ حکومت آندھرا پردیش نے شام کے وقت چار مینار کو روشن اور منور کرنے کی غرض سے لاکھوں روپیوں کی کثیر رقم خرچ کر کے روشنی کا خصوصی بندوبست کیا ہے۔ یہ روشنی اتنی تیز ہوگی کہ چار مینار کے سارے گوشے منور ہو جائیں گے اور اس کی خوبصورتی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ دیکھنے والے پر عیاں ہو جائے گی۔ (ہمارا یہ مشورہ ہے کہ یہ روشنی اتنی تیز بھی نہ رکھی جائے کہ چار مینار کی عمارت میں پڑی ہوئی دراڑیں سیاحوں کو نظر آ جائیں۔ اس لئے کہ چار مینار میں پڑی ہوئی دراڑیں بھلے ہی چار مینار کی طبع نازک پر گراں نہ گزریں لیکن دیکھنے والوں کی طبع نازک پر تو گراں گزر سکتی ہیں۔ ہمیں عمارت سے کہیں زیادہ سیاحوں کی فکر کرنی چاہئے۔)

ان دو اطلاعات کے پس منظر میں چار مینار کا خیال آیا تو بس آتا ہی چلا گیا۔ ماشاء اللہ اس عمارت پر سے اب تک چار صدیاں اور کچھ برس بیت چکے ہیں اور ہم نے لگ بھگ ساٹھ برس پہلے اس عمارت کو اُس وقت دیکھا تھا جب ہم خود سات آٹھ برس کے تھے اور اپنے ایک بھائی کے ساتھ حیدرآباد کی سیاحت کرنے کی غرض سے پہلی بار گلبرگہ سے حیدرآباد آئے تھے۔ اگر چہ اس پر شکوہ عمارت کو دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے تھے۔ تاہم ہمارے بچکانہ ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوا تھا کہ اس عالیشان عمارت میں کون رہتا ہوگا اور اگر رہتا ہوگا تو اپنا سامان کہاں رکھتا ہوگا اور اگر سامان رکھتا ہے تو اس سامان کی حفاظت کون کرتا ہوگا کیونکہ چار مینار میں ہمیں کہیں ایسا کوئی دروازہ وغیرہ نظر نہیں آیا تھا جسے باہر جاتے وقت بند کیا جا سکے تاکہ اس کا سامان اس عمارت میں محفوظ رہ سکے۔ ہم نے اس خصوص میں جب اپنے بھائی سے کئی بچکانہ سوالات پوچھنے شروع کئے تو ہر سوال کے جواب میں انہوں نے ہمیں ایک ٹافی دے کر خاموش کرا دیا۔ تاہم ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے اس پہلے سوال پر کہ اس عمارت میں کون رہتا ہے، انہوں نے ٹافی دیئے بغیر ہم سے کہا تھا "اس عمارت میں حیدرآباد رہتا ہے۔" اس پر ہم نے پوچھا تھا "حیدرآباد اس عمارت میں کرایہ سے رہتا ہے یا یہ عمارت اس کی ذاتی ملکیت ہے اور اگر یہ عمارت اس کی ذاتی ملکیت ہے تو اس کا دیوان خانہ کہاں ہے، خوابگاہ اور غسل خانہ کہاں ہے۔ ہمیں تو یہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ بیچارا حیدرآباد بڑی

مشکل سے یہاں رہتا ہوگا''۔اس سوال پر انہوں نے ہمیں زوردار ڈانٹ پلائی تھی۔اس زمانہ کی حیدرآبادی تہذیب میں اس طرح کی ڈانٹ کے دو ہی مطلب ہوا کرتے تھے۔پہلا مطلب تو کہ بچے بڑوں سے ایسے بیہودہ سوالات نہ پوچھیں اور دوسرا مطلب یہ کہ جس سے یہ سوال پوچھا جارہا ہے وہ خود بھی اس کا جواب نہیں جانتا۔

کچھ برس بعد جب ہم حیدرآباد میں رہنے لگے تو یہ عمارت ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ بن گئی۔یہ اور بات ہے کہ حیدرآباد میں ایک لمبا عرصہ گزارنے کے باوجود ہم کبھی چارمینار کے اوپر نہیں چڑھے۔البتہ 1980ء میں ٹوکیو یونیورسٹی میں ہماری ملاقات ایم اے (اُردو) کی طالبہ شاشورے سے ہوئی تھی جو کچھ عرصہ پہلے ہی حیدرآباد کی سیاحت سے فارغ ہوکر ٹوکیو لوٹی تھیں۔ انہیں جب یہ پتہ چلا کہ ہمارا تعلق حیدرآباد سے ہے تو انہوں نے چارمینار کی تعریف کرنے کے بعد ہم سے خواہش کی تھی کہ اگر کبھی ہمارا حیدرآباد جانا ہو تو ہم چارمینار کے لاڑ بازار کی سمت والے مینار پر اُردو رسم الخط میں ان کا نام ضرور تلاش کریں کیونکہ انہوں نے وہاں اپنا نام لکھ رکھا تھا۔عرض کیا کہ آپ کو وہاں اپنا نام لکھنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوگئی تو موصوفہ نے فرمایا''میں جب اوپر گئی تو دیکھا کہ کچھ اور سیّاح پہلے ہی سے اس مینار پر اپنے نام اور پتے وغیرہ لکھنے میں مصروف تھے۔ میں نے سوچا کہ شاید ہندوستان میں تاریخی عمارتوں کو 'تصنیف و تالیف' کے کام کے لئے استعمال کرنے کی روایت موجود ہے۔لہذا میں نے بھی اپنا نام وہاں لکھ دیا تھا۔''اس وقت تو ہم ہنس کر خاموش ہوگئے لیکن ٹوکیو سے واپسی کے بعد جب ہمیں حیدرآباد جانے کا موقع ملا تو ہم نے اپنے ایک دوست کو اس مہم پر چارمینار کی چھت پر روانہ کیا تھا کہ وہ وہاں اس نام کو تلاش کرآئیں۔مگر جب ہمارے یہ دوست خالی ہاتھ چارمینار کے اوپر سے ہانپتے ہانپتے نیچے آئے تو ہم پر بہت برہم تھے۔کہنے لگے''میاں ایک خاتون کی فرمائش پر فرہاد تیشہ بدست پہاڑ پر چڑھ گیا تھا کہ پہاڑ کو کاٹ کر دودھ کی نہر لے آئے گا۔تم سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ خود چارمینار پر چڑھ جاتے اور اپنی دوست کا نام وہاں تلاش کرلیتے۔میری ٹانگیں الگ سے تڑوائیں اور گوہر مقصود بھی ہاتھ نہ آیا۔'' بعد میں ہم نے ایک ذمہ دار دوست کی طرح شاشورے کو یہ اطلاع دیدی تھی کہ چارمینار پر ان کا تصنیف کردہ نام موجود نہیں ہے۔اتفاق سے چار پانچ برس بعد وہ خود حیدرآباد آئیں تو چارمینار کے اوپر جانے کے لئے اصرار کرنے لگیں۔مگر افسوس کہ اس وقت تک چارمینار کے اوپر جانے پر

پابندی عائد کردی گئی تھی۔ پتہ چلا کہ کچھ عاقبت نااندیش لوگوں نے اس عمارت پر سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کا آسان اور سستا طریقہ ایجاد کرلیا ہے بلکہ ایک خبر تو ایسی بھی پڑھنے کو ملی تھی کہ خودکشی کرنے کے خواہشمند ایک شخص نے پوری صدق دلی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے اوپر چلے جانے کے ارادہ سے اس عمارت پر سے چھلانگ تو لگائی تھی لیکن جب وہ نیچے آیا تو وہاں سے گزرنے والے ایک معصوم سائیکل ران پر جا گرا۔ نتیجہ میں سائیکل سوار تو مرگیا اور خودکشی کرنے کا بدقسمت خواہشمند بچ گیا۔ تب ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ عمارت تو بالکل ہی بے مصرف، نکمّی اور ناکارہ ہے کیونکہ اس میں رہنا اور بسنا تو بہت دور کی بات ہے اس پر سے تو آدمی چھلانگ لگا کر ڈھنگ سے مر بھی نہیں سکتا۔ تب ماننا پڑا کہ یہ عمارت تو صرف ایک علامت ہے۔ جیسے ادب برائے ادب اور آرٹ برائے آرٹ ہوتا ہے اسی طرح یہ عمارت بھی 'عمارت برائے عمارت' ہے اور اس کے سوائے کچھ بھی نہیں۔ ایک عرصہ تک ہم اس عمارت کو ٹریفک کے راستہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہی سمجھتے رہے کیونکہ چوراہے کے عین بیچوں بیچ اتنی بڑی عمارت کو کھڑا کردینے کا اور کیا مقصد ہوسکتا ہے۔ یاد ش بخیر! ایک زمانہ میں 'چار مینار کی گپ' کا بھی بڑا شہرہ تھا۔ یہ اُس زمانہ کی بات ہے جب ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی نشریات کو دور دور تک پہنچانے کے لئے اینٹینا (Antenna) ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ تب حیدرآباد کے گپ باز، یعنی اس زمانہ کے میڈیا والے، اس عمارت کے میناروں کو بطور اینٹینا استعمال کرکے کسی بھی گپ یا افواہ کو سارے شہر میں پھیلا دیتے تھے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بسا اوقات بعد میں یہ افواہیں سچ بھی ثابت ہوجاتی تھیں۔ گویا یہ گپ باز آج کے میڈیا والوں کے مقابلہ میں زیادہ قابل بھروسہ ہوا کرتے تھے۔

مانا کہ یہ عمارت بے مصرف ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ عمارت حیدرآباد کی واحد پہچان اور علامت ہے۔ یہ عمارت اس وقت سے موجود ہے جب یہ شہر آباد ہوا تھا۔ اس عمارت نے قطب شاہوں کا دور دیکھا، مغلوں کے اقتدار اور آصف جاہوں کا عہد دیکھا۔ انگریزوں کے اقتدار کو جھیلا اور اب جمہوریت کے تماشے دیکھ رہی ہے۔ اس نے حیدرآبادی تہذیب کے عروج کا زمانہ دیکھا اور اب اس کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی عینی شاہد ہے۔ قلی قطب شاہ نے جب چار مینار کو تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تو اس وقت ملک میں 'قطب مینار' پہلے ہی سے موجود تھا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مینار قطب الدین ایبک سے منسوب تھا۔ قلی قطب شاہ چاہتا تو چار مینار کے چاروں

میناروں کو ملا کر 'قطب مینار' سے کہیں زیادہ اونچا مینار بنوا سکتا تھا لیکن اس نے بہت سوچ سمجھ کر چار سمتوں کو ذہن میں رکھ کر چار یکساں قد وقامت والے میناروں کو اس عمارت سے جوڑ دیا تھا کہ میاں منیارو! جب تک رہو امن اور شانتی کے ساتھ مل جل کر رہو، خوش رہو اور اس عمارت سے جڑے رہو۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس شہر کے موجودہ لوگ قلی قطب شاہ کے اس پیغام پر کتنا عمل کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے کبھی ان میناروں میں اختلاف رائے پیدا ہوتے نہیں دیکھا۔ کبھی کسی مینار نے دوسرے مینار کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ ہی اسے نیچا کر دکھانے کی کوشش کی۔ کتنے ہی حیدر آبادی اس شہر کو چھوڑ کر دنیا بھر کے کئی ملکوں میں جا بسے لیکن یہ مینار بدستور اس عمارت سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس عمارت کی تعمیر میں ایک ایسا اٹوٹ اتحاد پوشیدہ ہے جو کسی معاشرہ میں دکھائی نہیں دیتا۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ اس عمارت کے چاروں طرف جو گھڑیاں لگائی گئی ہیں ان میں ایک زمانہ میں ہمیں کبھی 'اتفاق رائے' نظر نہیں آیا۔ ہر گھڑی کا وقت دوسری گھڑی کے وقت سے مختلف ہوا کرتا تھا۔ ہمارا یہ مشاہدہ بھی اُن دنوں کا ہے جب ہم حیدر آباد میں رہا کرتے تھے اور دستی گھڑی خریدنے کی خود میں سکت نہیں رکھتے تھے۔ اب کا حال ہم نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ یوں بھی یہ ایک غیر ضروری بحث ہے کیونکہ محمد قلی قطب شاہ نے جب یہ عمارت تعمیر کی تھی تو اس وقت اس عمارت میں گھڑیاں تھیں ہی نہیں۔ بعد کے 'ابن الوقتوں' نے اس عمارت میں ان گھڑیوں کا اضافہ کر دیا۔

روزنامہ ''سیاست'' (۹ر فروری ۲۰۰۳ء)

ذِکرِ چند کرم فرماؤں کا

جس دن ہم یہ کالم لکھتے ہیں اُس دن صبح کی چہل قدمی کے دوران (جواب واقعی چالیس قدموں سے آگے نہیں بڑھ پاتی) اس موضوع کے بارے میں ضرور سوچ لیتے ہیں جس پر ہمیں کالم لکھنا ہوتا ہے۔ ہم برسوں سے چہل قدمی کرنے کے عادی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اب ہم اُس طرح چہل قدمی نہیں کر سکتے جیسا کہ پہلے کیا کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی پرانی عادت سے مجبور صبح صبح چہل قدمی کے عنوان کا سہارا لے کر گھر سے باہر نکل جاتے ہیں کیوں کہ عادت (چاہے اچھی ہو یا بری) بڑی بری چیز ہوتی ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں جن کے دائیں پاؤں کے ٹخنے پر ایک داد ہوا کرتا تھا اور اس داد میں چونکہ ہمیشہ کھجلی کی کیفیت رہا کرتی تھی اسی لئے وہ بار بار اسے کھجاتے رہتے تھے۔ بدقسمتی سے وہ ایک حادثہ سے دوچار ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں ان کے دائیں پاؤں کے ٹخنے کو کاٹنا پڑ گیا اور اس کی جگہ لکڑی کی ٹانگ لگادی گئی۔ گویا ٹانگ کا وہ حصہ جس پر داد ہوا کرتا تھا وہ کاٹ دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد جب وہ صحت مند ہو کر لکڑی کی مذکورہ ٹانگ کی مدد سے چل کر ہمارے گھر آئے تو دیکھا کہ لکڑی کی ٹانگ کے اُس مخصوص حصے کو بدستور کھجائے چلے جارہے ہیں جہاں ماضی میں کبھی داد ہوا کرتا تھا۔ ہم نے پوچھا ''کیا ڈاکٹروں نے لکڑی کی ٹانگ میں بھی داد کی پیوندکاری کردی ہے؟'' ہنس کر بولے ''یار! لکڑی کی ٹانگ میں بھلا کہیں کھجلی ہوتی ہے۔ وہاں سے کھجلی تو غائب ہو چکی ہے لیکن کیا کروں میرے ہاتھ کو برسوں کے ریاض کی وجہ سے کھجانے کی عادت پڑ گئی ہے۔ وہ بے ساختہ ٹانگ کے مخصوص حصے کی طرف بڑھ

جاتا ہے''۔ ہماری موجودہ چہل قدمی کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ بہر حال چہل قدمی کے دوران ہم اپنے کالم کے موضوع کے بارے میں ضرور سوچ لیتے ہیں۔ اکثر مضامین تو غیب سے خیال میں آجاتے ہیں لیکن بسااوقات ہمارے چند کرم فرما بھی بعض موضوعات کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔

ایسے ہی ہمارے ایک چاہنے والے ہیں حافظ محمد جیلانی جو ہمارے نا قابلِ علاج مدّاح ہیں۔ اگرچہ وہ ہمیں برسوں سے جانتے ہیں لیکن ان سے ملاقات ابھی دو ڈھائی برس پہلے حیدر آباد میں ہوئی۔ اس لئے کہ پچھلے تین چار دہوں کے عرصے میں وہ کرناٹک میں اردو کے استاد کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ ریٹائر ہوئے تو پھر سے حیدر آباد میں آکر بس گئے۔ اُردو کے استاد ہونے اور لمبے عرصے تک کرناٹک میں رہنے کے باوجود نہایت شستہ، با محاورہ اور خوبصورت زبان لکھتے ہیں۔ اور اسی رواں دواں زبان میں ہمیں دلچسپ خط لکھتے رہتے ہیں اور ہماری سہولت کی خاطر ایسے موضوعات کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں جن پر کالم لکھا جاسکتا ہے۔ ایک بار انہوں نے آٹو رکشاؤں پر لکھے جانے والے چند دلچسپ اشعار اس فرمائش کے ساتھ روانہ کئے کہ ہم ان کی مدد سے ایک کالم لکھ دیں۔ کیوں کہ ہم خطوں کے جواب دینے کے معاملے میں نہایت کوتاہ قلم واقع ہوئے ہیں، اسی لئے انہوں نے اطمینان قلب کی خاطر حیدر آباد سے فون کر کے ہم سے ان اشعار کی رسید مانگی۔ ہم نے ان اشعار کے ملنے کی توثیق کرتے ہوئے بطور اظہار ممنونیت یوں ہی کہہ دیا کہ اگر اس طرح کے کچھ اور اشعار مل سکیں تو وہ بھی روانہ فرمائیے۔ بس ہماری اتنی سی خواہش کو انہوں نے اپنا 'نصب العین' بنالیا اور اس کے بعد ان کی طرف سے ہر روز آٹو رکشاؤں پر لکھے گئے اشعار قسطوں میں ملنے لگے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے پاس آٹو رکشاؤں کے اتنے سارے اشعار جمع ہوگئے کہ اگر ہم چاہتے تو کسی اُردو اکیڈمی سے جزوی مالی امداد حاصل کر کے ان اشعار پر مبنی ایک 'مجموعہ کلام' شائع کرا سکتے تھے۔ (یوں بھی اردو اکیڈمیاں ایسے ہی کلام کی اشاعت کے لئے تو بنائی جاتی ہیں)۔ حافظ محمد جیلانی کے ایک دوست نے بتایا کہ ان اشعار کو جمع کرنے کے لئے ان کی لگن اور جستجو کا یہ عالم تھا کہ ایک بار ایک آٹو رکشا پر انھیں بہ یک وقت کئی اشعار لکھے ہوئے نظر آگئے جنھیں فوراً نقل کرنا چونکہ ان کے بس میں نہیں تھا لہٰذا خود ایک آٹو رکشا میں بیٹھ کر اول الذکر آٹو رکشا کے تعاقب میں روانہ ہوگئے۔ بڑی دیر تک وہ اس آٹو رکشا کا تعاقب کرتے رہے۔ ان

کی نظر اور توجہ چونکہ صرف اشعار پر مرکوز تھی اسی لئے انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اس آٹو رکشا میں ایک ایسی زنانہ سواری بھی موجود ہے جو خود مجسم شعر بنی بیٹھی ہے۔ غرض اس تعاقب میں ایک منزل ایسی بھی آئی جب 'منظوم آٹو رکشا' کے ڈرائیور کو شبہ ہوا کہ ہمارے حافظ صاحب اس زنانہ سواری کا تعاقب کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے آٹو رکشا کو روک کر تعاقب کا سبب جاننا چاہا تو جیلانی صاحب نے وہ کاغذ اس کے آگے بڑھا دیا جس پر اس کے آٹو رکشا پر 'شائع شدہ' چند اشعار نقل کئے جا رہے تھے۔ بہر حال دو باتوں کی وجہ سے یہ سنگین معاملہ رفع دفع ہو گیا ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ پہلی وجہ تو یہ کہ حافظ محمد جیلانی کے نورانی چہرہ پر ایک سفید براق داڑھی موجود ہے۔ اوپر سے ان کی مخصوص شیروانی، گلے میں پڑے ہوئے رومال اور سر پر رکھی ہوئی ایمان افروز ٹوپی کے علاوہ اپنے مخصوص حلیے کی وجہ سے وہ ایک ایسی قابلِ احترام اور معزز ہستی نظر آتے ہیں کہ اگر یوں ہی کسی محفل میں چلے جائیں تو منتظمین انہیں زبردستی نہ صرف شہ نشین پر بٹھا دیں بلکہ ان کی خدمت میں مسندِ صدارت بھی پیش کر دیں۔ دوسری وجہ یہ کہ جس آٹو رکشا پر لکھے ہوئے اشعار کو یہ نقل کرنا چاہتے تھے اتفاق سے اُن کا خالق خود اس وقت آٹو رکشا چلا رہا تھا اور جس کا دعویٰ تھا کہ اس کے یہ اشعار سراسر غیر مطبوعہ ہیں کیونکہ آٹو رکشا کے سوائے یہ کسی رسالے یا مجموعے میں شائع نہیں ہوئے تھے۔ اُس کی شاعری میں حافظ محمد جیلانی کی گہری دلچسپی کو دیکھ کر جب آٹو کشا ڈرائیور نے انھیں مزید کلام سنانا شروع کر دیا تو حافظ محمد جیلانی کو اپنے آٹو رکشا میں بیٹھ کر راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔ سنا ہے کہ کچھ دور تک اول الذکر آٹو رکشا نے موخر الذکر آٹو رکشا کا (جس میں جیلانی صاحب سوار تھے) تعاقب بھی کیا مگر یہ کسی نہ کسی طرح اپنے ادبی ذوق کی عصمت بچا کر بھاگ آئے۔ بہر حال اس طرح ہمارے پاس آٹو رکشاؤں کے بے شمار اشعار جمع ہو گئے ان میں سے کچھ ضائع ہو گئے اور کچھ بچ رہے۔ بعد میں ہم نے ان میں سے چند اشعار کی مدد سے ''اُردو کی آٹو رکشائی شاعری'' کے عنوان سے ایک کالم لکھا۔ اس کالم میں ہم نے ایک سنجیدہ تجویز یہ بھی پیش کی تھی کہ آٹو رکشا والے اپنے آٹو رکشاؤں پر جدید شاعری کے نمونے بھی شائع کریں تا کہ اُردو شاعری میں جو نئے رجحانات آئے ہیں اُن کی بھی نمائندگی ہو سکے۔ پچھلے دنوں ہم حیدر آباد گئے تو کسی نے یہ مژدہ سنایا کہ حیدر آباد کے ایک سخن فہم آٹو رکشا والے نے اپنے آٹو رکشا پر ہمارے دوست مغنی تبسم کا شعر بھی لکھوا رکھا ہے۔ (اس کے راوی قدیر زماں ہیں)۔ مغنی تبسم ہمارے پسندیدہ شاعر اور دوست ہیں

اور جس طرح ادب میں ان کے درجات بلند ہوتے جا رہے ہیں ان کا حال جان کر ہمیں بے پناہ خوشی ہوتی ہے۔

پچھلے سال موسم بہار میں ہم حیدرآباد میں تھے تو ایک دن صبح صبح کئی برس بعد کوئل کے کوکنے کی آواز ہمارے کانوں میں پڑی اور ہم نے اسی وقت اس آواز سے متاثر ہو کر ایک کالم ''کوئل کی کوک کو سن کر'' کے عنوان سے لکھ دیا۔ جب اس کالم کے چھپنے میں بڑی مشکل سے چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے تو حافظ جیلانی صاحب کا یوں ہی فون آ گیا۔ کہنے لگے ''بہت دنوں بعد آج میں نے کوئل کی آواز سنی۔ کیسے بتاؤں کہ اسے سن کر میرے دل پر کیا گزری''۔ ہم نے کہا ''جناب میں نے تو تین دن پہلے اس کوئل کو آپ کے پاس روانہ کیا تھا۔ اس نے آپ کے پاس پہنچنے میں اتنی دیر لگا دی۔ بڑی کام چور ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس کی آواز پر ایک کالم بھی لکھ دیا ہے جو کل صبح کے اخبار میں چھپ رہا ہے۔'' حافظ صاحب اس بات سے اتنے متاثر ہوئے کہ دوسرے دن فجر کی نماز پڑھتے ہی اخبار کی کاپی لے کر ہمارے پاس آ گئے۔ کہنے لگے ''حضور! ہم دونوں کے بیچ کوئی نہ کوئی روحانی تعلق ضرور موجود ہے۔ آخر کیا بات ہے کہ آپ جو کچھ سوچتے ہیں وہی بات میرے ذہن میں بھی آگے پیچھے چلی آتی ہے''۔ جیسے ہی انہوں نے یہ جملہ مکمل کیا کسی پیڑ پر اچانک ایک کوئل نے کوکنا شروع کر دیا۔ ہم نے ہنس کر کہا ''اچھا تو آپ اس روحانی تعلق کے دستاویزی ثبوت یعنی کوئل کو بھی اپنے ساتھ لیتے آئے ہیں۔ گویا پچھلے تین دنوں سے بے چاری کوئل کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہے''۔ ہمارے اس مزاحیہ تبصرے پر وہ کچھ اور سنجیدہ ہو گئے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ان سے روحانی تعلق کے باعث ہم نے ایک کالم اپنی چھڑی کے بارے میں ''عصائے مجبوری'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ یہ ایک لمبا قصہ ہے جو تفصیل چاہتا ہے۔ جس کے بارے میں پھر کبھی لکھیں گے۔ ہمارے اس کالم سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ عمرے کی سعادت حاصل کرنے کی غرض سے سعودی عرب گئے تو آب زمزم اور کھجوروں کے علاوہ جدّہ سے ایک، مکّے سے ایک اور مدینے سے دو چھڑیاں بطور تبرک ہمارے لئے لے آئے اور تاکید کی کہ ان چھڑیوں کو ہم صرف اچھی اچھی اور پاکیزہ جگہوں پر لے جائیں۔ ادبی محفلوں میں قطعی نہ لے جائیں تا کہ ان کی بے حرمتی نہ ہونے پائے۔

ہمارے ایک اور پرستار سید امتیاز الدین ہیں جو ہمارے مرحوم دوست شاذ تمکنت کے

چھوٹے بھائی ہیں۔ بے حد وسیع المطالعہ، اچھے ادیب اور مخلص انسان ہیں۔ ابھی دو چار برس پہلے تک آندھرا پردیش الیکٹریسٹی بورڈ کے سپرنٹنڈنگ انجینئر تھے۔ ملازمت کے دوران میں جو کچھ بھی ان کے بس میں تھا اس کے مطابق وہ آندھرا پردیش میں بجلی کی صورت حال کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہے اور بالآخر ریٹائر ہو گئے۔ چونکہ محکمہ برقی میں کام کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں اسی لئے اب وہ بجلی سے کہیں زیادہ اپنی 'روشنی طبع' کا استعمال کرنے لگے ہیں۔ ہمارے بے حد مخلص چاہنے والے ہیں اور پچھلے دس برسوں میں ہم نے جتنے بھی اچھے کالم لکھے ہیں (ان کی رائے کے مطابق) وہ اُنھیں یاد ہیں۔ اسی لئے ہم انھیں ماہر غالبیات کے وزن پر 'ماہر کالمیات' کہتے ہیں۔ وہ ہمارے کالم کے لئے نہ صرف نئے نئے موضوعات کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں بلکہ ہماری تحریروں میں سرزد ہونے والی املا کی غلطیوں سے بھی آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُردو کے ایک کامیاب مصنف کی طرح ہم املا کی ان غلطیوں کی ساری ذمہ داری 'کاتب' (یعنی موجودہ کمپیوٹر آپریٹر) پر عائد کرکے اپنا دامن بچا لیتے ہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ امتیاز ہماری اس بات کو مان بھی لیتے ہیں۔ بڑے ہی معصوم آدمی ہیں اور ہمیں ہمیشہ ایسے ہی معصوموں کی تلاش رہتی ہے۔ بھلے ہی ہم امتیاز کے آگے املا کی غلطی کو تسلیم نہ کریں لیکن ہم اپنے قارئین سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتے۔ ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ امتیاز املا کی جن غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہیں وہ بلا شرکت غیرے ہم سے ہی سرزد ہوتی ہیں۔ (یوں بھی ہم مزاح نگار ہیں۔ مولوی عبدالحق تھوڑے ہی ہیں کہ اپنی تحریر میں املا کی غلطی نہ کریں) پچھلے دنوں ہم نے ''ادب میں سرقہ'' اور ''اردو کے صاحب ویب سائٹ شعراء'' کے موضوع پر جو کالم لکھے تھے وہ امتیاز کے ورغلانے پر ہی لکھے تھے۔ اگر ان کالموں کی اشاعت سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو تو وہ سید امتیاز الدین سے راست ربط پیدا کریں۔ ہم تو اس معاملے میں بالکل بے قصور ہیں۔ ان احباب کے علاوہ ہمارے بعض ایسے بہی خواہ بھی ہیں جو رہتے تو دیار غیر میں ہیں لیکن اتنی دور سے بھی ہمارے لئے موضوعات فراہم کرتے رہتے ہیں، جیسے ڈاکٹر ابوالحسن صدیقی (جو ہمارے سب سے پرانے کرم فرما ہیں)، حسن چشتی، ڈاکٹر خورشید خضر (امریکہ) اور کے این واصف (جدہ) وغیرہ۔ ساری دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جس طرح ہو رہا ہے اس کے پس منظر میں آدمی کا ہنسنا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ کتنے ہی جلتے ہوئے، آگ اُگلتے ہوئے اور خون میں ڈوبے ہوئے موضوعات ہیں۔ ان جلتے ہوئے

موضوعات کو چھوتے ہوئے ڈر ہوتا ہے۔ جب ساری دنیا کی بات سنی نہ جارہی ہو تو وہاں ہماری بات کو کون سنے گا۔ اس لئے سوچا کہ کیوں نہ آج اپنے چند کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کردیا جائے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۳۰؍ مارچ ۲۰۰۳ء)

پانی کی پیاس سے علم کی پیاس تک

''پچھلے پچپن برسوں میں اس ملک نے حیرت انگیز ترقی کی ہے''۔

''مجھے تو تمہارے اس حیرت انگیز بیان پر حیرت ہو رہی ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ کس میدان میں ترقی کی ہے؟''۔

''آزادی کے وقت اس ملک میں ٹیلی ویژن نہیں تھا۔ اب ماشاء اللہ سو چینل چلتے ہیں''۔

''جو چوبیسوں گھنٹے اس ملک کے زوال کی بری خبریں سناتے اور دکھاتے رہتے ہیں۔ اور بتاؤ کس میدان میں ترقی کی ہے؟''

''ہم خلا میں مصنوعی سیارے بھیجنے لگے ہیں۔ انفارمیشن ٹکنالوجی نے اس ملک میں اتنی ترقی کرلی ہے کہ ساری دنیا اب خود ہندوستان کا ایک گاؤں نظر آنے لگی ہے۔ پلک جھپکتے میں دنیا کے کسی بھی براعظم میں رہنے والے کسی بھی شخص سے تم تعلق قائم کر سکتے ہو''۔

''یہ تو خیر ٹھیک ہے۔ مگر میرا مسئلہ یہ ہے کہ پچھلے ایک سال سے میں اپنے دو پڑوسیوں کا حال جاننے کے لئے بے چین ہوں۔ ان سے عجلت میں کبھی کبھار سلام کا تبادلہ تو ہو جاتا ہے لیکن کلام کی نوبت نہیں آتی۔ کل دائیں جانب والے پڑوسی کے گھر سے اچانک رونے کی آوازیں آئیں تو معلوم ہوا کہ میرے پڑوسی کی والدہ، جو کسی زمانے میں مجھے بہت عزیز رکھتی تھیں، لگاتار ایک سال تک بیمار رہنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ بائیں جانب والے پڑوسی کے گھر پچھلے ہفتہ پولیس آئی تو پتہ چلا کہ میرے پڑوسی کی بیوی مال و متاع اور زر و جواہر کو لے کر اپنے

ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ میرا یہ پڑوسی ملک کی ترقی اور اپنے کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہا کرتا تھا۔ تاہم اس کا ڈرائیور نہایت فرض شناس تھا اور بڑی پابندی سے ڈیوٹی انجام دیا کرتا تھا''۔

''مگر اس بات کا انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقی سے کیا تعلق ہے؟''

''بہت گہرا تعلق ہے، انفارمیشن ٹکنالوجی کی اتنی ترقی کے باوجود مجھے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ میرے ایک پڑوسی کی ماں پچھلے ایک سال سے بیمار تھی۔ مجھے یہ تک معلوم نہ ہوسکا کہ میرے دوسرے پڑوسی کا ڈرائیور نہایت فرض شناس آدمی تھا۔ لعنت ہے ایسی انفارمیشن ٹکنالوجی پر جس کی مدد سے براعظموں کے درمیان فاصلہ تو گھٹتا جارہا ہے لیکن ایک ہی محلّہ اور ایک ہی گھر میں رہنے والے انسانوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جارہا ہے''۔

''انفارمیشن ٹکنالوجی کو مارو گولی۔ دنیا کی ہر چیز اب اپنے ملک میں بننے لگی ہے۔ ایرکنڈیشنرس، ریفریجریٹرس، دُھلائی کی مشین، اسکوٹر، موٹریں، ٹریکٹر، دبابے، ہوائی جہاز کیا نہیں بن رہا ہے ہمارے ملک میں۔ اور تو اور پچپن برس میں ہم نیوکلیر طاقت بن گئے ہیں''۔

''یار! یہ باتیں تو بعد میں ہونگیں۔ اس وقت مجھے بڑی پیاس لگ رہی ہے۔ ایک گلاس پانی تو پلادو''۔

''ایک گلاس پانی! یہ کام نہیں ہوسکتا۔ کوئی اور چیز مانگو''۔

''اچھا تو آدھا گلاس ہی پانی دیدو''

''میں نے کہا نا کہ میرے پاس پانی نہیں ہے''

''میرا گلا بے حد سوکھ رہا ہے۔ لگتا ہے حلق میں کانٹے پڑ گئے ہیں''

''ٹھنڈی بیئر ہے۔ دوں؟''

''تمہیں معلوم ہے میں بیئر نہیں پیتا''

''وہسکی پیوگے، سوڈے کے ساتھ؟''

''میں یہ بھی نہیں پیتا''

''ان پڑھ گنوار کہیں کے۔ ہزار بار کہا کہ زندہ رہنے کے مہذب اور شائستہ بلکہ ترقی یافتہ آداب سیکھ لو مگر نہیں سیکھے''۔

''بھئی نہیں سیکھے۔ غلطی ہوگئی۔ پیاس سے بُرا حال ہو رہا ہے۔ پینے کے لئے کوئی چیز ہو تو دو''

''سگریٹ پیو گے؟ پلیز''

''لعنت ہے تم پر۔ اب پلیز ولیز نہ کرو میرا گلا خشک ہو رہا ہے''۔

''اچھا تو ایر کنڈیشنر چلا دیتا ہوں۔ اس سے گلے میں ٹھنڈک پیدا ہوگی''۔

''مگر اس سے میری پیاس تو نہیں بجھے گی''

''مہذب دنیا نے پیاس بجھانے کے اور بھی کئی طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔ تم انھیں اپنانا نہیں چاہتے۔ تو پھر پیاسے مرو''۔

''یار مذاق بند کرو۔ پہلے پانی پلا دو''۔

''بھیا! تین دن سے پانی نہیں آیا۔ تمہیں پانی کہاں سے پلاؤں۔ اچھا ایسا کرو میں انفارمیشن ٹکنالوجی کی مدد سے دنیا کے کسی بھی حصہ میں رہنے والے تمہارے کسی دوست سے ابھی فون پر بات کرائے دیتا ہوں''۔

''مگر فون کے ریسیور میں پانی تو آنے سے رہا''

''نل کی ٹونٹی میں ہی جب پانی نہیں آتا تو فون کے ریسیور میں کہاں سے آئے گا۔ اچھا یوں کرو کہ تم حسن چشتی سے شکاگو بات کرلو''۔

''اس سے کیا ہوگا؟''

''تمہارا کلیجہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور کیا''۔

''کلیجہ تو میں کسی بھی طرح ٹھنڈا کرلونگا۔ اس وقت تو میرے حلق میں آگ سی لگی ہوئی ہے''۔

''فائر بریگیڈ کو بلاؤں؟''

''عجیب احمق آدمی ہو۔ آدھے گھنٹے سے اس ملک کی ترقی کا حال بیان کر رہے ہو کہ ہمارے پاس ٹیلی ویژن ہے، انفارمیشن ٹکنالوجی ہے، ایٹم بم ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے اور اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود تمہارے پاس پانی کی ایک بوند تک نہیں ہے۔ لعنت ہے تم پر اور ترقی پر''۔

''خدا کے لئے اب بس بھی کرو، میرا وقت برباد نہ کرو۔ تم جا سکتے ہو۔ اپنی پیاس کہیں

اور بجھاؤ اور ہاں آئندہ کبھی بھولے بھٹکے میری طرف آنا تو اپنا پانی اپنے ساتھ لیتے آنا۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں تمہیں کسی کے ہاں جانے کے آداب بھی نہیں معلوم ہیں۔ خدا حافظ۔"

☆

"ہم نے ادب کے میدان میں کیسی کیسی جلیل القدر ہستیاں پیدا کی ہیں۔ کبیر، تلسی، امیر خسرو، کالیداس، میر، غالب، اقبال اور ٹیگور نے عالمی ادب کے سرمایہ کو مالا مال کیا ہے۔ ہمارا ادب دنیا کے کسی بھی ادب سے کمتر نہیں ہے۔ کیا نہیں ہے ہمارے پاس؟"۔

"خیر یہ باتیں تو بعد میں ہونگیں۔ پہلے ذرا پانی تو پلا دو۔ بڑی دیر سے پیاس لگی ہوئی ہے"۔

"یار! یہی ایک چیز تو نہیں ہے میرے پاس۔ دو دن سے پانی نہیں آرہا ہے۔ میں خود پیاسا ہوں۔ تمہیں کہاں سے پانی پلاؤں گا"۔

"پڑوس کے ہاں سے ہی ایک گلاس پانی منگوا دو۔ تمہارا بڑا احسان ہوگا"۔

"کیسے منگواؤں یار! دو دن پہلے خود میں نے پڑوسی کے ہاں سے ایک گلاس پانی اُدھار منگوایا تھا۔ صبح سے دو بار ان کا بیٹا اس پانی کی واپسی کا تقاضہ کر کے گیا ہے، دوسرے پڑوسی سے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے کہ اس کا تو میں ایک بالٹی پانی کا مقروض ہوں۔ بیچارا اچھا آدمی ہے"۔

"دیکھو تمہارے ریفریجریٹر میں شاید کوکا کولا یا ایسا ہی کوئی مشروب رکھا ہوگا۔ کم از کم گلا تو ٹھنڈا کرلوں۔"

"بھیا! کیوں مذاق کرتے ہو۔ اُردو کا شاعر ہوں۔ ریفریجریٹر وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتا۔ کوری ٹھلیا میں پانی بھر کر رکھتا ہوں جو پرسوں سے خالی ہے۔ البتہ ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"آب حیات دوں؟"

"آبِ حیات!"

میں اصلی آبِ حیات کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ محمد حسین آزاد کی کتاب 'آبِ حیات' کا ذکر کر رہا ہوں۔"

"میں اسے لے کر کیا کروں گا؟"

''اپنے علم کی پیاس بجھالینااور کیا۔میں خودان دنوں علم کی پیاس بجھا بجھا کر پانی کی پیاس پر قابو پا رہا ہوں۔''

''معاف کرنا۔اس سے میرا کام نہیں چلے گا۔''

''تو پھر قرۃالعین حیدر کا 'آگ کا دریا' دوں؟''

''مگراس سے تو میری پیاس بڑھ جائے گی۔''

''ایسی بات ہے تو شولوخوف کا ناول 'اور ڈان بہتا رہا' دوں؟۔بھارت چند کھنہ کی 'ٹھنڈی بجلیاں' دوں؟۔'پیاس کا صحرا' 'لہر لہر ندیا گہری' اور 'ایک لہر آتی ہوئی' دوں؟''

''تم میری پیاس کو سمجھ نہیں رہے ہو۔یہ علم کی پیاس نہیں بلکہ اور طرح کی پیاس ہے جو دو گھونٹ پانی سے دور ہو جائے گی۔''

''ایسی بات ہے تو تم تصوف کی کوئی کتاب پڑھو۔مولانا روم کی مثنوی دوں؟''

''تصوف کی کتاب پڑھنے سے کیا ہوگا؟''

''تم شاید نہیں جانتے کہ تصوف کی مدد سے تمہیں ایک قطرہ میں پورا ایک سمندر بھی مل سکتا ہے اور تم چاہو تو اس بیکراں سمندر کو ایک قطرے میں بھی تبدیل کر سکتے ہو۔کبھی جزو پھیل کر کُل بن جاتا ہے اور کبھی کُل ،جزو میں سمٹ جاتا ہے۔بڑا مزہ آتا ہے۔''

''تم ایک خبطی آدمی ہو،میں پانی کی ایک بوند کے لئے ترس رہا ہوں اور تم مجھے ادب عالیہ اور تصوف کے چکر میں پھنسا رہے ہو۔مجھے اجازت دو۔میں نے تمہارے پاس آکر غلطی کی۔''

''آئندہ ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا۔میرے پاس آؤ تو صرف علم کی پیاس بجھانے آؤ۔پانی کی پیاس بجھانے کا معاملہ ہو تو اپنا پانی اپنے ساتھ لیتے آنا بلکہ ہو سکے تو میرے لئے بھی تھوڑا سا پانی اپنے ساتھ لیتے آؤ۔خدا حافظ''۔

☆

ایک خاتون نے صبح صبح نل سے پانی حاصل کرنے کی غرض سے نل کی ٹونٹی کھولی تو نل میں سے تو پانی نہیں نکلا البتہ اس میں سے عجیب و غریب آوازیں آنے لگیں۔جب بڑی دیر تک پانی نہیں آیا تو خاتون کی آنکھوں سے اچانک آنسو ٹپاٹپ گرنے لگے۔ایک بچہ اس خاتون کی کاوش اور جدوجہد کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔بچہ نے نہایت سنجیدگی سے کہا ''اماں! تم جسے

نل کی ٹونٹی سمجھ رہی ہو وہ نل کی ٹونٹی نہیں ہے، یہ تو وہ ٹونٹی ہے جسے کھولو تو اس کے ذریعہ تمہاری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ یہ اصل میں تمہارے آنسوؤں کی ٹونٹی ہے۔ نل کی ٹونٹی تو شاید کہیں اور ہے۔ اسے ڈھونڈو تو تمہیں پانی ملے گا۔ غلط ٹونٹی کیوں کھولتی ہو۔''

بچہ کی اس معصوم سی بات پر خاتون کو غصہ آگیا۔ اس نے پانی کا گھڑا نل کی ٹونٹی پر دے مارا اور وہ چکنا چور ہو گیا۔ البتہ لڑکا وہاں سے گھبرا کر بھاگ گیا۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۱رمئی ۲۰۰۳ء)

ذکر کمال الدین احمد کا

دو ڈھائی مہینے پہلے سعودی عرب سے ہمارے بیٹے ہادی حسین کا فون آیا تو اس نے اور باتوں کے بعد کہا "سنا ہے کہ کمال الدین احمد انکل سعودی عرب میں ہندوستان کے سفیر بن کر آرہے ہیں۔ یہاں یہ خبر خاصی گرم ہے۔ کیا آپ کو اس کی اطلاع ہے"۔ ہم نے کہا "ابھی دو منٹ پہلے ہی کمال صاحب کا فون آیا تھا۔ دہلی کے موسم وغیرہ کے بارے میں تو بہت سی باتیں ہوئیں البتہ سعودی عرب میں اُن کے سفیر بن کر جانے کا کوئی ذکر انہوں نے نہیں کیا تاہم ایسی کوئی بات ہوگی تو میں ان سے پوچھ کر بتاؤں گا۔" فون کا ریسیور رکھ دینے کے بعد ہم سوچتے رہے کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو کمال الدین احمد صاحب نے اس کی اطلاع ہمیں کیوں نہ دی حالانکہ ان سے روز ہی یا تو فون پر بات ہو جاتی ہے یا ملاقات ہوتی ہے۔ تاہم ہمیں اچانک یہ خیال آیا کہ پچھلے دو تین برسوں میں ان کی سرگرمیوں کو بہ نظر غائر دیکھ کر اندازہ ہونے لگا تھا کہ سعودی عرب کی مقدس سرزمین سے ان کا ضرور کوئی گہرا رشتہ قائم ہونے والا ہے۔ نمازی اور پرہیز گار تو وہ پہلے ہی سے رہے ہیں لیکن اب ان کی عملی زندگی میں بھی اس کی جھلک صاف دکھائی دینے لگی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک ان سے ملنے کا وقت کچھ اس طرح طئے ہوتا تھا کہ شام میں ساڑھے پانچ بجے آجایئے، سات بجے آجایئے وغیرہ۔ اب ملاقات کا وقت کچھ اس طرح طئے ہوتا ہے کہ عصر کے بعد آجایئے یا مغرب اور عشاء کے بیچ آجایئے۔ ایک بار موٹر سے علی گڑھ جانے کی بات ہونے لگی تو ہم نے کہا "علی گڑھ چلنا ہو تو علی الصبح چلنا مناسب ہوگا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ پرسوں علی الصبح چل سکیں۔"

بولے ''آپ کہیں تو اس سے پہلے بھی چلا جا سکتا ہے کیونکہ میں تو تہجد کی نماز کے بعد بالکل نہیں سوتا۔ یہ ضرور ہے کہ فجر پڑھنے اور ضروری چہل قدمی کرنے کے بعد کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے آرام کر لیتا ہوں۔ آپ کہیں تو کیوں نہ صبح میں ساڑھے چار بجے علی گڑھ چلے چلیں۔ فجر علی گڑھ میں پڑھ لیں گے۔'' اُن کے اس ایمان افروز جواب کو سن کر پہلے تو ہم خجل ہوئے اور ڈرتے ڈرتے کہا ''جناب! کچھ تو ہم گنہگاروں کے وقت کا بھی خیال کیجئے۔ مانا کہ آباء واجداد کسی زمانہ میں بحرِ ظلمات تک میں گھوڑے دوڑا دیا کرتے تھے۔ لیکن اب ہم فجر سے پہلے موٹر تک میں بیٹھنے کے قابل نہیں رہے۔'' ہماری بات کو سُن کر ان کے چہرے پر اچانک گہری سنجیدگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ بولے ''آپ نے علی الصبح چلنے کی بات کیا کہہ دی کہ بے خیالی میں میرے منہ سے تہجد کی نماز کا ذکر آ گیا ورنہ میں اس کا کسی سے ذکر نہیں کرتا۔''

پھر اپنی انگشت شہادت کو آسمان کی طرف بلند کرتے ہوئے کہا ''یہ میرا اور میرے پروردگار کا معاملہ ہے''۔ ہم نے کہا ''آپ اطمینان رکھیں۔ یہ معاملہ یہیں تک رہے گا بشرطیکہ جب بھی آپ کو علی الصبح کہیں سفر کرنے کی ضرورت پیش آئے تو فجر کے بعد ہی سفر پر نکلیں اور تہجد کو بیچ میں نہ لائیں''۔

اس پس منظر کے ساتھ جب ہم نے اُن کے سفیر بن جانے کی تصدیق کرنے کی خاطر انہیں فون ملایا تو خود انہوں نے فون اٹھالیا۔ ہم نے کسی تمہید کے بغیر اپنی آواز کو بدل کر پوچھا۔

''یور ایکسلنسی! کیا آپ گھر پر ہیں؟''۔

جواب آیا ''سوری! رانگ نمبر''۔

تھوڑی دیر کے لئے ہم بھی مخمصے میں پڑ گئے۔ قبل اس کے کہ وہ فون کا ریسیور رکھ دیتے ہم نے پوچھا ''کیا یہ کمال الدین احمد صاحب کا گھر نہیں ہے؟''۔ بولے ''میں کمال الدین احمد بول رہا ہوں''۔ ہم نے کہا ''اور میں مجتبیٰ بول رہا ہوں۔'' حیرت سے بولے ''اگر آپ بول رہے ہیں تو یہ یور ایکسلنسی کون ہے؟''۔ ہم نے کہا ''سنا ہے کہ آپ ہز ایکسلنسی بن گئے ہیں۔ ہمیں اطلاع تک نہ دی۔''

ہنس کر بولے ''اب میں سمجھا کہ آپ کو یور ایکسلنسی کہنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوگئی۔ آپ کو یہ اطلاع کہاں سے ملی؟'' ہم نے کہا ''ابھی ابھی ہمارے بیٹے کا سعودی عرب سے فون

آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ آپ وہاں سفیر بن کر جارہے ہیں۔" بولے" ابھی تو غیر رسمی طور پر یہ بات چل رہی ہے۔ اللہ نے چاہا تو کچھ عرصہ بعد سرکاری طور پر بھی اطلاع آجائے گی۔"

بہر حال اب سرکاری طور پر بھی یہ اعلان ہو چکا ہے کہ کمال الدین احمد جولائی کے دوسرے ہفتہ میں سعودی عرب میں اپنی نئی ذمہ داری سنبھالیں گے۔ کمال الدین احمد سے ہمارے شخصی مراسم لگ بھگ چالیس برس پرانے ہیں۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ ۱۹۶۲ء میں وہ پہلی بار آندھرا پردیش اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اور ہم نے بھی اتفاقاً اسی سال مزاح نگاری شروع کی تھی۔ ہمیں یاد ہے کہ حیدر گوڑہ کے پرانے ایم ایل ایز کوارٹرس میں ان سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ ۱۹۷۳ء تک وہ آندھرا پردیش اسمبلی کے رُکن رہے۔ ۱۹۷۱ء میں وہ آندھرا پردیش روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے چیرمین بنائے گئے۔ ان کے بارے میں ہم نے پہلی تحریر اسی زمانہ میں لکھی تھی۔ اُن سے ہماری قربت کی بنیادی وجہ اُردو ادب سے ان کی گہری دلچسپی رہی ہے۔ وہ اُردو زبان و ادب کا بے حد نکھرا ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ اساتذہ کے بے شمار اشعار انہیں یاد ہیں جن کا برمحل استعمال وہ اپنی بات چیت میں کرتے رہتے ہیں۔ اُردو کے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی تصنیفات بھی وہ گہرے انہماک سے پڑھتے ہیں۔ ہماری لائبریری میں شاید ہی کوئی ایسی بدقسمت کتاب رہ گئی ہو جس نے اپنے آپ کو کمال الدین احمد سے نہ پڑھوایا ہو۔ بسا اوقات وہ خود آکر رسالے اور کتابیں اپنے لئے منتخب کر کے لے جاتے ہیں۔ ان کے بعض خطوط بھی ہمارے پاس محفوظ ہیں جن سے زبان و بیان پر ان کی گہری قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ سیاست میں الجھے رہے اور ادب میں داخل نہیں ہوئے ورنہ ہم جیسوں کو کون پوچھتا۔ چالیس برس کے تعلقات کی روشنی میں اب ہم ان کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کی برائی نہیں کی اور نہ کسی کی برائی سننے کے روادار رہے، نہ اپنے کسی سیاسی حریف کی اور نہ ہی اپنے کسی بدخواہ کی۔ حد تو یہ ہے کہ کبھی اپنی برائی بھی نہیں کی۔ ہماری عادت ہے کہ ہم اپنی بیوقوفیوں اور کوتاہیوں کا خود سب سے زیادہ مذاق اڑاتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو اپنے آپ پر لعنت بھی بھیجتے ہیں۔ انہیں یہ بات بھی اچھی نہیں لگتی۔ کہتے ہیں" جناب! آپ جس طرح اپنے ہی منہ پر خود اپنی برائی کرتے ہیں وہ اچھی نہیں لگتی۔ آدمی کو وسیع القلب ہونا چاہئے، چاہے معاملہ خود اُس کی اپنی ذات کا ہی کیوں نہ ہو"۔ (کمال الدین احمد کو ہم سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ ہم نے کبھی خود

اپنے بارے میں نہیں سوچا بلکہ سدا دوستوں اور دوسروں کے کام آتے رہے۔)

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ ۱۹۷۲ء میں ہم دہلی آگئے تو رفتہ رفتہ کمال الدین احمد کی سرگرمیوں کا مرکز بھی دہلی بنتا چلا گیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے وہ اکثر دہلی آیا کرتے تھے اور ان سے بڑی پابندی سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۰ء میں وہ پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوگئے۔ وہ چار مرتبہ لوک سبھا کے رکن منتخب ہوئے اور مختلف اوقات میں مرکزی حکومت کے وزیر بھی رہے۔ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۹ء تک وہ دہلی میں نیفیڈ (Nafed) کے چیرمین بھی رہے۔ جب تک وہ چیرمین رہے ان کے پاس سے ہمارے ہاں کھانے پینے کی کئی اشیاء جیسے مختلف قسم کے آچار، آم، سیب، اناس کے علاوہ پھلوں کے رس کے بنڈ بے وغیرہ بڑی پابندی سے بطور تحفہ آیا کرتے تھے۔ پہلے مفت میں کھاتے تھے اب خرید کر کھانے پر مجبور ہیں۔ اس لئے کہ عادت جو پڑ گئی ہے۔ ایک زمانہ میں وہ عید کی نماز بڑی پابندی سے پڑھا کرتے تھے۔ جب وہ دہلی میں ہوتے اور ایسے میں عید آجاتی تو فون پر پہلے سے طے کرلیتے تھے کہ فلاں مسجد میں نماز پڑھی جائے گی۔ اس کے بعد وہ ہمارے گھر آجاتے تھے اور یہیں عید مناتے تھے۔ حکومت کے کئی اہم عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود انہوں نے مرغن غذاؤں سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ بے حد سیدھا سادا کھانا کھاتے ہیں۔ جب بیگم کمال الدین احمد دہلی میں نہیں ہوتیں تو ان کا فون آجاتا ہے کہ ''میں دوپہر میں آپ کے ہاں کھانا کھانے کے لئے آرہا ہوں۔ بھابی کو بتا دیجئے۔'' ان کی اس اطلاع پر ہماری اہلیہ بہت خوش ہوتی تھیں کیونکہ اس دن انہیں دال روٹی کے سوائے کچھ بھی نہیں پکانا پڑتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں بھی مجبوراً دال روٹی پر ہی گزارا کرنا پڑتا تھا۔ مہمان نوازی میں یہی تو مشکل ہوتی ہے۔ کھانے اور رہن سہن کے معاملہ میں کمال الدین احمد نہایت قانع اور سادگی پسند واقع ہوئے ہیں۔ حیدرآباد کی کھٹی دال اور دہی کے بڑے شوقین ہیں۔ ان کی ترقی کا راز بھی غالباً اسی سادگی اور ان کی منکسر المزاجی میں پوشیدہ ہے۔ صحت کے معاملہ میں بھی وہ بے حد سخت گیر اور منظم آدمی ہیں۔ آندھی ہو یا بارش ان کی صبح کی چہل قدمی کا کبھی ناغہ نہیں ہوتا۔ غرض جو بھی کام کرتے ہیں نہایت اہتمام، انہماک اور لگن کے ساتھ کرتے ہیں۔

سعودی عرب میں ان کے سفیر بننے کی اطلاع پاکر ایک لحمہ کے لئے ہمیں احساس ہوا کہ دہلی میں چوتھائی صدی تک ان کا ساتھ رہا بلکہ ان کی وجہ سے دہلی جیسا شہر بھی ہمیں خوشگوار

لگا۔(حیدرآباد اور دہلی کے بارے میں ہمیں ان سے ہمیشہ اختلاف رائے رہا۔) اب یہ چلے جائیں گے تو دہلی ہمارے لئے اور بھی سونی ہو جائے گی۔ پھر خیال آیا کہ وہ دہلی سے ایک ایسی مقدس جگہ جا رہے ہیں جہاں پر کوئی منہ اٹھائے جانے کی جسارت نہیں کر سکتا تاوقتیکہ قدرت خود اُسے وہاں طلب نہ کرے۔ یہ سعادت کسے نصیب ہوتی ہے۔ ہم تو ابھی سے یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ وہاں وہ ہمارے لئے دعا کریں اور یہاں ہمارے حالات بہتر ہو جائیں۔ (آمین)

ہمیں یقین ہے کہ سعودی عرب میں ہندوستان کے سفیر کی حیثیت سے ان کا وسیع تجربہ ان کے کام آئے گا اور دونوں ممالک کے تعلقات کو بہتر بنانے میں بڑی مدد ملے گی۔

روزنامہ ''سیاست'' (یکم جون ۲۰۰۳ء)

خبریں ہی خبریں

ہمارا اخبار والا نہایت ہی محنتی اور فرض شناس نوجوان ہے۔ بارش ہو یا طوفان کبھی اخبار کا ناغہ نہیں ہونے دیتا۔ ایک دن صبح صبح ہم نے دیکھا کہ وہ اخباروں کا بھاری بھرکم بنڈل اٹھائے ہماری ہاؤسنگ سوسائٹی میں چلا آرہا ہے۔ ہم نے ازراہ ہمدردی اس سے کہا ''میاں! تمہارا یہ کام تو بڑا جان لیوا اور محنت طلب ہے۔ اتنا بھاری بنڈل اٹھانے میں تمہیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی''۔ ہمارے اس سوال کے جواب میں بڑے اعتماد سے بولا ''اصل تکلیف تو اُن لوگوں کو ہوتی ہے جو اخبار پڑھتے ہیں۔ بھلا مجھے کیوں تکلیف ہوگی کیونکہ میں تو اخبار پڑھتا ہی نہیں''۔

اخبار والے کے اس بلیغ جواب کو سن کر ہم ششدر رہ گئے۔ بعض لوگ انجانے میں بڑے پتہ کی بات کہہ جاتے ہیں۔ علی گڑھ میں ایک صاحب اُستاد چھوہارا ہوا کرتے تھے جو ہمیشہ اہل علم و دانش کی صحبت میں رہا کرتے تھے لیکن خود باتیں اول جلول اور احمقانہ کرتے تھے۔ ایک دن رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور میں کسی مسئلہ پر بحث ہورہی تھی اور یہ اس بحث کو بغور سن رہے تھے۔ ایک مرحلہ پر انہوں نے رشید صاحب سے کہا ''رشید صاحب! اگر آپ اجازت دیں تو کیا میں بھی اس مسئلہ پر کچھ اظہار خیال کرسکتا ہوں؟''۔ رشید صاحب نے ازراہ مذاق کہا ''کیوں نہیں۔ ضرور اظہار خیال کرو۔ بعض اوقات احمق اور ان پڑھ آدمی بھی پتے کی بات کہہ جاتا ہے''۔ اس پر اُستاد چھوہارا نے برجستہ کہا ''رشید صاحب! سبحان اللہ آپ نے بڑے پتے کی بات کہی ہے''۔ ہم نے تو اخبار والے کی تکلیف کو دیکھ کر اس سے اظہار ہمدردی کرنا چاہا تھا مگر اس نے الٹا ہماری

تکلیف میں اضافہ کر کے خود ہمیں قابل رحم بنا دیا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ایک صاحب کے ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں غائب تھیں۔ کسی نے ایک دن اُن کی انگلیوں کی گمشدگی کا سبب پوچھا تو بولے" ایک دن میں نے یہ جاننے کے لئے کہ گھوڑے کے منہ میں کتنے دانت ہوتے ہیں اپنے گھوڑے کے منہ میں اپنا ہاتھ ڈالا تو گھوڑے نے غالباً یہ جاننے کے لئے کہ انسان کے ایک ہاتھ میں کتنی انگلیاں ہوتی ہیں اپنا منہ زور سے بند کر دیا اور یوں اُس نے میری انگلیاں گن لیں"۔ دیکھا جائے تو اخبار والے نے بھی کچھ ایسی ہی حرکت ہمارے ساتھ کی۔ تاہم ہم اس کی ذہانت کے قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ سچ بھی ہے کہ اخبار کا وزنی بنڈل اٹھانے سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی کہ اخبار میں چھپی ہوئی خبروں کو پڑھنے سے ہوتی ہے۔ اگر ہم بھی کسی اخبار کے ہاکر ہوتے اور اس میں چھپی خبریں نہ پڑھتے تو آرام کی زندگی گذار سکتے تھے۔ آپ یقین کریں کہ ایک دن ہم نے یونہی اخبار پڑھنے سے پہلے وزن کرنے والی مشین پر اپنا وزن معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ۷۳ کیلوگرام ہے اور بعد میں ایک گھنٹہ تک اخبار کا مطالعہ کرنے اور حسب توفیق اپنا خون کھولانے کے بعد پھر مشین پر کھڑے ہوگئے تو معلوم ہوا کہ ہمارے وزن میں آدھے کیلوگرام کی کمی واقع ہوگئی ہے۔ یوں بھی اخباروں میں زنا، اغواء، ڈکیتی، قتل، غارتگری، فسادات اور حادثوں کی ایسی وحشتناک خبریں آنے لگی ہیں کہ کبھی کبھی تو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ آخر ہم خود اب تک کسی وحشتناک خبر میں کیوں تبدیل نہ ہو سکے۔ اخباروں میں آئے دن چھپنے والی ان گندہ، غلیظ اور اندوہناک خبروں کا ہی نتیجہ ہے کہ ہماری بیوی جب تک ہاتھوں میں دستانے نہیں پہن لیتیں اور ناک پر رومال نہیں رکھ لیتیں تب تک اخبار کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔

بہر حال یہ بات طے ہے کہ ان دنوں اچھی خبریں آنی بند ہوگئی ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ان بُری اور وحشتناک خبروں کو جلد از جلد عوام تک پہنچانے کے لئے ان دنوں ایک دو نہیں بلکہ بارہ تیرہ ٹیلی ویژن چینلوں نے چوبیسوں گھنٹے خبروں کو دکھانے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ پہلے دو تین چینل ہی یہ نامبارک و نامسعود فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ اب بیک وقت کئی چینل اس غیر انسانی کام کو انجام دینے میں جُٹ گئے ہیں تاکہ عوام کو چین سے نہ رہنے دیا جائے۔ ان چینلوں کو صرف بُری خبروں سے مطلب ہوتا ہے۔ ان خبروں کے پیچھے چھپی ہوئی دردناکی سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ پرسوں پریس کلب میں ہمارے ایک دوست ایک ٹیلی ویژن چینل کے کیمرہ مین کا

قصہ سنا رہے تھے کہ کیمرہ مین ایک دریا کے کنارے سے گذرا تو دیکھا کہ ایک شخص دریا میں ڈوب رہا ہے۔ کیمرہ مین نے فوراً اپنا کیمرہ چلا دیا تا کہ ڈوبنے والے کا جیتا جاگتا منظر اپنے ٹیلی ویژن چینل پر دکھا سکے۔ اتنے میں وہاں سے ایک بھلے راہگیر کا گذر ہوا تو اس نے کیمرہ مین کو ٹوکا کہ میاں یہ کیا حرکت کر رہے ہو۔ اپنا کیمرہ نیچے رکھ دو اور اس شخص کو ڈوبنے سے بچاؤ۔ کیمرہ مین نے کہا ''حضور! مجھے تو اس آدمی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو اس کے ڈوبنے میں دلچسپ رکھتا ہوں تا کہ اس کی دردناک خبر اپنے چینل پر دکھا سکوں۔ میں تو اپنا فرض انجام دے رہا ہوں۔ اگر تمہیں اس آدمی سے اتنی ہی ہمدردی ہے تو دریا میں کود کر اس شخص کو ڈوبنے سے کیوں نہیں بچاتے۔ اس صورت میں مجھے اپنے چینل پر یہ خبر دکھانے میں سہولت ہوگی کہ کس طرح تم نے اپنی جان پر سے کھیل کر ایک شخص کی جان بچائی''۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ان دنوں ہر کس و ناکس کو کسی نہ کسی عنوان سے ٹیلی ویژن پر اپنا مکھڑا (چاہے وہ کتنا ہی بدوضع کیوں نہ ہو) دکھانے کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ کیمرہ مین کی بات سنتے ہی راہگیر دریا میں کود پڑا۔ ڈوبنے والے کو بچانے کی بجائے جب وہ خود بھی دریا میں غوطے لگانے لگا تو کیمرہ مین نے کہا ''میاں! سیدھے سیدھے اس آدمی کو بچاؤ۔ یہ کیا کر رہے ہو؟''۔ اس پر اس بھلے راہگیر نے ڈوبتے ڈوبتے کیمرہ مین سے کہا ''بھیا! ٹیلی ویژن پر اپنی شکل دکھانے کے شوق میں دریا میں کود تو گیا لیکن کودنے کے بعد پتہ چلا کہ میں تو تیرنا جانتا ہی نہیں۔ گویا اب میرا ڈوبنا بھی برحق ہے''۔ اس پر کیمرہ مین نے کہا ''اگر یہ معاملہ ہے تو اس بات کا خیال رکھو کہ جب بھی غوطہ کھا کر پانی کی سطح سے اوپر آؤ تو کیمرہ کی طرف دیکھو اور ہاں اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ ضرور سجا لینا تا کہ ناظرین کو پتہ چلے کہ تم نے کس طرح ہنستے ہنستے جان دیدی، یوں تمہارے مرنے کی خبر میں جان پیدا ہو جائے گی''۔

بھلا بتایئے خبروں کے دس بارہ چینلوں پر آخر کوئی کب تک بری خبریں دیکھتا رہے اور چینل بھی کب تک ایسی خبریں دکھاتے رہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی چینل ایک دن کسی بری خبر کو پکڑ لیتا ہے تو سارا دن اسی خبر کو وقفہ وقفہ سے دکھاتا رہتا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے مدھیہ پردیش میں اچانک جھینگروں نے یلغار کر دی تھی۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ لہذا ایک چینل سارا دن ان جھینگروں کو مختلف زاویوں سے دکھاتا رہا۔ ایک زاویئے میں تو کیمرہ مین ایک جھینگر کے سامنے کچھ اس طرح پہنچ گیا کہ لگتا تھا کچھ ہی دیر میں جھینگر سے سوالات کرنے کا ارادہ رکھتا ہے کہ آپ کو

یہاں کا ماحول کیسا لگ رہا ہے؟۔آپ ڈگ وجے سنگھ کے حمایتی ہیں یا او ما بھارتی کے؟۔آپ مدھیہ پردیش میں کب تک رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟۔آپ کا تعلق سنگھ پریوار سے ہے یا کانگریس سے؟۔ بڑی دیر تک جھینگر کیمرے کے سامنے ڈٹا رہا اور مونچھیں ہلاتا رہا پھر اچانک رپورٹر کے مائیکروفون پر چڑھ گیا۔ یہاں تک کہ کیمرہ مین اور رپورٹر دونوں وہاں سے بھاگ گئے۔کہیں کسی دن کسی ٹرین کا حادثہ ہو جائے تو سمجھئے کہ آپ کا سارا دن اسی کی نذر ہو گیا۔مسافروں سے طرح طرح کے احمقانہ سوالات پوچھے جائیں گے۔ایک مسافر سے ایک رپورٹر نے پوچھا تھا ''جب ٹرین حادثہ کا شکار ہوئی تو آپ ٹرین کے اندر ہی تھے یا کہیں باہر تھے؟''۔مسافر، جو پہلے ہی سے جلا بُھنا بیٹھا تھا، بولا ''کیا تم مجھے بھی ٹیلی ویژن کا کیمرہ مین سمجھتے ہو کہ حادثہ کی آس میں کیمرہ لے کر ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہونگا۔بھیا! میں تو ٹرین کے اندر ہی تھا''۔

کوئی خبر نہ بھی ہو تو ٹیلی ویژن چینل والے کسی بھی غیر اہم اور معمولی واقعہ کے اندر سے خبر نکال لینے کا ہنر جانتے ہیں۔صحافت میں بال کی کھال پہلے بھی نکالی جاتی تھی لیکن اب خبر کے ساتھ ساتھ ناظرین کی کھال بھی نکالی جانے لگی ہے۔آپ نے ایک اخبار کے رپورٹر کا وہ قصہ تو سنا ہو گا جسے ایک سیاسی لیڈر کی اہم پریس کانفرنس کی رپورٹنگ کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔پریس کانفرنس کے بعد رپورٹر نے اخبار کے ایڈیٹر سے کہا ''سر! آپ نے مجھے اس پریس کانفرنس میں یہ کہہ کر بھیجا تھا کہ یہ لیڈر کوئی اہم بیان دینے والا ہے لیکن اُس نے کچھ نہیں کہا۔ بتایئے میں کیا کروں؟''۔اس پر ایڈیٹر نے کہا ''ایسی صورت میں تم اس پریس کانفرنس کے بارے میں جو کچھ بھی لکھو اس کی طوالت کو دو کالم سے زیادہ نہ بڑھنے دو''۔

بہر حال خبروں کے ٹیلی ویژن چینلوں اور بری خبروں کی بہتات سے ہم تنگ آ گئے ہیں اور اب ہم نے ٹیلی ویژن پر خبروں کو دیکھنا بند کر دیا ہے۔اس کی بجائے جنگلی جانوروں وغیرہ سے متعلق پروگرام دیکھنے لگے ہیں کیونکہ اب ہمیں ایسے پروگراموں میں زیادہ ''انسانیت'' نظر آنے لگی ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۶/جولائی ۲۰۰۳ء)

☆☆

ایک عجیب وغریب ٹیلی فونی بات چیت

کل رات کے پچھلے پہر فون کی گھنٹی بجی اور میں نے ریسیور اٹھایا تو ایک عجیب وغریب ٹیلی فون کال سے میرا واسطہ پڑا۔ مخاطب نے میرا نام لے کر کہا ''بتاؤ کیسے ہو؟۔ کس حال میں ہو؟۔'' اپنا حال اُسے بتانے سے پہلے عادت کے مطابق میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ دیکھیں دوسری طرف کون بول رہا ہے تا کہ میں اسی کے مطابق اپنا حال بتا سکوں۔ جس طرح کا شناسا ہو اُسے میں اسی طرح کا حال بتایا کرتا ہوں کیونکہ ہر رشتہ کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی یونہی رسماً میرا حال پوچھ لے اور میں اسے اپنا اصلی اور کھرا کھرا حال سنانے بیٹھ جاؤں۔ بعض لوگ بس یونہی مروتاً کسی کا حال پوچھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو آپ اپنا سچّا حال بتا بھی دیں تو آپ کا حال بہتر نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے مزید خراب ہونے کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ میں نے جب اس کا نام پوچھا تو آواز آئی۔ ''میں عبداللطیف بول رہا ہوں، پرانی دہلی کے چتلی قبر والے علاقہ کا تمہارا پرانا دوست۔'' عبداللطیف کا نام سنتے ہی میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کیونکہ اس دنیا میں میرا ایک ہی دوست عبداللطیف تھا اور جس عبداللطیف سے میری بات ہو رہی تھی اُسے اس دنیا سے گزرے ہوئے چھ مہینے بیت چکے ہیں۔ عبداللطیف سے میری پچیس برس پرانی دوستی تھی، وہ خود تو ادیب، شاعر یا فنکار نہیں تھا لیکن اسے ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں رہنے کا شوق تھا۔ پرانی

دہلی میں اس کی کپڑے کی دکان تھی اور جس طرح وہ اپنے دوستوں کی خاطر تواضع کرتا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا کاروبار اچھا چلتا ہے۔ جب بھی میرے گھر آتا تو خالی ہاتھ نہیں آتا تھا، کچھ نہ کچھ ضرور لے آتا تھا۔ کوئی بقرعید ایسی نہیں گزری جب میں دہلی میں موجود ہوں اور وہ قربانی کے بکرے کے سالم ران لے کر میرے پاس نہ آیا ہو۔ اس کی یہ محبت یک طرفہ تھی۔ میرے ہر دوست نے کسی نہ کسی مرحلہ پر اپنا کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا کام مجھ سے ضرور کروایا لیکن عبداللطیف نے کبھی کسی کام کے لئے نہیں کہا۔ جن دنوں میں پابندی سے کافی ہاؤس جایا کرتا تھا عبداللطیف بڑی پابندی سے کافی ہاؤس کے سامنے رسالوں اور اخبارات کے ایک اسٹال پر میرا انتظار کرتا تھا اور جب تک میں وہاں نہ پہنچوں وہ رسالوں کے مطالعہ میں مصروف رہتا تھا۔ اس بہانے نیوز پیپر اسٹال والے سے بھی اس کی دوستی ہوگئی تھی اور وہ اس کے بیٹھنے کے لئے ایک اسٹول فراہم کر دیتا تھا تا کہ وہ اطمینان سے اخباروں اور رسالوں کا مطالعہ کر سکے۔ میرے وہاں پہنچنے کے بعد ہی وہ میرے ساتھ کافی ہاؤس میں داخل ہوتا تھا اور میرے ساتھ ہی باہر بھی نکلتا تھا۔ محفل میں وہ ہمیشہ خاموش رہتا تھا البتہ میرے اور میرے دوستوں کے درمیان جو نوک جھونک چلا کرتی تھی اس سے بے حد لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ یوں میں اس کی محبت کا عادی ہوتا چلا گیا۔ جب میں نے کافی ہاؤس آنا جانا کم کر دیا تو وہ فون کر کے میرے پاس آنے لگا۔ روز تو خیر نہیں آتا تھا لیکن ہفتہ میں ایک مرتبہ کسی نہ کسی طرح میرے پاس آجاتا تھا۔ چھ مہینے پہلے جب اس کا انتقال ہوا تو صبح صبح اُس کے بیٹے نے مجھے فون کر کے یہ اندوہناک اطلاع دی کہ ''ابو کا کل رات اچانک انتقال ہوگیا، آج وہ غالباً آپ سے ملنے والے تھے، مرنے سے پہلے شدید کرب کے عالم میں بھی انہوں نے مجھے یہ ہدایت دی تھی کہ اگر انہیں کچھ ہوگیا تو آپ کو فوراً اس کی اطلاع دے دی جائے۔ آج دوپہر میں بعد نمازِ ظہر آئی ٹی او کے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئے گی۔'' اس خبر کو سن کر مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔

عبداللطیف جیسے خاموش، مخلص اور بے لوث محبت کرنے والے دوست کا اس دنیا سے گزر جانا میرے لئے نہایت تکلیف دہ سانحہ تھا۔ میری دنیا یوں بھی ان دنوں سکڑتی چلی جارہی ہے۔ جب بھی کوئی پرانا دوست اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے میری سماجی زندگی کا ایک ستون گر گیا ہے۔ میرے سماجی رشتوں کے ایوان کی موجودہ حالت کم و بیش ویسی ہی ہوگئی ہے جیسے امریکی بم باری کے بعد بغداد شہر کی ہوگئی ہے۔ ہر عمارت نہ صرف تباہ و تاراج ہو چکی ہے بلکہ

اس کے اندر جو سامان تھا وہ بھی لُٹ چکا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوستوں کی رحلت کو برداشت کرنے کی عادت مجھ میں پیدا ہوتی جارہی ہے کیونکہ مشکلیں جب زیادہ پڑتی ہیں تو خود بخود آسان ہوجاتی ہیں۔ تاہم عبداللطیف کی موت کی خبر سن کر میں بڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا تاکہ میں اپنے اندر اس سانحہ کو برداشت کرنے کی ہمت پیدا کرسکوں۔ ہمت تو خیر پیدا نہیں ہوئی، البتہ بے بسی اور بے حسی کی ایک ایسی کیفیت ضرور پیدا ہوئی جسے لوگ غلط فہمی یا ناسمجھی میں ہمت کا نام دے ڈالتے ہیں۔ کچھ دیر بعد میں نے گھڑی دیکھی تو دس بج رہے تھے۔ اتفاق سے اُس دن مجھے صبح میں دو چار ضروری کام کرنے تھے۔ میں نے سوچا کہ کچھ کاموں کو ملتوی کردوں اور جو بھی ضروری کام کروں، انہیں کچھ اس طرح انجام دوں کہ ظہر کی نماز کے بعد عبداللطیف کی آخری رسومات میں ضرور شرکت کرسکوں۔ میں نہانے کے لئے باتھ روم میں گیا تو معلوم ہوا کہ پانی نہیں آرہا ہے۔ ایک رات پہلے شمالی ہندوستان میں بجلی کے گریڈ کے نظام میں خرابی پیدا ہوجانے کے بعد کئی گھنٹوں تک بجلی بند رہی تھی جس کی وجہ سے پانی کی سپلائی میں بھی خلل واقع ہوگیا تھا۔ میں نہانے اور داڑھی وغیرہ بنانے کے معاملہ میں زیادہ دیر نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ عبداللطیف کی آخری رسومات میں ٹھیک وقت پر شرکت کرنا ضروری تھا۔ میں نے بحالت مجبوری منرل واٹر کے بیس بیس لیٹر والے دو کنستر ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور سے منگوائے۔ یہ اور بات ہے کنستروں کے آنے میں بھی آدھے گھنٹہ کا وقت ضائع ہوگیا کیونکہ معلوم ہوا کہ ڈپارٹمنٹل اسٹور پر ان کنستروں کو حاصل کرنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن مجھے عبداللطیف کا ایک جملہ اچانک یاد آیا جو وہ دہلی شہر کی خصوصیت اور مزاج کو ظاہر کرنے کے لئے اکثر استعمال کرتا تھا۔ عبداللطیف اگرچہ خالص کرخنداری زبان بولتا تھا لیکن اسے پنجابی زبان کا ایک محاورہ ''کُتی چیز'' بہت پسند تھا۔ چنانچہ دہلی کے بارے میں اکثر کہا کرتا تھا ''دہلی بڑی کُتی چیز ہے۔'' یہاں کے موسم، یہاں کے ٹریفک، یہاں کے حالات، یہاں کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی سے متعلق شخصیتوں کو بھی اسی ''کُتی چیز'' کے لقب سے نوازتا تھا۔

میں جب پچاس روپے کی مالیت کے پانی سے نہانے لگا تو دہلی کے ''کُتی چیز'' ہونے کا مجھے یقین آگیا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ عرصہ بعد اخباروں میں ایسی خبریں بھی آئیں کہ صاف کیا ہوا یہ پانی بھی پینے کے قابل نہیں ہے بلکہ یہ نہانے کے کام بھی نہیں آسکتا۔ غرض نہا کر غسل خانے

سے نکلنے اور تیار ہو کر گھر سے باہر آنے تک بارہ بج چکے تھے۔ دھوبی نے بھی کپڑوں پر استری کرنے میں کچھ دیر لگا دی تھی۔ مجھے سب سے پہلے بجلی کا بل جمع کرنا تھا اور اندیشہ تھا کہ اگر اس دن بل جمع نہ ہوا تو وہ بجلی، جو پہلے ہی سے بند ہے، وہ بھی کٹ جائے گی۔ باہر نکلا تو پتہ چلا کہ آٹو رکشا والوں نے ہڑتال کر رکھی ہے۔ چار و ناچار ایک سائیکل رکشا پر سوار ہو کر بجلی کے دفتر تک گیا۔ وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ بجلی کی خرابی کی وجہ سے کمپیوٹر سسٹم خراب ہو گیا ہے۔ جب تک کمپیوٹر ٹھیک نہیں ہوگا تب تک بل جمع نہیں ہو سکتا۔ مجبوراً ایک گھنٹہ تک لائن میں کھڑا رہا۔ مجھے رہ رہ کر عبداللطیف کا خیال آتا رہا کہ اس کے گھر میں کہرام مچا ہوگا اور یہ کہ اب اس کی میت کو غسل دیا جا رہا ہوگا اور کیا عجب کہ اس مقصد کے لئے بھی منرل واٹر کے کنستر منگوائے گئے ہوں۔ لعنت ہے اس شہر پر جہاں میت کو غسل دینے کے لئے بھی منرل واٹر کا سہارا لینا پڑ جائے۔ خیر بجلی کا بل جمع کر کے باہر نکلنے تک ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے نہایت عجلت میں ایک ہڑتالی آٹو رکشا ڈرائیور کے آگے ہاتھ جوڑے، اسے اپنے ایک عزیز ترین دوست کے مرنے کا حوالہ دیا۔ بالآخر اس کی سوئی ہوئی انسانیت جاگ اٹھی اور وہ دوگنے کرایہ پر مجھے لے چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ہڑتالی آٹو رکشا ڈرائیوروں کی نظریں بچا کر پہلے تو وہ گلیوں میں چلتا رہا۔ پھر سڑک پر آیا تو ہڑتالیوں نے اس کے پہیوں کی ہوا نکال دی، مرتا کیا نہ کرتا، میں نے منت سماجت کر کے قبرستان کی طرف جانے والے ایک موٹر نشین کو روکا اور اس سے لفٹ لے لی۔ آخر کار جب میں قبرستان میں پہنچا تو اس وقت تک عبداللطیف کی میت نہ صرف قبر میں اتاری جا چکی تھی بلکہ اس پر مٹی کی آخری تہہ جمائی جا رہی تھی۔ مجھے بے حد دکھ ہوا کہ میں اپنے ایک بے لوث دوست کا آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔ لوگوں نے بتایا کہ دفن کے وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے بچوں کو بادیدۂ نم پرسہ دیا اور چلا آیا۔ کئی دنوں تک عبداللطیف کی شکل میری آنکھوں میں گھومتی رہی۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے آج بھی اس کی آخری رسومات میں بروقت شرکت نہ کر سکنے کا افسوس ہے۔

مگر کل رات جب عبداللطیف مرحوم کا فون میرے پاس آیا تو میری ندامت اور شرمندگی کا پارہ ساتویں آسمان پر چڑھ گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''عبداللطیف! میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں کہ میں تمہاری آخری رسومات میں شرکت کے لئے اس وقت پہنچا جب تمہاری قبر مٹی سے پاٹ دی گئی تھی اور میں تمہارا آخری دیدار بھی نہ کر سکا۔ اس بات کا بڑا قلق ہے کہ

میں اپنے ایک عزیز ترین دوست کا آخری دیدار بھی نہ کرسکا۔ تمہارے جانے سے میری زندگی میں جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ کبھی پُر نہ ہوگا، تم جیسا مخلص دوست اب کہاں ملے گا۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ مشیت ایزدی کو یہی منظور تھا۔ تم بھی صبر کرو اور میں بھی صبر کرتا ہوں۔ ان اللہ مع الصابرین۔"

میری بات کو سن کر عبداللطیف نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا "یار! تم جو بھی بات کرتے ہو نرالی کرتے ہو، مرنے والے کا پُرسہ عموماً اس کے لواحقین کو دیا جاتا ہے اور ان سے صبر کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ غالباً تم پہلے آدمی ہو جو مرنے والے کو بالمشافہ پُرسہ دے رہے ہو۔ میں نے بھی زندگی میں بہت سے پُرسے دیے ہیں۔ کیا میں نہیں جانتا کہ پُرسہ دینے والے کے دل میں کیا بات ہوتی ہے اور اُس کی زبان پر کیا ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا بالکل دکھ نہیں ہے کہ تم میری آخری رسومات میں بروقت نہیں پہنچے۔ میں تو ہمیشہ سے ہی کہتا رہا ہوں کہ دہلی بڑی کُتی چیز ہے۔ یہاں آدمی نہ تو چین سے زندہ رہ سکتا ہے اور نہ ہی اپنے مرنے کے لئے کسی موزوں وقت کا انتخاب کرسکتا ہے۔ وہ تو میرا ہی قصور تھا کہ میں نے مرنے کے لئے ایسے دن کا انتخاب کیا، جب دہلی میں بارہ گھنٹوں سے بجلی غائب تھی اور اوپر سے آٹو رکشا والوں نے بھی ہڑتال کر رکھی تھی۔ اس کے باوجود تمہارا میری آخری رسومات میں آنا ایسا ہی ہے جیسے پہاڑ کو کاٹ کر دودھ کی نہر لانا۔ بھئی۔ 'لانگ ڈسٹنس کال' میں بہت سی باتیں نہیں کہی جاسکتیں۔ میں پھر کبھی فون کروں گا۔" میں نے کہا "یہ تو بتاؤ کہ دوسری دنیا میں تمہارا کیا حال ہے؟۔ جنت میں داخل ہوگئے ہو یا جنت کے دروازے پر بیٹھے میرے آنے کا انتظار کر رہے ہو، جس طرح کافی ہاؤس کے باہر تم میرے آنے کا انتظار کیا کرتے تھے تاکہ میں آجاؤں تو میرے ساتھ کافی ہاؤس میں داخل ہوسکو اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ کیا دوسری دنیا میں بھی موبائل فون رکھنے کی سہولت ہے۔" عبداللطیف نے پھر قہقہہ لگا کر کہا "بھیا! یہاں تو روحانی فون کی سہولت موجود ہے۔ میں تم سے بات بھی صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ تمہارا فون کل سے ڈیڈ ہے، اگر تمہارا فون اچھا رہتا تو شاید میں تم سے بات نہ کر پاتا۔"

عبداللطیف کے اس انکشاف کو سنتے ہی میری نیند اچانک اُچٹ گئی۔ گھڑی دیکھی تو رات کے تین بج رہے تھے۔ میں نے فون کا ریسیور اٹھایا تو وہ سچ مچ ڈیڈ تھا۔ یاد آیا کہ ایک دن پہلے ہی میں نے ٹیلی فون ایکسچینج میں اپنے فون کے ڈیڈ ہونے کی شکایت درج کرائی تھی۔ اس کے

بعد بڑی دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ اس لئے کہ ایک عرصہ بعد عبداللطیف مرحوم کی محبت سے لبریز باتیں سن کر میں نہال ہو گیا تھا۔ دوسرے دن صبح صبح میں بطور خاص ٹیلی فون ایکسچینج گیا اور ایک دن پہلے لکھوائی ہوئی اپنی شکایت واپس لے لی۔ ایکسچینج والوں کو تاکید کی کہ وہ میرا فون ٹھیک نہ کریں بلکہ ڈیڈ ہی رہنے دیں۔ جب انہوں نے حیرت سے اپنی آنکھیں پھاڑ کر میری اس نامعقول تاکید کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا ''میرے فون کے ڈیڈ رہنے کی وجہ سے میرے پاس ڈیڈ لوگوں کے یعنی مرحومین کے فون آنے لگے ہیں۔ میرے سارے اچھے دوست اب دوسری دنیا میں آباد ہیں۔ ان سے اتنا 'لانگ ڈسٹنس رابطہ' رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ میں اپنے فون کو ڈیڈ رکھوں۔ یوں بھی میں زندہ لوگوں کے ٹیلی فون کال سے تنگ آچکا ہوں کیونکہ ان کی باتوں میں اب زندگی کم اور مردنی زیادہ پائی جاتی ہے۔ کیوں نہ میں مردہ لوگوں کی زندہ باتیں سنوں۔'' وہ لوگ مجھے حیرت سے دیکھنے لگے تو میں وہاں سے واپس چلا آیا۔

روزنامہ ''سیاست'' (اگست ۲۰۰۳ء)

پانی۔ ۲۰۵۰ء میں
(ایک فینٹیسی)

دنیا نے ترقی کی دوڑ میں جب تیل کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا اور پانی کو پوچھنے والا کوئی نہیں رہا تو پانی اپنی اس بے عزّتی پر خود شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ نل تو خیر پہلے ہی سے سوکھ گئے تھے، دریا بھی سوکھ گئے۔ یہی نہیں زیرِ زمین پانی کی سطح کچھ اتنی نیچے چلی گئی کہ لاکھ کھودنے پر تیل تو نکل آتا تھا لیکن پانی نہیں نکلتا تھا۔ ماہرین ارضیات کو یہ اندیشہ بھی ستانے لگا کہ زیرِ زمین پانی کی تلاش میں اگر قطب شمالی سے کُرہ ارض کے اندر بورویل کے ذریعہ سوراخ کرتے چلے جاؤ تو یہ سوراخ کہیں ایک دن قطب جنوبی سے باہر نہ نکل آئے۔ اس طرح زمین کے محور اور اس کی گردش میں فرق پڑنے کا اندیشہ تھا۔ انسان نے پانی پینے کے جو برتن جیسے گلاس، لوٹے، صراحی اور جگ وغیرہ بنائے تھے وہ سب بے کار ہو گئے۔ غریب لوگ ڈراپروں اور امیر لوگ چمچوں کی مدد سے پانی پینے لگے۔

ایسے میں ایک دن ایک ڈاکٹر کے مطب پر ایک مریض آیا۔ مریض نے بتایا کہ اس کی پیٹھ پر کوئی چیز اُبھرنے لگی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس اس سے پہلے ایسا کوئی مریض نہیں آیا تھا جس کی پیٹھ پر اُبھار ہو۔ ڈاکٹر نے سوچا کہ شاید اس مریض کی ریڑھ کی ہڈی میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے جو اُبھر کر جسم سے باہر نکل جانا چاہتی ہے۔ ہڈیوں کے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ مریض کو ہی نہیں ڈاکٹر کو بھی شبہ ہونے لگا تھا کہ کہیں یہ کینسر نہ ہو۔ دنیا بھر کے طبّی معائنوں کے بعد ڈاکٹر اس نتیجہ پر

پہنچے کہ یہ کینسر نہیں ہے بلکہ کوئی اور چیز ہے۔ کیا چیز ہے یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ لہٰذا ڈاکٹروں نے اس پر مزید تحقیق شروع کر دی کیونکہ اسی میں طب کی ترقی اور مریض کی بربادی مضمر تھی۔ جوں جوں مریض کی پیٹھ کا اُبھار بڑھنے لگا ڈاکٹروں کا تجسس بھی بڑھتا چلا گیا۔ ایک دن ایک ڈاکٹر نے مریض کی عادات واطوار کو جاننے کی خاطر اس سے طرح طرح کے سوالات پوچھنے شروع کر دیے۔ مریض سے پوچھا۔ ''تم کھاتے کیا ہو؟''۔

مریض بولا ''ایک زمانہ میں فائیو اسٹار ہوٹلوں میں دن بھر مرغن غذائیں ہی کھاتا رہتا تھا مگر ادھر بھوک بالکل غائب ہو گئی ہے۔ کئی کئی دن نہیں کھاتا۔''

ڈاکٹر نے پوچھا ''تم پیتے کیا ہو؟''

مریض بولا ''پیتا تو بہت کچھ تھا لیکن ادھر پیاس بالکل ختم ہو گئی ہے۔ ایک اعتبار سے یہ اچھا ہی ہے کیونکہ ان دنوں پانی بھی تو نہیں ملتا۔''

مریض کے اس جواب کے بعد ذہین ڈاکٹر نے دوسرے ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔ دوسرے نے تیسرے سے اور تیسرے نے چوتھے سے۔ پھر دنیا کے سارے بڑے ڈاکٹروں نے مل کر اس مریض کے ابھار کے بارے میں غور کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر ایک دن وہ متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس مریض کی پیٹھ پر جو اُبھار نکل آیا ہے وہ کینسر نہیں ہے بلکہ وہ کوہان ہے جو آج بھی اونٹ کی پیٹھ پر پایا جاتا ہے۔ یہ وہ کوہان ہے جو ہزاروں برس پہلے اصلاً انسان کی پیٹھ پر پایا جاتا تھا لیکن آدمی نے بڑی چالاکی سے اسے اونٹ کی پیٹھ پر لاد دیا۔ ہر جاندار اپنے طبعی و جغرافیائی حالات اور ماحول کے مطابق اپنی جسمانی ساخت کو حسبِ ضرورت تبدیل کرتا رہتا ہے۔ صحراؤں میں رہنے والے اونٹ کو جب کئی دنوں تک کھانے اور پینے کو کچھ نہیں ملنے لگا اور ہر چیز انسان ہی ہڑپ کرنے لگا تو قدرت نے ازراہ عنایت اونٹ کے جسم میں ایک کوہان کی گنجائش پیدا کر دی۔ چنانچہ اونٹ بیشتر اشیائے خورد و نوش کو اپنے ہاضمہ کے نظام میں جانے نہیں دیتا بلکہ انھیں ازراہِ قناعت بڑے جتن کے ساتھ اپنے کوہان میں اس خیال سے محفوظ کر لیتا ہے کہ داشتہ آید بکار۔ یوں سمجھئے کہ اونٹ کی ''شخصیت'' میں کوہان کی حیثیت ڈیپ فریز (Deep Freeze) کی سی ہوتی ہے جہاں چیزیں بڑی دیر تک محفوظ رکھی جا سکتی ہیں۔ اونٹ جب بھی غذائی بحران اور شدید پیاس میں مبتلا ہو جاتا ہے تو نہایت کفایت شعاری کے ساتھ اس کوہان میں سے غذا اور پانی کو نکال کر استعمال

کر لیتا ہے اور ایک لمبے عرصہ تک کچھ کھائے پئے بغیر ہنسی خوشی زندہ رہ لیتا ہے۔ ڈاکٹروں کو جب مریض کے اُبھار کی اصلیت کا پتہ چلا تو ایک ڈاکٹر نے مریض کو پکار کر کہا ''میاں! مبارک ہو۔ تمہاری پیٹھ پر ایک کوہان نکل آیا ہے، جس طرح اونٹ کی پیٹھ پر ہوتا ہے۔ اب تم بھوک اور پیاس کی طلب سے آزاد ہو جاؤ گے۔''

یہ سنتے ہی مریض نے ایک چیخ ماری اور گھبراہٹ میں بولا ''کیا میں اونٹ بن جاؤنگا؟''

''اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے بلکہ یہ تو اچھی بات ہے۔''

''مگر اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی''

''مگر انسان کی کوئی کل سیدھی ہو تو بتاؤ۔ وہ تو اونٹ سے کہیں زیادہ بے ڈھنگا، بدوضع، بے کل اور بد معاملہ ہوتا ہے۔ ایک زمانہ میں انسان نہایت صابر وشاکر ہوا کرتا تھا۔ قناعت کرنے والا، فقر وفاقے اور توکل کی زندگی گذارنے والا، لیکن جب انسان کو حرص، لالچ اور ہوس نے گھیر لیا اور وہ دنیا کی ہر چیز کو اپنے تصرف میں لانے لگا تو مجبوراً اونٹ نے ان صفات کو اپنا لیا جنھیں کبھی انسان کا طرّہ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ آج کے دور میں جتنی انسانیت اونٹ میں پائی جاتی ہے اتنی تو خود انسان میں دکھائی نہیں دیتی۔ پھر تمہارے لئے تو یہ سہولت ہوگی کہ یہ جو دن بھر میں پانچ چھ لیٹر پانی پی جاتے ہو اسے بار بار پینے کی ضرورت لاحق نہیں ہوگی۔ مہینوں پیاسے رہ سکو گے۔ سال چھ مہینوں میں کبھی بارش ہو جائے تو غٹا غٹ گیلنوں پانی پی لینا اور پھر لمبے عرصہ تک پیاس سے چھٹی۔ اسے تم کوہان کیوں سمجھتے ہو۔ اسے اپنے جسم کا 'Over head Tank' سمجھ لو۔''

اتنے میں ایک ڈاکٹر نے مریض کی گردن کی طرف اشارہ کر کے کہا ''اس کی تو گردن بھی لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ انشاء اللہ چند دنوں میں پانی کے ایک بڑے پائپ کی شکل اختیار کر لے گی''۔ مریض نے کہا ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا سر میرے جسم سے کافی دور چلا جائے گا۔ اس طرح تو مجھے اپنے دماغ کا استعمال کرنے میں بڑی دیر لگ جائے گی۔'' ڈاکٹر نے کہا ''انسان صدیوں سے اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ اپنے دماغ کا صحیح استعمال بھی کرتا ہے۔ اگر دماغ کا استعمال کرتا تو آج دنیا میں پانی کی اتنی قلت کیوں ہوتی۔ علامہ اقبال نے بہت پہلے کہا تھا۔

لازم ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

مریض نے کہا" اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں اپنے پاسبانِ عقل کو اپنے دل سے چھ سات فیٹ کی اونچائی پر تنہا چھوڑ دوں گا۔" ڈاکٹر نے کہا" اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔تم کم از کم اپنے دماغ کا شیطانی استعمال تو نہ کر سکو گے۔"

یہ سنتے ہی مریض ایک سچے اونٹ کی طرح دائیں کروٹ بیٹھ گیا اور اپنے کوہان میں سے تھوڑا سا پانی نکال کر پینے لگا کیونکہ اسے یہ سن کر بہت پیاس لگی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دنیا میں پانی کی قلت اتنی بڑھی کہ رفتہ رفتہ سارے ہی انسانوں کی پیٹھوں پر کوہان نکل آئے اور یوں انسان اونٹوں کی طرح اور اونٹ انسانوں کی طرح نظر آنے لگے۔تاریخ اسی طرح تو اپنے آپ کو دہراتی ہے۔

☆

جب سارے دریا سوکھ گئے اور ان کے دامن میں پانی کا ایک قطرہ بھی دکھائی نہیں دینے لگا تو زمینوں کا کاروبار کرنے والوں کی نظر دریاؤں کی خالی اراضی پر پڑی اور لینڈ مافیا Land Mafia کے لوگوں نے جو پہلے ہی سے دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتے ہیں،اس خالی اراضی پر ناجائز قبضہ کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ایک زمانہ تھا جب بادشاہ اپنی یادگار کے طور پر" لاٹ" کھڑی کر دیتے تھے(حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو اشوک کی لاٹ اور قطب صاحب کی لاٹ)۔لینڈ مافیا والوں نے دریاؤں کی خالی اراضی پر کوئی لاٹ تو کھڑی نہیں کی البتہ اس پر" پلاٹ" پھیلانے شروع کر دیئے۔ زن،زر اور زمین انسان کی پرانی کمزوریاں ہیں۔لہٰذا پلاٹوں کا کاروبار ہمیشہ سے ہی نہایت فائدہ بخش سمجھا جاتا رہا ہے۔ پہلے قبرستانوں اور بیکسوں کی اراضی پر ناجائز قبضے کئے جاتے تھے، اب دریاؤں کی چھوڑی ہوئی لاوارث اراضی میسر آئی تو لینڈ مافیا والوں کی چاندی ہوگئی۔ جب دریاؤں کی اراضی پر بڑی بڑی ہاؤزنگ کالونیاں بن گئیں تو ایک دن دنیا کے بڑے ممالک کی حکومتوں کو خیال آیا کہ چند برس پہلے انہوں نے براعظموں کی ساری بڑی ندیوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر پانی کا ایک بڑا ذخیرہ بنانے کا منصوبہ بنایا تھا مگر اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ دریاؤں کی اراضی پر تو لینڈ مافیا کا قبضہ ہوگیا تھا۔ اتنی بڑی اور لمبی قانونی لڑائی لڑنے اور ناجائز قبضوں کو برخاست کرانے کے لئے ہزاروں برس لگ سکتے تھے۔اسی لئے حکومتوں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اس لئے بھی توجہ نہ دی کہ بھلے ہی دنیا میں پانی نہ ہو دھرتی کے نیچے تیل

تو ہے۔ صدیوں سے انسان اس دھرتی پر ''پانی کی تہذیب'' جیتا آیا ہے لیکن اس نے ''تیل کی تہذیب'' کو اپنا لیا ہے جس کی مدد سے اس نے ایک تیز رفتار ٹکنالوجی ایجاد کرلی ہے۔ ماضی کی دنیا بتدریج ترقی کی جتنی منزلیں ایک ہزار سال کے عرصہ میں طئے کرتی تھی اب وہی منزلیں ایک ہی دن میں طئے کی جانے لگی ہیں۔ لہٰذا انسان اب دوسرے سیاروں سے پانی منگوایا کرے گا۔ پانی کے جو ٹینکر پہلے شہروں کی میونسپلٹیوں کی جانب سے سربراہ کئے جاتے تھے اب دوسرے سیاروں سے آیا کریں گے۔ ذرا سوچئے کہ کائنات کتنی چھوٹی ہو جائے گی مگر یہ بھی تو سوچئے کہ پانی کی ایک بوند اب کتنی نایاب ہوگئی ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۸ رمئی ۲۰۰۳ء)

کیا حال ہے جناب کا؟

پچھلے دنوں میں دہلی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں اپنے ایک جاپانی دوست سے ملنے کے لیے پہنچا اور ان کے کمرے تک جانے کی خاطر ہوٹل کی خوشنما اور سجی سجائی لابی کے سامنے سے گزرنے لگا تو ایک صاحب، جو لابی کے نہایت آرام دہ اور شاندار صوفے کے اندر تقریباً دھنسے ہوئے تھے، مجھے دیکھ کر فوراً کھڑے ہو گئے اور لپک کر میری طرف چلے آئے۔ میں نے انہیں بغور دیکھا تو یہ میرے پرانے دوست پردیپ چوپڑہ نکلے۔ ادھر دس برسوں میں اپنے اپنے حالات کی وجہ سے ہم دونوں کی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ دس برس پہلے پردیپ کے صرف کنپٹی کے بال سفید تھے لیکن اب سارا سر سفید ہو گیا ہے۔ اس لئے مجھے انہیں پہچاننے میں تھوڑا سا تکلف ہوا۔ نوجوانوں کی سی گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے بغلگیر ہوتے ہوئے پردیپ نے کہا ''یار! تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ اب تو تمہارے ہاتھ میں چھڑی بھی آ گئی ہے۔ رفتار اتنی سست ہو گئی ہے کہ لگتا ہے تم اپنے آخری سفر پر جا رہے ہو۔'' یہ کہہ کر پردیپ چوپڑہ نے حسب معمول زوردار قہقہہ لگایا۔ میں نے کہا ''یار چوپڑہ! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ آدمی اپنے آخری سفر پر اچانک چلا جاتا ہے۔'' چوپڑہ نے کہا ''وہ تو ہے لیکن اس کے اچانک چلے جانے سے پہلے اس کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ کیسے بتاؤں کہ ایک لمبے عرصہ بعد تم سے مل کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ تم جیسا پھرتیلا اور لپک جھپک والا آدمی اور اس کے ہاتھ میں چھڑی!۔ دنیا میں یہ کیا ہو رہا ہے یار!۔'' میں نے کہا ''یار چوپڑہ! وقت بدل گیا لیکن چکنی چپڑی باتیں کرنے کا تمہارا انداز نہیں بدلا۔ میں پہلے بھی کہتا تھا کہ تم محض

چکنی چپڑی باتیں کرنے کی وجہ سے چوپڑہ کہلاتے ہو۔اچھا یہ بتاؤ تمہارا کیا حال ہے؟۔'' یہ سنتے ہی چوپڑہ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔بولا'' میں یہی چاہتا تھا کہ تم میرا حال پوچھو تو تمہیں اپنا حال سناؤں۔مگر حال اتنا لمبا ہے کہ وہ لابی میں کھڑے کھڑے نہیں بتایا جا سکتا۔مجھے ہوٹل کے کیفے ٹیریا میں لے چلو۔کافی اور کھانے کے لئے کچھ منگاؤ تو وہاں بیٹھ کر تمہیں اپنا حال سناتا ہوں۔'' میں نے کہا'' مجھے اصل میں ایک جاپانی دوست سے ملنا ہے جو اسی ہوٹل میں رُکا ہوا ہے۔اس سے گیارہ بجے کا وقت طے ہے اور اب گیارہ بجنے میں دس منٹ رہ گئے ہیں۔میں پھر کبھی فرصت میں تمہارا حال سن لوں گا۔''بولا'' فرصت نہ تمہارے پاس ہے اور نہ میرے پاس۔حالانکہ ہم دونوں کے پاس اب کوئی قابل لحاظ مصروفیت نہیں رہ گئی ہے۔میرا حال ابھی سن لو تو اچھا ہے۔بعد میں فرصت ملے یا نہ ملے۔''میں نے پھر اپنی مجبوری بتائی تو بولا'' تمہاری جیب میں اس وقت کتنے پیسے ہیں؟''۔میں نے کہا'' دو سو روپئے ہوں گے اور وہ بھی واپسی میں ٹیکسی کے کرایہ کے لئے رکھے ہیں۔''بولا''یوں کرو۔اس میں سے سو روپئے مجھے دیدو۔واپسی میں ٹیکسی کے بجائے آٹو رکشا میں چلے جانا۔اس طرح تمہیں میرا حال بھی معلوم ہو جائے گا اور میں کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر کافی پی لونگا۔''

چونکہ مجھے وقت کی تنگی کا احساس تھا اس لئے میں نے فوراً سو روپئے اُسے نکال کر دے دیئے اور یوں مجھے پردیپ چوپڑہ کا حال اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا۔بارہ تیرہ برس پہلے تک پردیپ چوپڑہ بے حد خوشحال آدمی تھا۔بڑی جائیدادتھی اُس کی۔بڑا دل والا آدمی تھا۔مگر ایک سڑک حادثہ میں جب اس کی بیوی اور تینوں بیٹوں کی موت واقع ہو گئی تو اس کے اندر جینے کی خواہش تو ختم ہو گئی لیکن اُس نے اپنے جینے کا انداز نہیں بدلا۔درمیان میں ایک دوست نے بتایا تھا کہ اس نے اپنی ساری جائیداد بیچ دی ہے اور اب ایک چھوٹے سے مکان میں کرایہ پر رہتا ہے۔سارا دن فائیو اسٹار ہوٹلوں کی لابیوں میں بیٹھا رہتا ہے اور ایک دن ایسی ہی کسی لابی سے دوسری دنیا کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔غرض کئی دنوں سے پردیپ چوپڑہ میرے ذہن پر سوار ہے۔اگر میں اس کا حال نہ پوچھتا تو بہتر ہوتا بلکہ اسے ٹیکسی کے کرایہ میں سے سو روپئے دیدینے کے بعد تو مجھے خود اپنا حال بھی اچھا نہیں لگا۔

اس واقعہ کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ جو ہم لوگ دن بھر ایک دوسرے کا حال پوچھتے

اور ایک دوسرے کی خیریت جاننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں وہ صرف ایک رسمی حرکت ہے۔ نہ کوئی اپنا اصلی حال بتاتا ہے اور نہ ہی کسی کو آپ کا حال جاننے میں دلچسپی ہوتی ہے۔ جس کسی سے پوچھیئے وہ یہی کہے گا ''اچھا ہوں۔ خیریت سے ہوں۔'' ہر آدمی پردیپ چوپڑہ جیسا سچا اور کھرا آدمی تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ ایک بار راستہ میں سامنے سے آتے ہوئے میرے ایک دوست نے پوچھا ''کہو یار کیسے ہو؟ کس حال میں ہو؟''۔ میں نے کہہ دیا ''خدا کے فضل سے اچھا ہوں''۔ اُس نے قریب آکر ہاتھ ملایا تو بولا ''یار! تمہیں تو بڑا تیز بخار ہے۔'' میں نے کہا ''وہ تو ہے۔'' پوچھا ''کب سے ہے؟'' میں نے کہا ''ایک ہفتہ سے ہے''۔ پوچھا ''علاج کرا رہے ہو یا نہیں؟''۔ میں نے کہا ''ڈاکٹر کے پاس ہی سے تو آ رہا ہوں''۔ بولا ''یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ پھر بھی تم کہہ رہے ہو کہ تم خیریت سے ہو، اسے خیریت کہتے ہیں!''۔ میں نے کہا ''یار! ابھی تک زندہ ہوں۔ یہ کوئی معمولی خیریت ہے۔ تیز بخار کے باوجود چل پھر رہا ہوں۔ تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ کیا اسے خیریت نہیں کہتے۔ آج کے زمانہ میں کسی کے حصّہ میں اتنی بھی خیریت آجائے تو یہ بڑی بات ہے۔'' اور میرے اس جواب کو سن کر میرا دوست مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔

ایک زمانہ تھا جب آدمی آپ سے ایک تعلقِ خاطر کی وجہ سے آپ کا حال پوچھتا تھا۔ اب حال پوچھنا رسمی سی بات ہوگئی ہے۔ نہ وہ آپ کے حال کو بہتر بنا سکتا ہے اور نہ ہی اپنا حال آپ کو بتانا چاہتا ہے۔ جن دنوں آدمی بڑے شہروں میں نہیں رہتا تھا تو قصبے کی چوپال میں اسے سب کی خیریت اپنے آپ ہی معلوم ہو جاتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ کرید کرید کر آپ کا حال پوچھتا اور آپ کے حال کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا۔ پچھلے دنوں میں اپنے ایک دوست کے ساتھ عجلت میں کہیں جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک اور دوست آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے اس سے رسماً پوچھ لیا ''کہو کیا حال ہے؟''۔ خلافِ توقع وہ بولا ''بہت بُرے حال میں ہوں۔ تم ذرا دیر کو رُکو تو تمہیں اپنا حال بتاتا ہوں''۔ میں نے کہا ''اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے''۔ یہ کہہ کر میں آگے کو نکل گیا تو میرے ساتھ جو دوست موجود تھا اس نے پوچھا ''یہ تو ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ والی بات ہوگئی۔ وہ بیچارا کہہ رہا ہے کہ اس کا حال اچھا نہیں ہے اور تم خدا کا شکر ادا کر رہے ہو۔ یہ کیا بات ہوئی۔'' میں نے کہا ''میں تو اس پر یہ آفاقی نکتہ واضح کرنا چاہ رہا تھا کہ حالات چاہے کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں آدمی کو ہر دم راضی بہ رضا، صابر و شاکر اور قانع رہنا چاہئے۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ ہم ایک

ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ اگر وہاں وقت پر نہ پہنچے تو خود ہمارا حال خراب ہو سکتا ہے۔ ایسے میں اس کا حال جان کر میں کیا کر لیتا۔''

آپ نے اُس افیونی کا قصہ تو ضرور سنا ہوگا جو افیون کے نشے میں دُھت کہیں جا رہا تھا کہ اسے ایک مین ہول میں سے ایک آدمی کے چلّانے کی آواز آئی ''مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ''۔ افیونی ازراہِ تجسس مین ہول کے قریب تو گیا، اندر جھانک کر آدمی کو دیکھا، پھر خود اپنی حالت کا جائزہ لے کر بولا ''میاں جہاں بھی رہو خوش رہو''۔ یہ کہہ کر وہ آگے کو نکل گیا۔ ہم لوگ جو دن بھر ایک دوسرے کا حال پوچھتے رہتے ہیں تو اس استفسار کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہمیں تو وہ دو اصحاب بہت اچھے لگے تھے جن کی سماعت بالکل ناکارہ ہو چکی تھی اور دونوں ہی کسی کی بات سن نہیں سکتے تھے۔ ایک بار ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو ایک نے کہا ''کہو میاں کیا حال ہے؟''۔ دوسرا بولا ''دودھ لینے جا رہا ہوں''۔ پہلا بولا ''آج موسم اچھا ہو گیا ہے''۔ دوسرا بولا ''تم نے ٹھیک کہا جب سے پانی کی قلت ہو گئی ہے تب سے گوالوں نے دودھ میں پانی ملانا چھوڑ دیا ہے''۔ پہلے نے پوچھا ''تمہارے بچے کیسے ہیں؟''۔ دوسرے نے جواب دیا ''زیادہ تر دودھ کی لائن ہی میں رہتے ہیں''۔ اس کے بعد یہ دونوں ایک دوسرے کا حال اچھی طرح جان کر رخصت ہو گئے تھے۔

کبھی کبھار حال کے پوچھے جانے پر بعض لوگ بڑے دلچسپ جواب دے دیتے ہیں جیسے ہمارے ایک دوست پورے دس سال کے بعد کہیں نظر آ گئے تو ہم نے پوچھا ''بتاؤ کیا حال ہے تمہارا؟''۔ بولے ''پہلے سے بہتر ہوں۔'' اب ہم حیران ہیں کہ اس جواب کا کیا مطلب نکالیں۔ اس کا مطلب جاننے کے لئے اُن سے ہمارا یہ پوچھنا ضروری تھا کہ دس برس پہلے ان کا حال کتنا خراب تھا اور اب اگر بہتر ہے تو کتنا بہتر ہے۔ لیکن ہمارے پاس یہ سب کچھ پوچھنے کا وقت نہیں تھا اسی لئے خاموش رہ گئے۔ اگر وہ پہلے سے بہتر ہیں تو رہا کریں ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔

روزنامہ ''سیاست'' (۳؍اگست ۲۰۰۳ء)

اولاد کا سُکھ اور ماں باپ کا دُکھ

پچھلے ہفتہ ایک تہذیبی پروگرام میں شرکت کے بعد ہم اپنی مجبوری کے مطابق خراماں خراماں آڈیٹوریم سے باہر نکلنے کی کوشش کررہے تھے کہ پیچھے سے ایک خاتون نے ہمیں مخاطب کر کے کہا'' بیٹا! میں ذرا جلدی میں ہوں۔ مجھے آگے نکلنے کا راستہ دو۔'' ہم نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو پینتیس چالیس برس کی ایک خاتون نظر آئیں جو دونوں ہاتھوں میں سامان کی تھیلیاں پکڑے بعجلت ممکنہ باہر نکلنے کی خواہشمند تھیں۔ ہم نے راستہ دیا تو خاتون نے ہمیں اور ہم نے موصوفہ کو دیکھا۔ کم وبیش بیس برس بعد کسی نے ہمیں بیٹا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس طرزِ تخاطب نے ہمیں سرشار کر دیا تھا کیونکہ ادھر ایک عرصہ سے لوگ ہمیں 'انکل' کہہ کر مخاطب کرنے لگے ہیں بلکہ بعض تو ایسے ہیں جو ہمیں 'نانا جان' پر بھی ٹرخانے لگے ہیں۔ اگر چہ ہم سڑسٹھ اڑسٹھ برس کے ہو چکے ہیں اور اس عمر میں اگر کسی کو پینتیس چالیس برس کی والدہ میسر آجائے تو یہ قدرت کی کوئی معمولی دین نہیں ہے۔ ذرا سوچئے کہ اس عمر میں 'ممتا کا پیار' کسے ملتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تیس پینتیس برس پہلے تک ہمیں 'ممتا کا پیار' ضرور حاصل تھا مگر یہ سب قصہ پارینہ ہے۔ زندگی کے سفر میں اور طرح کے پیار تو ہمیں ضرور ملے لیکن 'ممتا کے پیار' والی بات کسی میں نہ آئی۔ بہر حال ہم نے خوشی خوشی اُن محترمہ کو آگے جانے کا راستہ دیا تو خاتون نے ہمیں دیکھنے اور ہمارا جائزہ لینے کے باوجود جاتے جاتے ہمارے بڑھاپے کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کی غرض سے کہہ دیا'' تھینک یو بیٹا! جیتے رہو، خوش رہو اور پھولو پھلو''۔ اس وقت ہمارے ساتھ ایک اور عمر رسیدہ دوست بھی تھے جو اس صورتحال

کو دیکھ کر ہنستے ہوئے کہنے لگے" یار! عجیب بات ہے کہ ایسے دلچسپ کردار تم سے ہی ٹکراتے ہیں"۔
ہم نے اپنے دوست کی بات ان سنی کر دی اس لئے کہ اُس وقت ہم 'ممتا کے پیار' کے زیرِ اثر خاصے گمبھیر ہو چکے تھے۔ ہم نے کہا" یار! یہ ہنسنے کا موقع نہیں ہے۔ کتنے ہی برس بعد کسی نے ہمیں بیٹا کہہ کر پکارا ہے۔ ہمیں تو اپنی ماں کی لوریاں یاد آنے لگی ہیں۔ وہ دن یاد آنے لگے ہیں جب ماں ہمیں اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلانے کی کوشش کرتی تھیں اور ہم بار بار بھاگ جایا کرتے تھے۔ وہ اُوٹ پٹانگ کہانیاں یاد آنے لگی ہیں جو وہ ہمیں سنایا کرتی تھیں۔ ہمیں اسکول سے گھر واپس آنے میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تھی تو ماں کی وہ نظریں یاد آنے لگی ہیں جو گھر کے دروازے کی دہلیز پر ہمارے انتظار میں بچھی رہتی تھیں"۔ بہر حال اپنے بچپن کی یادوں میں کھوئے کھوئے ہم آڈیٹوریم سے باہر آئے تو دیکھا کہ خاتون ایک موٹر کے پاس کھڑی تھیں جس میں پانچ چھ بچے ٹھنسے ہوئے تھے۔ ایک بچہ تو خاتون کے پاؤں سے لپٹا ہوا تھا اور خاتون اُس سے کہہ رہی تھیں" بیٹا! پہلے مجھے اندر تو جانے دو۔ پھر میں تم سب کو ٹافیاں دونگی"۔ ظاہر ہے کہ یہ موٹر خاتون کو پروگرام سے واپس لے جانے کے لئے آئی تھی اور یہ سارے بچے موٹر میں اپنی ماں کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے دوست نے یہ منظر دیکھا تو کہا" اب سمجھ میں آیا کہ اس خاتون نے تم جیسے بڈھے کو 'بیٹا' کیوں کہا۔ جس عورت کے چھ سات شریر بچے ہوں اُسے تو دن میں کم از کم ہزار مرتبہ 'بیٹا' کہنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہوگی۔ کیا عجب کہ وہ غفلت میں اپنے شوہر کو بھی 'بیٹا' کہہ کر بلاتی ہو"۔

اس خاتون کی مجبوری چاہے کچھ بھی رہی ہو ہمیں اُن کا 'بیٹا' کہہ کر مخاطب کرنا بہت اچھا لگا۔ عمر کے تعلق سے اگر آدمی کبھی کبھار ہی سہی خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے تو اچھا لگتا ہے۔ اگر وہ خاتون بزرگ بننا چاہتی ہیں اور ہمیں بچہ سمجھتی ہیں تو کیا قباحت ہے۔ ہمیں اس وقت ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ بیس بائیس برس پہلے دہلی کے نیشنل اسپورٹس کلب میں ہم مشہور اور بزرگ شاعر ساغؔر نظامی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایسی ہی ایک خاتون اچانک ساغؔر نظامی کے پاس آئیں اور ساغؔر صاحب سے کہا" بیٹا! تھوڑی دیر کے لئے اگر تم اپنا قلم دیدو تو عنایت ہوگی"۔ ساغر صاحب نے قلم تو دیدیا لیکن اس بات پر سخت خفا تھے کہ اُن سے تیس پینتیس برس چھوٹی ایک خاتون نے اُنھیں 'بیٹا' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ قلم تو اُس نے دو چار منٹ بعد ہی کلب کے بل پر دستخط کرنے کے بعد اُنھیں واپس کر دیا تھا لیکن ساغر نظامی کی ساری شام اُس خاتون کے طرزِ تخاطب نے برباد

کردی تھی۔ بعد میں ہم نے اُن کے موڈ کو ٹھیک کرنے کی غرض سے کہا" ساغر صاحب! ہوسکتا ہے کہ خاتون کے پیش نظر آپ کی اصلی عمر نہ ہو بلکہ اُس نے آپ کی شاعری کو سامنے رکھ کر آپ کو بیٹا کہا ہو"۔ فرمایا" کیا تم سمجھتے ہو کہ میں بچکانہ شاعری کرتا ہوں؟"۔ ہم نے کہا" ایسی بات نہیں ہے۔ یہ خاتون غالباً آپ کی اُس عشقیہ شاعری سے خوفزدہ ہے جس میں جوانی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے"۔ بہر حال وہ ہنس کر خاموش ہوگئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ چاہے کچھ بھی ہو اپنے آپ پر قبل از وقت بزرگی طاری کرنے والی ایسی خواتین ہمیں اُن خواتین سے بدرجہا بہتر نظر آتی ہیں جو چالیس پچاس برس کی لمبی عمر گذارنے کے باوجود اپنے آپ کو نہ صرف سولہ سترہ برس کی سمجھتی ہیں بلکہ حرکتیں بھی ایسی ہی کرتی ہیں۔

ماں باپ کے پیار اور اولاد کے سُکھ پر لیجئے ہمیں اپنے یارِ طرحدار اوتار سنگھ جج یاد آ گئے۔ اوتار سنگھ جج نہایت بذلہ سنج ہونے کے علاوہ قلندر صفت انسان بھی ہیں۔ اوتار سنگھ جج کے والدین بچپن میں ہی گذر گئے تھے۔ رشتہ داروں نے جیسے تیسے انھیں پالا پوسا۔ نتیجہ میں اوتار سنگھ جج اپنے آپ ہی گھبرا کر بڑے ہوگئے۔ پچیس برس پہلے دہلی کے مرحوم کافی ہاؤس میں اُن سے ہماری روز ہی ملاقات ہوا کرتی تھی کافی ہاؤس میں دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر جوگیندر سنگھ بھی آیا کرتے تھے جو خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور اُنھوں نے لمبی عمر کے باوجود شادی نہیں کی تھی۔ ایک دن اوتار سنگھ جج نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ پروفیسر جوگیندر سنگھ سے کہا" پروفیسر صاحب! آپ نے اب تک شادی نہیں کی اور نہ آگے شادی کرنے کا امکان نظر آتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ مجھے ہی اپنا بیٹا بنالیں"۔ پروفیسر جوگیندر سنگھ نے پوچھا" میں اگر تمہیں اپنا بیٹا بنالوں تو اس سے ہم دونوں کا کیا فائدہ ہوگا؟"۔ جج نے معصومیت سے کہا" پروفیسر صاحب! آپ نے اولاد کا سُکھ نہیں دیکھا اور میں نے اپنے ماں باپ کا دُکھ نہیں دیکھا۔ میں آپ کا بیٹا بن جاؤں تو ہم دونوں اپنے اپنے حصہ کی یہ چیزیں دیکھ لیں گے"۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ آج کی ترقی یافتہ زندگی میں اولاد کا سُکھ اور ماں باپ کا دُکھ دونوں کی نوعیت بدل گئی ہے۔ ہمارے ایک دوست کافی طویل عرصہ بعد اپنی اہلیہ کے ہمراہ پچھلے ہفتہ ہم سے ملنے آگئے تھے۔ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دہلی میں تین چار مکانوں کے مالک ہیں۔ اس کے علاوہ ملازمت کے دوران میں ہی اُنہوں نے اپنے اور اپنے تینوں بیٹوں کے لئے ایک عالیشان کوٹھی بنوائی تھی تاکہ بیٹے اپنے عمر رسیدہ ماں باپ کے

دُکھ میں اور ماں باپ اپنے بیٹوں کے سُکھ میں شامل رہیں۔ لیکن بعد میں دو بیٹے تو امریکہ چلے گئے اور تیسرا بیٹا یوروپ میں جا کر آباد ہو گیا جہاں وہ اپنی اپنی نوخیز اولادوں کے سُکھ کا دیدار کر رہے ہیں۔ غرض میاں بیوی دونوں ہی یہاں 'اکیلے' رہتے ہیں (طویل عمر کے بعد آدمی چاہے کتنے ہی افراد خاندان کے ساتھ رہے وہ 'اکیلا' ہی رہتا ہے) بہر حال باتوں باتوں میں ہم نے یونہی اُن کے بیٹوں کا حال پوچھ لیا۔ کہنے لگے "تینوں بہت مزے میں ہیں۔ ہر ایک کے پاس تین چار گاڑیاں ہیں۔ دنیا بھر کی سہولتیں ہیں۔ ہر ہفتہ ٹیلی فون کرتے ہیں بلکہ ہم دونوں میں سے کسی کی طبیعت خراب ہو تو روز ہی فون کرتے ہیں"۔ یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنے بیٹوں کی تصویریں دکھانی شروع کر دیں۔ اُن کا ایک بیٹا چار سال سے ہندوستان نہیں آیا۔ اس اثناء میں وہ دو بچوں کا باپ بھی بن چکا ہے۔ اس نے اپنے بچوں کی جو تصویریں بھیجی ہیں اُنھیں وہ بڑے فخر سے دکھانے لگے۔ کہنے لگے "چونکہ یہ بچے فون پر بات نہیں کر سکتے لہذا ہمارا بیٹا اُن بچوں کے ساتھ کوئی ایسی حرکت کرتا ہے کہ وہ رونے لگ جائیں۔ پھر وہ اُن کے رونے کی آواز ہم دونوں کو سناتا ہے"۔ ہمارے دوست جب یہ جملے کہہ رہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ اُن کی اہلیہ کی آنکھوں میں لبالب آنسو آ گئے ہیں۔ ہم نے کہا "بھابی! آپ کیوں رو رہی ہیں؟" بولیں "ہم ان بچوں کا رونا تو سن لیتے ہیں لیکن ہم اپنے بچوں کو خود اپنا رونا کس طرح سنائیں۔ ٹیلی فون صرف آواز پہنچاتا ہے جذبوں کو تو نہیں پہنچاتا۔ یہ تو خیر بچے ہیں، میں خود اپنے بیٹوں سے جب فون پر بات کرتی ہوں تو میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتی کہ میری باتوں کے جواب میں اُن کے چہروں پر کس طرح کے تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ یا پھر اُن کی کسی پریشانی یا چھوٹی موٹی بیماری کا حال سن کر میرے ماتھے پر فکر اور تردّد کی جو شکنیں ابھر آتی ہیں انھیں میرے بیٹے نہیں دیکھ سکتے"۔ یہ کہہ کر وہ اور بھی آبدیدہ ہو گئیں اور ہمیں احساس ہوا کہ آج کے دور میں "ممتا کا پیار" کتنا پیاسا ہے۔ بعد میں غور کیا تو احساس ہوا کہ ہم خود بھی تو ادھر کئی برسوں سے اپنی اولاد کے سُکھ کا حال ٹیلی فون کے ذریعہ ہی معلوم کر لیتے ہیں۔

روزنامہ "سیاست" (۹ رنومبر ۲۰۰۳ء)

☆☆

تماشائے اہلِ ستم

وزیر نے افسر کو مارا

آپ نے یہ خبر تو پڑھ لی ہوگی کہ راجستھان کے وزیر آب پاشی دیوی سنگھ بھاٹی نے پچھلے دنوں اپنے محکمہ کے سکریٹری اور سینئر آئی اے ایس عہدیدار مسٹر پی کے دیو کی اپنے دفتر میں خوب پٹائی کی ۔اس پر ملک کے آئی اے ایس افسروں نے زبردست احتجاج کیا ہے کہ اگر وزیر آئی اے ایس عہدیدار کی پٹائی کرنے لگ جائیں تو عہدیداروں کا کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اگرچہ راجستھان کے وزیر آب پاشی مسٹر دیوی سنگھ بھاٹی نے اس احتجاج کے جواب میں اپنا استعفیٰ دے دیا ہے لیکن استعفیٰ سے آئی اے ایس افسر کی پٹائی کے واقعہ کی نوعیت تو نہیں بدل جائے گی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پہلا موقع نہیں ہے جب دیوی سنگھ بھاٹی نے کسی آئی اے ایس افسر کی پٹائی کی ہے۔اس سے پہلے بھی وہ ایک اور آئی اے ایس افسر کی پٹائی کر چکے ہیں۔ گویا انہیں آئی اے ایس افسروں کی پٹائی کرنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ جب دو بڑے آپس میں مار پٹائی کرتے ہیں تو ہم جیسے لوگ خاموشی اختیار کرنے کے سوائے اور کیا کر سکتے ہیں۔یوں بھی ہم ہمیشہ 'ماروں کے پیچھے اور بھاگتوں کے آگے' پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسکول ماسٹروں کے علاوہ کسی اور نے آج تک ہماری پٹائی نہیں کی۔ یوں بھی آئی اے ایس افسر ایک خونخوار چیز ہوتی ہے۔آدمی نفس امارہ کو تو مار سکتا ہے لیکن کسی آئی اے ایس افسر کو مارنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ابھی پچھلے دنوں ایک آئی اے ایس عہدیدار نے اپنے شخصی ملازم کی محض ایک چھوٹی سی بات پر اتنی پٹائی کی کہ وہ مر گیا۔بڑا عہدیدار اپنے ماتحت کو تو مار سکتا ہے لیکن کوئی بڑے عہدیدار کی پٹائی کرے، یہ ایک

انوکھی بات ہے۔یقین مانیئے، آج تک ہم آئی اے ایس عہدیداروں سے بے پناہ خوف کھاتے رہے ہیں۔کیونکہ ان کے پاس اتنے اختیارات ہوتے ہیں کہ ہم جیسا عام آدمی ان کے آگے بے یارومددگار نظر آنے لگتا ہے۔ہمارے ایک دوست ہیں جو سماج میں کہیں بھی دو افراد کو لڑتے ہوئے دیکھ لیتے ہیں تو اس کی ساری ذمہ داری فلموں پر عائد کردیتے ہیں۔ایک بار وہ ہمارے ساتھ ٹیلی ویژن پر امیتابھ بچن کی کوئی فلم دیکھ رہے تھے،جس میں امیتابھ بچن کو بیک وقت دس پندرہ دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔امیتابھ بچن نے جب فلم میں اپنے آخری دشمن کا کام تمام کیا اور اسکرین پر وہ اکیلا رہ گیا تو ہمارے دوست نے فوراً آگے بڑھ کر ٹیلی ویژن کو بند کردیا۔ہم نے ٹیلی ویژن کو اچانک بند کرنے کی وجہ پوچھی تو گھبرا کر بولے ''بھیا!اس نے تو سارے دشمنوں کا کام تمام کردیا ہے۔اس کے پاس اب پٹائی کرنے کے لئے کوئی بھی باقی نہیں بچا ہے۔سوائے ہم لوگوں کے۔کیا عجب کہ وہ اچانک اسکرین میں سے نکل آئے اور ہماری پٹائی شروع کردے۔اس لیئے حفظِ ماتقدم کے طور پر ٹیلی ویژن کو بند کردیا ہے''۔ہمیں اس وقت تو ان کی بات مضحکہ خیز لگی تھی لیکن اب سوچتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ مار پٹائی کے مناظر سچ مچ اسکرین میں سے نکل کر عملی زندگی میں دکھائی دینے لگے ہیں۔آئی اے ایس افسر کی پٹائی کے واقعہ کے بارے میں بھی ہمارے ان ہی دوست کی رائے ہے کہ ''میاں!جب بچے بچے مار پٹائی کرنے لگے ہیں اور آئے دن ایسی گالیاں تک دینے لگ گئے ہیں جن پر وہ خود عمل پیرا نہیں ہوسکتے تو ایسے میں اگر ایک وزیر نے جو اپنی ہر بات پر عمل پیرا ہونے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے،اگر کسی آئی اے ایس افسر کی پٹائی کی ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔کیا پٹنے کا ٹھیکہ صرف ہم غریبوں نے ہی لے رکھا ہے۔یہ سہولت کبھی بڑے لوگوں کے حصہ میں بھی آنی چاہیے۔ابھی کچھ عرصہ پہلے بہوجن سماج پارٹی کے سربراہ کانشی رام جی نے چند صحافیوں کی پٹائی کی تھی تو تم نے اس واقعہ کا ایسا گہرا اثر لیا تھا کہ بلاوجہ کئی دنوں تک اپنا گال سہلایا کرتے تھے۔لیکن سچ پوچھئے تو مجھے کانشی رام جی کی اس حرکت سے خوشی ہوئی تھی۔صحافیوں کو بھی اگر معلوم ہوجائے کہ پٹنے کا کیا اثر ہوتا ہے تو وہ غریب عوام کے دکھ درد کو اور بھی اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہوجائیں گے۔راجستھان کے جس وزیر نے اب ایک آئی اے ایس افسر کی پٹائی کی ہے،اس نے اس سے پہلے نہ جانے کتنے ہی غریبوں کی پٹائی کی ہوگی۔لیکن ایسے واقعات کی کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔اب ایک آئی اے ایس

عہدیدار کی پٹائی ہوئی ہے تو سارے ملک میں ہنگامہ ہو رہا ہے۔ بھیا! تم تو جانتے ہو کہ ان دنوں کس طرح کے لوگ وزیر بننے لگے ہیں۔ اُتر پردیش کی بھارتیہ جنتا پارٹی کی سرکار میں تو ایسے کئی وزیر شامل ہیں جو قتل کے مقدمات میں ماخوذ ہیں اور جن کے جرائم کی داستانیں اخباروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ جس ملک میں ایسے لوگ وزیر بننے لگے ہوں، وہاں تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ ہر آدمی کے ساتھ شرافت اور محبت سے پیش آئیں گے۔ راجستھان کے مذکورہ بالا عہدیدار کو تو اس وزیر کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ اس نے تو اس کی صرف پٹائی کی اور ایک انگوٹھا توڑا۔ اسے جان سے تو نہیں مار دیا جبکہ وہ آسانی سے اس کی جان بھی لے سکتا تھا''۔

ہمارے دوست کی ایسی ہی معقول باتیں ہمیں نہایت نامعقول لگتی ہیں۔ اگر بڑے لوگوں کی پٹائی کو بھی وہ ایسا ہی ضروری سمجھتے ہیں تو پھر اس ملک میں کسی کی بھی پگڑی سلامت نہیں رہے گی۔ بڑے سرکاری عہدیداروں کا تو ایک رعب اور دبدبہ ہوتا ہے اور یہی دبدبہ بعد میں حکومت کا دبدبہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ دنیا کے ہر ملک میں سرکاری عہدیداروں کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ البتہ سنا ہے کہ آج سے ساٹھ ستر برس پہلے جب کانگو، بلجیم کی نوآبادی تھی تو وہاں کے آدم خور قبیلہ کے لوگ بلجیم کے اعلیٰ عہدیداروں کو پکڑ کر کھا جاتے تھے اور مہینوں ان کے ذائقہ کو یاد رکھتے تھے۔ ایک بار وہاں کے آدم خور قبیلہ کے لوگ اپنے علاقہ کے ڈپٹی کمشنر کو پکڑ کر کھا گئے تھے۔ اس پر مولانا عبدالمجید سالک نے ایک دلچسپ کالم لکھا تھا۔ جس میں کانگو کی دو خواتین کو آپس میں بات چیت کرتے ہوئے پیش کیا گیا تھا۔ چنانچہ ایک خاتون دوسری خاتون سے پوچھتی ہے ''بی بی! آج تم نے کیا پکایا ہے؟''

دوسری خاتون جواب دیتی ہے ''اے بہن! آج تو میرے ہاں بلجیم کا ڈپٹی کمشنر پکا ہے۔ بہت لذیذ اور مزیدار ہے۔ کہو تو تھوڑا سا ڈپٹی کمشنر کٹورے میں ڈال کر تمہارے لئے بھیج دوں''

پہلی خاتون کہتی ہے ''بی بی! ضرور بھیج دینا۔ پرسوں مُنے کے ابا ایک پادری کو مار کر لے آئے تھے۔ کمبخت ایسا بوڑھا کھوسٹ نکلا کہ کتنی ہی دیر تک دھیمی آنچ پر پکانے کے باوجود نہیں گلا۔ ڈپٹی کمشنروں اور ججوں کے ذائقہ کے کیا کہنے۔ اتنے تر و تازہ اور ملائم ہوتے ہیں کہ ذرا سی دھیمی آنچ پر بھی گل جاتے ہیں اور کھانے میں اتنے لذیذ کہ بس انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ۔ ہو سکے تو تھوڑا سا

ڈپٹی کمشنر میرے لئے بھی بھیج دو۔ یہ شکار بڑی مشکل سے ملتا ہے"۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں اعلیٰ عہدیدار پکا کر کھائے نہیں جاتے بلکہ ہر جگہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ راجستھان کے وزیر آبپاشی نے ایک آئی اے ایس عہدیدار کی پٹائی کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں اور پٹنے کی ذمہ داری صرف چپراسیوں اور کلرکوں کی نہیں ہوتی۔ کبھی کبھار اعلیٰ عہدیداروں کی پٹائی بھی ہونی چاہیے اور اتنی ہونی چاہیے کہ چپراسی اور اعلیٰ عہدیدار کا فرق خود بخود مٹ جائے۔ اگر وزیروں کے ہاتھوں اعلیٰ عہدیداروں کی اسی طرح بے عزتی جاری رہی تو کیا عجب کہ کل کے دن ان سے ایسے کام بھی لئے جائیں جو چپراسیوں اور اردلیوں سے لئے جاتے ہیں۔ مثلاً کسی دن آپ کسی وزیر سے ملنے جائیں اور اس سے پوچھیں کہ بھئی آپ کے محکمہ کا سکریٹری کہاں ہے تو وزیر جواب دے گا "بھئی! ابھی آجائے گا۔ میرے لئے ذرا پان اور سگریٹ لینے گیا ہے۔ بڑا کام چور ہو گیا ہے۔ آج اس نے میرے کمرہ کی صفائی بھی نہیں کی تھی۔ آج اسے خوب ڈانٹ پلائی ہے۔ آئندہ کے لئے خبردار کر دیا ہے۔ بس ابھی آتا ہوگا۔ وہ آجائے تو آپ کے لئے اسی کے ہاتھوں چائے بھی منگواؤں گا"۔

اس ملک میں جس طرح کے لوگ اب سیاست میں آنے لگے ہیں اور اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھنے لگے ہیں وہاں عام آدمی کی عزت تو بہت دور کی بات ہے بڑے بڑوں کی عزت اب خاک میں ملتی نظر آنے لگی ہے۔ جب آئی اے ایس جیسے بااختیار عہدیدار بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرنے لگیں تو وہاں، ہم جیسوں کی سلامتی کو کون پوچھے گا۔ ہمارے ملک میں جمہوریت اب ایک ایسے دور میں داخل ہوگئی ہے جس میں کسی مجرم کو جیل میں بھیجنے کی بجائے اسے وزارت کی کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے کہ بھیا جتنی بھی غیر قانونی حرکتیں کرنا چاہو، وزارت کی کرسی پر بیٹھ کر کرو۔ تمہیں کس نے روکا ہے۔

ہمیں آئی اے ایس عہدیداروں سے دلی ہمدردی ہے کہ اب ان کی دستار فضیلت بھی اس جمہوریت کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہی۔ ہماری تجویز تو یہ ہے کہ آئی اے ایس عہدیداروں کو جہاں ان کے فرائض منصبی کے بارے میں گہری تربیت دی جاتی ہے وہیں انہیں وزیروں کی پٹائی سے بچنے کے بھی حربے سکھائے جائیں۔ راجستھان کے سکریٹری آب پاشی مسٹر پی کے دیو تو پھر بھی خوش قسمت تھے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لئے وزیر کے کمرے سے بھاگ آئے۔ پھر بھی

وزیر نے بھاگتے ہوئے اس عہدیدار کا انگوٹھا توڑ کر چھین لیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مسٹر پی کے دیو کے انگوٹھے میں کوئی انگوٹھی نہیں تھی ورنہ اس پر بھی وزیر کا قبضہ ہو جاتا۔ بہر حال یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس پر آئی اے ایس عہدیداروں کو ضرور غور کرنا چاہیے۔ جہاں تک وزیروں کا تعلق ہے، انہیں کسی بھی مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت نہیں رہی۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۴؍دسمبر ۱۹۹۷ء)

حیدر آباد کا رمضان

صاحبو! رمضان کا مبارک مہینہ تو ہر سال آتا ہی ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے۔ مگر اس بار ہمارے لئے خاص بات یہ ہے کہ لگ بھگ چوتھائی صدی کے بعد ہمیں 'حیدر آباد کا رمضان' میسر آرہا ہے۔ آپ کہیں گے رمضان تو ساری دنیا میں ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ 'حیدر آباد کا رمضان' کوئی الگ تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ اس مہینہ کی برکتیں تو ہر جگہ ایک ہی انداز سے نازل ہوتی ہیں۔ آپ نے بالکل بجا فرمایا مگر ہماری عرض یہ ہے کہ پچھلے پچیس برسوں سے ہم 'دہلی کے رمضان' کے عادی ہو گئے ہیں جہاں روزے تو ہر جگہ کی طرح تیس دن کے ہی ہوتے ہیں لیکن ان سے وابستہ 'افطاروں' کی تعداد ساٹھ ستر سے کم نہیں ہوتی۔ دہلی ہمارے ملک کی راجدھانی ہے اور یہاں جتنی سیاسی پارٹیاں ہیں اور جتنے رہنما ہیں ان کے حساب سے رمضان کے روزوں کی تعداد ہمیشہ کم پڑ جاتی ہے۔ آپ یقین کریں ایک ایک دن کے روزے پر چار چار سیاسی پارٹیوں کی نظر ہوتی ہے۔ ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ پچھلے پندرہ بیس برسوں میں ہم نے دہلی میں کبھی ایک جگہ جم کر افطار کیا ہو۔ ایک بار تو یوں ہوا کہ ہم نے افطار کا آغاز جنتا دل کے کھجور سے کیا۔ البتہ کچھ ہی دیر بعد اس کھجور کی گٹھلی لوک دل کے دفتر میں پھینکی، لوک دل کا کباب اٹھایا تو اس کباب میں پھنسی ہوئی ہڈی سمتا پارٹی کے دفتر میں پھینکی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم سمتا پارٹی کے سنگترے کے بیجوں کو کانگریس پارٹی کے دفتر میں پھینکتے ہوئے پائے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے یہاں پہنچنے تک روزہ داروں کی بھیڑ کی وجہ سے افطار کا سامان ختم ہو چکا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک نیپکن ہمارے

ہاتھ لگا تو اسے یہ سوچ کر اپنی جیب میں رکھ لیا کہ چلو بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی۔ آپ یقین کریں کہ ایک ہی دن میں ہم نے بعض اوقات چار چار افطار پارٹیوں میں شرکت کی۔

پچھلے سال ایک سیاسی رہنما کی طرف سے دی گئی افطار پرٹی میں مذکورہ رہنما نے ہم سے یونہی مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں کچھ پوچھ لیا۔ اس پر ہم نے دست بستہ عرض کیا ''حضور! مسلمانوں کے مسائل بڑے پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک ہی دن میں انھیں چار چار افطار پارٹیوں میں شرکت کرنی پڑتی ہے۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کی پارٹی پارلیمنٹ میں ایک بل لے آئے جس کے ذریعہ رمضان کے روزوں کی تعداد بڑھادی جائے اور اس طرح 'ایک روزہ، ایک افطار پارٹی' کے اصول پر عمل ہونے لگے جیسے آپ نے اپنی پارٹی کے لئے 'ایک عہدہ۔ ایک شخص' کا اصول مقرر کر رکھا ہے۔ موصوف ہماری بات کو بڑی سنجیدگی سے سنتے رہے۔ پھر اس سے کہیں زیادہ سنجیدگی کے ساتھ الٹا ہم سے یہ سوال پوچھ بیٹھے'' آپ کی بات ویسے تو ٹھیک ہے لیکن اگر ہم اس سلسلہ میں کچھ کرتے ہیں تو کہیں اسے 'مسلم پرسنل لاء' میں مداخلت تو نہیں سمجھا جائے گا؟۔'' اس سوال نما جواب کو سن کر ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ ہمارے رہنما مسلمانوں کے مسائل اور خود ہماری مزاح نگاری کے بارے میں کتنی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔

اب آپ سے کیا چھپانا کہ دہلی کے رمضان میں ہمیں کبھی 'خالص رمضان' نظر نہیں آیا۔ سوچا کہ کیوں نہ اس بار رمضان کا مہینہ حیدرآباد میں گزارا جائے۔ چنانچہ دہلی کی افطار پارٹیوں سے بچنے کے لئے ہم نے رمضان کے تین چار روزوں کے بعد ہی حیدرآباد چلنے کا پروگرام بنالیا۔ ہم نے طے کرلیا تھا کہ اس بار دہلی کی کسی افطار پارٹی میں شرکت نہیں کریں گے مگر تیسرے ہی روزہ پر نائب صدر جمہوریہ ہند جناب کرشن کانت کی طرف سے دعوت نامہ آیا کہ میاں دہلی سے جاتے جاتے افطار تو کرتے جاؤ۔ اس اولین دعوت نامے کے آگے ہمارا فیصلہ متزلزل ہونے لگا تو ہم نے سوچا کہ جس شہر میں رہتے ہوئے ہمیں ایک چوتھائی صدی بیت گئی ہے اس کا بھی تو ہم پر کچھ حق ہے۔ پھر اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ نائب صدر جمہوریہ کی افطار پارٹی 'حیدرآباد ہاؤس' میں آراستہ کی گئی تھی۔ اس اعتبار سے ہم نے اس افطار پارٹی کو بھی بڑی آسانی سے حیدرآباد کے کھاتہ میں ہی ڈالنا ضروری سمجھا۔ چونکہ یہ دہلی کی پہلی افطار پارٹی تھی اس لئے اس میں لوگ جوق در جوق آئے۔ خود نائب صدر جمہوریہ شیروانی میں ملبوس تھے اور ٹوپی بھی پہن رکھی تھی۔ اُنھوں نے مہمانوں سے

فرداًفرداً ملاقات بھی کی۔ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی بھی اس افطار پارٹی میں آئے۔ مرلی منوہر جوشی، شیلا ڈکشٹ اور کئی سیاسی قائدین بھی موجود تھے۔ مگر جیسے ہی صدر کانگریس سونیا گاندھی اس افطار پارٹی میں آئیں ہم نے محسوس کیا کہ افطار پارٹی میں موجود جتنے بھی باریش لوگ تھے وہ اچانک ہر گوشہ سے نکل آئے اور سونیا گاندھی کے اطراف جمع ہونے لگے۔ سونیا گاندھی جتنی دیر بھی وہاں رہیں ان ہی لوگوں کے سائے میں رہیں۔ اس پر ہمارے ایک دوست نے جو انگریزی کے صحافی ہیں کہا ''بھیا! ایسا لگتا ہے کہ کانگریس پارٹی کو اس کا 'ووٹ بینک' بڑی تیزی سے واپس ملتا جا رہا ہے''۔

بہرحال دہلی کی اس پہلی افطار پارٹی کے بعد ہم چپ چاپ حیدرآباد چلے آئے اور ماشاء اللہ پچھلے دس دنوں سے بڑی خاموشی کے ساتھ 'حیدرآباد کے رمضان' سے نباہ کر رہے ہیں، نہ کسی افطار پارٹی میں گئے اور نہ ہی دو چار دوستوں کو چھوڑ کر کسی اور دوست سے ملے۔ یوں سمجھئے کہ اپنے گھر میں ہی بند رہے۔ (یوں بھی رمضان کے دنوں میں ہم جیسوں کا بند رہنا ہی بہتر ہوتا ہے) ماشاء اللہ حیدرآبادی رمضان کو ہم نے ویسا ہی پایا جیسے یہ پچیس برس پہلے ہوا کرتا تھا۔ یعنی حیدرآبادی روزہ دار رمضان کا بڑا اہتمام کرتا ہے (مگر صرف افطار سے لے کر سحری تک) اور دن میں کچھ بھی نہیں کھاتا۔ شخصی طور پر دہلی اور حیدرآباد کے رمضان میں ہمیں یہ فرق نظر آیا کہ دہلی میں ہر روز افطار کے لئے چار پانچ جگہوں سے دعوتیں آجاتی ہیں۔ البتہ وہاں سحری کے وقت ہم جیسے روزہ داروں کو جگانے کے لئے کوئی نہیں آتا جب کہ حیدرآباد میں افطار کی دعوتیں کم آتی ہیں (کم از کم ہمارے پاس نہیں آتیں) البتہ سحری کے وقت جگانے کا اتنا معقول انتظام ہوتا ہے کہ روزہ دار اگر ایک ہو تو اسے جگانے کے لئے پچیس آدمی آجاتے ہیں۔ (یہ سہولت چونکہ ہمیں دہلی میں میسر نہیں ہے اس لئے اپنے بل بوتے پر جاگ جاتے ہیں)۔ حیدرآباد میں ہم جس محلہ میں ٹھہرتے ہیں وہاں ہمارے گھر کے آس پاس دس بارہ تو مسجدیں ہی ہیں جو روزہ داروں کو جگانے کا کام کچھ اتنی خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہیں کہ ایک زمانہ میں ہم رمضان کے گزر جانے کے بعد بھی دو چار مہینوں تک اپنے آپ ہی سحری کے وقت بستر سے یہ کہتے ہوئے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے تھے کہ ''بھئی! کہاں ہے سحری ہماری''۔ اس معقول انتظام کے علاوہ کسی زمانہ میں ہمارے محلہ میں ایک بزرگ رہا کرتے تھے جو سحری کے وقت بانس کی ایک لمبی چھڑی لے کر نکلتے تھے۔ ہم چونکہ دیوان خانہ کی

کھڑکی کھلی رکھ کر سو جانے کے عادی تھے اسی لئے وہ ہمیں جگانے کے لئے کھڑکی میں سے اپنی بانس کی چھڑی کو اندر داخل کر کے اسے ہماری پسلی میں باالتزام چبھوتے تھے کہ میاں سحری کے لئے جاگ جاؤ۔ بسا اوقات ہم ان کے آنے سے پہلے ہی جاگ جایا کرتے تھے۔ ایک بار غلطی سے ہماری جگہ بستر پر ہمارا گاؤ تکیہ لحاف کے اندر رہ گیا تو دیکھا کہ وہ صلواتیں سنا سنا کر اپنی چھڑی کی مدد سے ہمارے گاؤ تکیہ کو سحری کے لئے جگانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس بے گناہ گاؤ تکیہ کو قبر کے عذاب اور روز محشر کے حساب سے ڈرا رہے ہیں۔ بہر حال دہلی میں ہمیں سحری کے لئے جاگنے کی ایسی سہولت حاصل نہیں ہے جو ہمیں حیدرآباد میں میسر ہے۔ ہمارا بس چلے تو ہم سحری حیدرآباد میں کریں اور افطار دہلی میں۔

چاہے کچھ بھی ہو ایک لمبے عرصہ بعد ہم نے رمضان کے مہینہ کے دو ہفتے حیدرآباد میں نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ گزارے۔ سحری سے زیادہ مطلب رکھا اور افطار پارٹیوں سے دور رہے۔ ہمارا ارادہ تو عید بھی یہاں منانے کا تھا لیکن اس بیچ ایک بات ایسی ہوگئی ہے کہ دہلی کی افطار پارٹیوں میں ہماری شرکت نہایت ضروری ہوگئی ہے۔ پرسوں ہم نے اپنے گھر کا حال پوچھنے کے لئے دہلی فون کیا تو ہماری اہلیہ نے کہا ''یہ افطار پارٹیوں والے بہت تنگ کر رہے ہیں۔ تمہارے لئے روز ہی فون آجاتے ہیں۔ پرسوں ایک صاحب نے تو فون کر کے تمہارے بارے میں یہاں تک کہا 'پچھلے رمضان میں تو اچھے بھلے تھے۔ آخر کیا ہو گیا تھا انھیں۔ اس بار کسی افطار پارٹی میں نظر نہیں آئے۔ خدا مغفرت کرے عجب آزاد روزہ دار تھا۔' ظاہر ہے کہ اس طرح کے فون کے بعد ہمارا دہلی جانا ضروری ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب آپ یہ سطریں پڑھ رہے ہونگے تو ہم دہلی کی بچی کھچی افطار پارٹیوں کی جانب جانے والی تیز رفتار ٹرین میں سفر کر رہے ہوں گے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۰؍جنوری ۱۹۹۹ء)

☆☆

ضمیر فروشی اور مافی الضمیر فروشی

پرانی داستانوں میں آپ نے ایسے کرداروں کے بارے میں ضرور پڑھا ہوگا کہ زندگی بھر ظالم، سفاک، اوباش اور نہ جانے کیا کیا بنے رہے لیکن ان کی زندگی میں اچانک کوئی ایسی تبدیلی رونما ہوگئی کہ بیٹھے بٹھائے نیک، شریف، پاک طینت، پاکباز اور نہ جانے کیا کیا بن گئے۔ داستانوں کے علاوہ ہم نے اپنی ہندوستانی فلموں میں بھی یہ خصوصیت دیکھی کہ ایک اچھا بھلا بدمعاش ابھی معصوموں کی پٹائی کر رہا ہے، ٹھائیں ٹھائیں گولیاں چلا رہا ہے، کشتوں کے پشتے لگا رہا ہے، بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ رہا ہے لیکن اچانک اس کی ذات میں 'تالیف قلب' کا ایک ایسا کرشمہ رونما ہوتا ہے کہ سارے مظالم سے توبہ کرکے انسانیت کا پُتلا بن جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ساری انسان دوستی، نیکی، شرافت بس اسی پر ختم ہو رہی ہے۔ فلموں میں تو خیر کردار کی یہ کایا پلٹ نہایت ضروری ہوتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہیرو کی شادی کیسے ہو، سچ کی فتح کیونکر ہو اور سب سے بڑی بات یہ کہ تین ساڑھے تین گھنٹوں تک ناظرین سنیما گھروں میں بلاوجہ کیوں بیٹھے رہیں۔ کردار آپس میں لڑتے رہیں تو مزہ آتا ہے۔ پھر ہم کسی کردار میں ایسی اچانک تبدیلی کو دیکھنے کے لئے ہی تو ٹکٹ خرید کر سنیما دیکھتے ہیں۔ مانا کہ ایسی کایا پلٹ تبدیلی کسی کردار میں بعض اوقات رونما ہو جاتی ہے لیکن یہ تبدیلی ایسی اچانک نہیں ہوتی کہ اس تبدیلی کو دیکھنے والے اپنے منہ میں انگلی دبا کر کھڑے ہو جائیں۔ خود ہماری مثال لیجئے کہ ساٹھ برس پہلے ہم جو کچھ تھے وہ آج نہیں ہیں۔ اس عرصہ میں ہمارے کردار اور اخلاق میں خاصی تبدیلی آگئی ہے لیکن یہ تبدیلی اتنی

بتدریج ہوئی ہے کہ آج ہم خود اپنی پارسائی اور پاک دامنی کے قائل نظر آتے ہیں۔ کسی کردار میں ایسی اچانک تبدیلی کی بات ہمیں اس لئے یاد آ گئی کہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ آنے والے سالانہ انتخابات (سالانہ انتخابات ہم اس لئے لکھ رہے ہیں کہ ایک زمانہ میں انتخابات پانچ سال میں ایک مرتبہ ہوتے تھے اب ہر سال ہونے لگے ہیں) میں 'ہندوتوا' کے ایجنڈے سے دستبردار ہو جائے گی۔ نہ ایودھیا کا مسئلہ اٹھائے گی۔ نہ دفعہ 370 کی برخاستگی کا مطالبہ کرے گی اور نہ ہی یکساں سیول کوڈ پر اصرار کرے گی۔

یاد ش بخیر! دو چار برس پہلے کی بات ہے جب بھارتیہ جنتا پارٹی کے ہندوتوا والے ایجنڈے کا ہر طرف بول بالا تھا تو ہم نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایک سینئر رہنما کے سامنے مذاق مذاق میں یہ تجویز رکھی تھی کہ حضور! آپ بلا وجہ 'ہندوتوا' کے ایجنڈے پر اتنا شور مچا رہے ہیں۔ ہماری تجویز مانئے اور اس ملک میں اسلامی قوانین کو سختی سے نافذ فرمائیے۔ سارے مسلمانوں پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ وہ پنج وقتہ نماز ادا کریں، روزے رکھیں اور زکوٰۃ دیں، جھوٹ نہ بولیں، دھوکہ نہ دیں، تاجر ہیں تو کم نہ تولیں، چیزوں میں ملاوٹ نہ کریں، سرکاری ملازم ہیں تو رشوت نہ لیں وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی ان احکام کی خلاف ورزی کرے تو اسے سخت سزائیں دی جائیں۔ انشاء اللہ چند دنوں بعد آپ دیکھیں گے کہ آپ دھیرے دھیرے اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری تجویز کو سن کر بھارتیہ جنتا پارٹی کے رہنما نے مسکرا کر فرمایا تھا ''آپ کو مذاق کے سوائے کوئی بات نہیں سوجھتی''۔ مشکل یہ ہے کہ ہم جب بھی کوئی سنجیدہ بات کرتے ہیں تو لوگ اسے مذاق سمجھ کر ٹال دیتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے کہ آج بھارتیہ جنتا پارٹی میں اچانک کیسی حیرت انگیز تبدیلی آ گئی ہے۔ ایودھیا سے بھی دستبردار ہو رہی ہے، دفعہ 370 کے بارے میں بھی خاموش ہے اور یکساں سیول کوڈ کو بھی فراموش کر چکی ہے۔ پرسوں ایک صاحب مذاق میں ہم سے کہہ رہے تھے کہ بھئی بھارتیہ جنتا پارٹی کے رویہ میں یہ جو حیرت انگیز تبدیلی آئی ہے اس سے تو یوں لگتا ہے جیسے بھارتیہ جنتا پارٹی 'مشرف بہ اسلام' ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔ سچ پوچھئے تو ہمیں بھی بھارتیہ جنتا پارٹی کے رویہ میں اس اچانک تبدیلی سے مایوسی ہوئی ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ پچھلے دس برسوں سے آپ ایک مسئلہ کو پوری سرگرمی کے ساتھ اٹھائے پھر رہے ہیں اور آج اچانک اس مسئلہ سے دستبردار ہو رہے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ اس ملک میں نفرت، فرقہ پرستی، تشدّد اور افراتفری

کو پیدا کرنے میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو پچھلے دس برسوں میں کتنی محنت کرنا پڑی۔ اڈوانی جی اپنی رتھ یاترا میں بیٹھ کر کہاں کہاں نہیں گئے اور کہاں کہاں نفرت نہ پھیلائی۔ کتنے ہنگامے اور کتنے دنگے نہ ہوئے، کتنی جانیں نہ گئیں، کتنے گھر برباد نہ ہوئے۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد اگر آج ان کی پارٹی یہ کہتی ہے کہ ایودھیا کے مسئلہ کو وہ انتخابات کا موضوع نہیں بنائے گی تو یہ کتنی افسوسناک بات ہے۔ اب جبکہ ہم نفرت، فرقہ پرستی، انتشار، فساد اور ظلم کو برداشت کرنے کے اہل بنتے جا رہے ہیں تو آپ فرما رہے ہیں کہ ہم ایودھیا کے مسئلہ سے دستبردار ہو رہے ہیں۔ یعنی کسی کی جان گئی اور آپ کی ادا ٹھہری۔

صاحبو! ایک لمبے عرصہ سے ہم نے سیاستدانوں کے بارے میں لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ ایک زمانہ میں ہم ان کے سوائے کسی اور کے بارے میں نہیں لکھتے تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم جب بھی 'سیاست دانوں' کے بارے میں کچھ لکھنے کا قصد کرتے ہیں تو ہمارے قلم کو اُبکائیاں آنے لگتی ہیں۔ یوں بھی ضمیر فروش سیاستدانوں کے خلاف تو ہم لکھ سکتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کے سیاستدان نہ صرف اپنا ضمیر بیچ رہے ہیں بلکہ اپنا ''مافی الضمیر'' بھی بیچنے لگے ہیں۔ ایسے 'مافی الضمیر فروش سیاستدانوں' کے بارے میں کچھ لکھنا کم از کم ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ تاہم یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ اس بار پارلیمنٹ کے اگلے چناؤ صرف ایک 'ووٹ' کی بنیاد پر منعقد ہو رہے ہیں اور یہ ووٹ ہے ہمارے دوست، کرم فرما اور نیشنل کانفرنس کے لیڈر سیف الدین سوز کا۔ ہمارے قریبی احباب جانتے ہیں کہ پارلیمنٹ میں واجپائی کی حکومت کی تحریک اعتماد پر جب بحث چل رہی تھی تو ہم نے کہا تھا کہ اس بار کی رائے شماری میں سیف الدین سوز کے ووٹ کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگی۔ ہمارے احباب نے اسے بھی ہمارا مذاق سمجھ لیا تھا مگر جب رائے شماری ہوئی تو پتہ چلا کہ سیف الدین سوز کا ووٹ ہی ہماری جمہوریت کے لئے فیصلہ کن ثابت ہوا کیونکہ یہی وہ ووٹ تھا جو مافی الضمیر فروش سیاستدانوں کے ووٹوں کی بھیڑ میں ضمیر کی آواز پر دیا گیا تھا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ سیف الدین سوز کو ہم اس وقت سے جانتے ہیں جب یہ عملی سیاست میں بھی داخل نہیں ہوئے تھے۔ 70ء کی دہائی میں جب وہ سری نگر میں جموں و کشمیر ٹکسٹ بک بورڈ کے سکریٹری ہوا کرتے تھے تو ہم نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں اُردو شعبہ کے سربراہ تھے۔ حکومت جموں و کشمیر نے ہمارے ادارہ کی اُردو کتابوں کو ریاستی

اسکولوں کے نصاب میں لگانے کا فیصلہ کیا تو سیف الدین سوز سے ہمارا ربط ضبط قائم ہوا۔ ہم نے لاکھوں کی تعداد میں یہ کتابیں کشمیر ٹکسٹ بک بورڈ کو فراہم کیں۔ بعد میں یہ سرکاری ربط ضبط دوستی میں تبدیل ہوتا چلا گیا بلکہ اس سرکاری ربط ضبط کے دوران میں بعض مزاحیہ گوشے بھی پیدا ہوتے چلے گئے۔ ہمارے ادارہ کی ایک درسی کتاب میں 'خرگوش اور کچھوے' کی وہ مشہور کہانی شامل تھی جس میں بالآخر جیت کچھوے کی ہوتی ہے اور خرگوش پیچھے رہ جاتا ہے۔ سیف الدین سوز نے ہم سے مطالبہ کیا کہ ہم اس کہانی کو کتاب میں سے نکال دیں کیونکہ کشمیر میں کچھوا نہیں ہوتا۔ ہم نے کتاب میں سے کچھوے سمیت کہانی کو نکال دیا تو چند دن بعد سائنس کی ایک کتاب کے سلسلہ میں اُنھوں نے مطالبہ کیا کہ اس میں سوروں کی افزائش نسل کے تعلق سے جو سبق ہے اسے نکال دیا جائے کیونکہ کشمیر میں سور کو ناپاک جانور سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اس طرح تو ہماری کتابیں جانوروں سے خالی ہوتی چلی جائیں گی۔ بولے کشمیر کے پس منظر میں اس ایک جانور کو نکال دیجئے باقی جانوروں کو ہم برداشت کرلیں گے۔ بعد میں جب وہ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوکر نیشنل کانفرنس میں شامل ہوگئے اور دہلی میں رہنے لگے تو ان سے دوستانہ مراسم بھی قائم ہوئے۔ وہ ایک سچے سیکولر انسان ہیں اور ہمیں پہلے سے اندازہ تھا کہ واجپائی حکومت کی تحریک اعتماد پر ان کا ضمیر ان سے کیا کروائے گا۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے بیشتر سیاستدانوں نے سیکولرازم کو فرقہ پرستی کے فروغ کا ایک ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اب اگلے چناؤ نہ جانے کیا گل کھلائیں گے۔ کیا ان انتخابات کے بعد بھی اس ملک میں سیکولرازم باقی رہے گا کیونکہ سیکولر طاقتوں کے درمیان خود سیکولرازم کی بنیاد پر اختلافات پیدا ہوتے جارہے ہیں اور دوسری طرف فرقہ پرست جماعتیں بھی اپنے چہروں پر سیکولرازم کا نقاب چڑھاتی جارہی ہیں!۔

روزنامہ "سیاست" (۹ مئی ۱۹۹۹ء)

☆☆

یومِ آزادی

(بچوں کے لئے ایک سبق)

بچو! آج یومِ آزادی ہے۔ ۵۲ برس پہلے آج ہی کے دن ہم نے آزادی حاصل کی تھی۔ کیوں حاصل کی تھی؟۔ یہ سوال شاید اُس وقت کے رہنماؤں کو معلوم رہا ہو، آج کسی کو نہیں معلوم۔ تم بھی جان کر کیا کرو گے۔ جس طرح ہر کسی کو سوال کرنے کی آزادی حاصل ہے اسی طرح تمہیں بھی کسی سوال کا جواب نہ جاننے کی آزادی حاصل ہے۔ آزادی کے یہی تو فائدے ہیں۔ فارسی میں ایک مقولہ ہے۔ جواب جاہلاں باشد خموشی۔ ہمیں فارسی نہیں آتی تاہم ہم نے اپنی دانست کے مطابق اس کا ترجمہ یہ کر رکھا ہے کہ دانشوروں کی کسی بات کا جواب نہ دو۔ مانا کہ یہ ترجمہ بھی آزاد ہے، کیونکہ ہم نے جاہلوں کا ترجمہ دانشوروں کر دیا ہے۔ تاہم موجودہ حالات کے مطابق یہی ترجمہ درست ہے کیونکہ آزادی سے پہلے ہمارے ملک کے دانشور، دانشور ہی کہلاتے تھے۔ مگر اب ان کا شمار جاہلوں میں ہونے لگا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دانشوروں کو بھی اب یہ آزادی حاصل ہو گئی ہے کہ جب جی چاہا جاہلوں کی سی بات کریں۔ آزادی کے یہی تو فائدے ہیں۔

جب تک ہمارا ملک آزاد نہیں ہوا تھا تب تک ہمیں روزمرہ کے کام کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ انگریز ہر معاملہ میں اپنی ٹانگ اڑا دیتے تھے۔ اب حالات بدل گئے ہیں کیونکہ ہم اب بالکلیہ آزاد ہیں۔ تاجروں کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جب جی چاہے چیزوں

کے دام بڑھادیں۔انھیں یہ بھی آزادی حاصل ہے کہ وہ چیزوں میں جی بھر کے ملاوٹ کریں۔ ایک مرغی کے گوشت میں ایک سالم اونٹ کا گوشت ملادیں اور یہ اعلان کریں کہ انھوں نے تو صرف پچاس فیصد ملاوٹ کی ہے۔اس ملاوٹ پر اونٹ اور مرغی کو بھلے ہی اعتراض ہو تو ہو لیکن عام آدمی کو اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

سیاستدانوں کو یہ آزادی ملی ہوئی ہے کہ وہ جتنی چاہیں پارٹیاں بدلیں۔جب جی چاہے اپنے نظریات بدل دیں۔یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد سیاسی پارٹیوں کی حیثیت 'ٹی پارٹیوں' کی سی ہوگئی ہے کہ چائے پی لی اور دوسری پارٹی کی طرف چلے گئے۔بعض لیڈروں کو تو اب یہ بھی یاد نہیں رہا کہ آزادی کے بعد وہ کتنی پارٹیاں بدل چکے ہیں۔ایک زمانہ میں لیڈر کسی پارٹی میں شامل ہوتا تھا تو اس پارٹی کے کارکن کی حیثیت سے ہی اس کا جنازہ اٹھتا تھا۔اب لیڈر کے جنازے کو کندھا دینے والے ایک ہی پارٹی کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ 'مخلوط جنازے' نکلتے ہیں۔

چاہے کچھ بھی ہو بڑی بات یہ ہے کہ ہم آزادی کی فضاء میں سانس لے رہے ہیں۔یہ اور بات ہے کہ ان دنوں فضاء میں آلودگی بہت بڑھ گئی ہے۔اس کی وجہ بھی آزادی ہے۔ہر ایک کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ فضاء کو آلودہ کرے۔اپنے گھر کی گندگی کو سڑک پر پھینک دے، اپنی موٹروں کا دھواں فضاء میں پھیلا دے، کارخانے ایسی جگہ قائم کرے جہاں سے آلودگی سیدھے لوگوں کی ناک میں چلی جائے کہیں اور نہ جائے۔دوسری طرف لوگوں کو یہ آزادی بھی حاصل ہے کہ وہ اس آلودہ فضاء کو جتنا چاہیں استعمال کریں کوئی پابندی نہیں ہے۔آزادی کے یہی تو فائدے ہیں۔یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ ہم نے آزادی انگریزوں سے حاصل کی تھی۔انگریز بڑے ظالم تھے جب تک اس ملک میں رہے تاریخ بناتے رہے جاتے ہوئے اس ملک کا جغرافیہ بگاڑ گئے۔ انگریز برسوں اس ملک کی دولت کو لوٹتے رہے کسی اور کو لوٹنے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے۔جب سے ملک آزاد ہوا ہے تب سے مقامی لوگوں کو بھی لوٹنے کی یہ آزادی مل گئی ہے۔مقامی تاجر، سرمایہ دار، صنعت کار، سیاستدان، افسر غرض سبھی لوٹنے کے معاملے میں آزاد ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ انگریز ملک کو لوٹتے تھے اب براہ راست عوام کو لوٹا جاتا ہے اور بہ بانگ دہل لوٹا جاتا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو لوٹنے والے غیر ملکی تو نہیں ہیں۔اپنے لوگ ہی اپنے لوگوں کو لوٹ رہے ہیں۔ غیروں کے ہاتھوں لٹنے سے بہتر تو یہی ہے کہ آدمی اپنوں کے ہاتھوں لٹ جائے۔آزادی سے

پہلے مقامی لوگوں کو لوٹنے کی یہ آزادی حاصل نہیں تھی کیونکہ انگریز اپنی ٹانگ اڑا دیتے تھے۔ انگریز تو خیر ہمارے ملک کی دولت کو برطانیہ پہنچاتے تھے لیکن اب مقامی افراد کو بھی یہ آزادی حاصل ہوگئی ہے کہ وہ اپنی فالتو دولت کو سوئیٹزرلینڈ میں رکھیں۔ آزادی سے پہلے کوئی اپنی دولت کو سوئیٹزرلینڈ میں رکھنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آزادی کے یہی تو فائدے ہیں۔

بچو! آزادی نے ہمیں کئی نعمتوں سے سرفراز کیا ہے۔ آزادی سے پہلے اس ملک میں اظہارِ خیال کی آزادی نہیں تھی اب اظہارِ خیال کی پوری آزادی ہے۔ اگر ایک مقرر کسی جلسہ میں ایک گھنٹہ سے لگاتار بول رہا ہو اور اگر ایسے میں کوئی اس کے لگاتار بولنے پر اعتراض کردے تو وہ بگڑ جائے گا کہ صاحب آپ کون ہوتے ہیں میرے اظہارِ خیال پر پابندی لگانے والے۔ اس ملک میں تو سب کو اظہارِ خیال کی آزادی حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اظہارِ خیال کی آزادی سے اب وہی لوگ زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں جن کے پاس خیال تو کوئی بھی نہیں ہوتا صرف اظہار کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اظہارِ خیال کی اس آزادی کا نتیجہ ہے کہ اس ملک میں اب ہر آدمی اپنی اپنی ڈفلی بجائے چلا جارہا ہے۔ آزادی سے پہلے لوگوں کی ڈفلیاں بیکار پڑی رہتی تھیں۔ اب یہ صورتحال نہیں رہی۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ انگریزوں نے اس ملک میں پہلی ریل گاڑی چلائی تھی۔ بعد میں ریل گاڑیاں تو بہت چلنے لگیں لیکن انگریزوں کے خوف کی وجہ سے ایک پٹڑی پر ایک ہی ریل گاڑی کو چلانا پڑتا تھا۔ اب چونکہ ملک آزاد ہوگیا ہے اس لئے ہمیں یہ آزادی مل گئی ہے کہ ہم دو مخالف سمتوں سے آنے والی ٹرینوں کو بھی ایک ہی پٹڑی پر چلادیں۔ مانا کہ اس طرح ٹرینوں کے حادثے ہوجاتے ہیں لیکن اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ملک کی آبادی قابو میں رہتی ہے اور دوسرا فائدہ یہ کہ بعض اوقات وزیر ریلوے شرماشرمی میں استعفیٰ بھی دیدیتا ہے۔ اگر حادثے نہ ہوں تو وزیر ریلوے کبھی استعفیٰ ہی نہ دے کیونکہ وزیر ایک بار گدی پر بیٹھ جاتا ہے تو پھر نیچے نہیں اُترتا۔ یہ ٹرینوں کے حادثوں کی برکت ہی ہے کہ اب تک ریلوں کے کئی وزیر استعفے دے چکے ہیں۔ انگریزوں کے زمانہ میں چونکہ دو مخالف سمتوں سے آنے والی ٹرینوں کو ایک ہی پٹڑی پر چلانے کی آزادی نہیں تھی اس لئے انگریز برسوں گدی پر بیٹھے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں بڑی مشکل سے اس ملک سے نکلنا پڑا۔ آزادی سے پہلے لوگ ملک کے لئے قربانی دینے کو ہر دم تیار

رہتے تھے۔اتنی قربانیاں دیں کہ 'قربانیوں' کا سارا اسٹاک ہی ختم ہوگیا۔اب ہر ایک کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنی قربانی اپنے پاس ہی رکھے۔اسے بلاوجہ ضائع نہ کرے۔

آزادی نے ہمیں کئی نئے لفظ بھی دئے ہیں۔لفظ 'گھوٹالہ' کو ہی لیجئے۔آزادی سے پہلے کوئی اس لفظ کو نہیں جانتا تھا اب بچہ بچہ جانتا ہے کیونکہ ہر شہری کو کوئی نہ کوئی گھوٹالہ کرنے کی آزادی حاصل ہے۔آئے دن اتنے گھوٹالے ہوتے رہتے ہیں کہ اب یہ روزمرہ زندگی کا معمول بن گئے ہیں۔اگر آزادی نہ ملتی تو ہماری زبان میں ایسے نئے نئے لفظ کہاں سے آتے۔ملک ترقی کرے یا نہ کرے ہماری زبان تو ترقی کرتی چلی جارہی ہے۔آزادی کے بعد ہمارے رہنماؤں نے طے کیا تھا کہ اس ملک سے 'غریبی' کو ہٹادیا جائے گا۔چنانچہ پچھلے کئی برسوں سے غریبی کو ہٹانے کی کوشش کی جارہی ہے۔یہ نہیں ہٹی تو اب سرکاریں غریبوں کو ہی ہٹانے میں لگ گئی ہیں۔

بچو! تم تو جانتے ہو کہ مہاتما گاندھی نے 'عدم تشدد' کے ذریعہ اس ملک کو آزادی دلائی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پاگل نے انھیں گولی مار کر شہادت کا درجہ عطا کردیا۔آزادی سے پہلے گولی مارنے کو بہت برا سمجھا جاتا تھا لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ہماری فلموں میں ہیرو اور ہیروئنوں کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی کہ پستولوں، بندوقوں، برچھوں اور بھالوں کی ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اب ملک میں ہر کس و ناکس کو گولی چلانے کی آزادی حاصل ہوگئی ہے۔

گولیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ایک دوا کی گولی اور دوسری پستول کی گولی۔دوا کی گولی سے وقتی طور پر علاج ہوجاتا ہے البتہ پستول کی گولی بہت مجرب ہوتی ہے۔اس سے گولی کھانے والے کی ساری بیماریوں کا ایک ہی وقت میں ہمیشہ کے لئے علاج ہوجاتا ہے۔

بچو! آؤ ہم سب مل کر آج کے دن آزادی کا جشن منائیں۔ذرا دیکھو تو سہی ہمیں کتنی آزادیاں ملی ہوئی ہیں۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۵/اگست ۱۹۹۹ء)

آئی اے ایس افسر کی ٹانگ

دیکھتے ہی دیکھتے خود ہماری نظروں کے سامنے ہماری جمہوریت کے اوپر سے پچاس برس بیت گئے۔ یہ اور بات ہے کہ جمہوریت کے ہاتھوں قوم پر جو کچھ بیتی ہے یا بیت رہی ہے وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ہماری نظروں میں جمہوریت کا مطلب اب صرف اتنا رہ گیا ہے کہ سال کے سال یوم جمہوریہ کے موقع پر ایک پریڈ کا اہتمام کیا جائے اور اس کے بعد جب بھی پارلیمنٹ کا اجلاس منعقد ہو تو شور شرابا اور ہنگامہ برپا کیا جائے۔ نئی نئی پارٹیاں بنائی جائیں اور لیڈر لوگ ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں جاتے رہیں۔ سرکاریں گرائی جائیں اور اقتدار کی مٹی پلید کی جائے۔ ہمیں دہلی میں رہتے ہوئے 28 برس بیت گئے۔ اس لمبے عرصہ میں ہم صرف ایک مرتبہ ہی یوم جمہوریہ کی پریڈ کو دیکھنے گئے تھے۔ اول تو یہ پریڈ دہلی کی شدید سردی میں آراستہ کی جاتی ہے جس کی وجہ سے جمہوریت کے ساتھ ساتھ ہر چیز ٹھٹھری ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے بعد پھر کبھی ہماری ہمت نہ ہوئی کہ اس پریڈ کو دیکھنے جائیں۔ اس ملک میں جمہوریت کو ٹھٹھرنا ہے تو وہ ٹھٹھرتی رہے، ہم کیوں بلاوجہ ٹھٹھریں۔ جمہوریت کے ہاتھوں سال بھر تو یونہی ٹھٹھرتے رہتے ہیں۔ پھر اس میں جو جھانکیاں نکالی جاتی ہیں ان کا کوئی مطلب ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ یوم جمہوریہ کی کسی پریڈ میں آج تک ہمیں ایسی کوئی جھانکی نظر نہیں آئی جس میں عام آدمی کے مسائل اور اُس کے دکھ درد کو پیش کیا گیا ہو۔ ہمارا بس چلے تو ایک جھانکی 'رشوت ستانی' کی نکالیں جس میں یہ دکھایا جائے کہ کس کس طرح عام آدمی سے رشوت لی جاتی ہے۔ 'ملاوٹ' کی بھی ایک شاندار جھانکی ہو سکتی

ہے۔ایک جھانکی اُس 'روٹی' کی نکالی جائے جسے دو وقت حاصل کرنے کی خاطر ہمارا عام آدمی کتنا ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ایک جھانکی پارٹیاں بدلنے والے لیڈروں کی نکالی جائے بلکہ فوجی دستوں کے ساتھ ساتھ ان لیڈروں کے ایک دستہ کو بھی مارچ پاسٹ میں شامل کیا جائے۔اور ان کے عین پیچھے ننگے بھوکے انسانوں کا ایک دستہ بھی نکالا جاسکتا ہے۔قاتلوں، شرپسند عناصر، فرقہ پرستوں اور نفع خور تاجروں کے دستے بھی پریڈ میں ضرور شامل ہوں۔جہیز نہ لانے والی لڑکیوں کو جلانے کی ایک جھانکی بھی شامل ہونی چاہئے۔سچ پوچھئے تو ایسی جھانکیوں کے بغیر ہماری جمہوریت کی تصویر کہاں مکمل ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ 'جشن جمہوریہ' کے دن ہم کچھ بھی نہیں کرتے کیونکہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس دن کیا کریں۔پہلے کبھی ٹیلی ویژن پر اس پریڈ کو دیکھ لیا کرتے تھے، اب وہ بھی چھوڑ دیا ہے۔چنانچہ اس یومِ جمہوریہ کے موقع پر یونہی وقت گذارنے کے لئے ہم نے اخبار پڑھنا شروع کیا تو ہماری نظر ایک خبر پر پڑی جس کے مطابق بہار کے محکمہ سرکاری زبان کے سکریٹری اور سینئر آئی اے ایس عہدیدار مسٹر بی کے ورما نے سکریٹری امور داخلہ کو ایک خط لکھ کر آگاہ کیا ہے کہ بہار کے وزیر سرکاری زبان روپ نارائن جھا ان کی ٹانگ توڑنے کی دھمکی دے رہے ہیں (حالانکہ سرکاری زبان کا محکمہ اس لئے قائم کیا جاتا ہے کہ سب مل کر سرکاری زبان کی ٹانگ توڑیں)۔خبر کے مطابق مسٹر روپ نارائن جھا نے ایک دن دوپہر کے وقت سخت غصہ کی حالت میں مسٹر بی کے ورما کو فون کرکے کہا "ہم تمہاری ٹانگ توڑ دیں گے"۔یہ کہہ کر انھوں نے فون رکھ دیا۔اتنا سننے کے بعد مسٹر ورما بعجلت ممکنہ اپنی ٹانگوں کی مدد سے چل کر اپنے گھر چلے گئے اور وہاں جاکر انھوں نے مذکورہ بالا خط سکریٹری امور داخلہ کو روانہ کردیا۔مسٹر ورما کا کہنا ہے کہ وزیر سرکاری زبان اکثر اوقات ان سے ایسے کام کرنے کو کہتے ہیں جو سرکاری قواعد کے مطابق جائز نہیں ہوتے۔مسٹر ورما جب بھی ایسے احکامات کی تعمیل سے معذوری ظاہر کرتے ہیں تو وزیر سرکاری زبان ناراض ہوجاتے ہیں اور اب تو وہ مسٹر ورما کی ٹانگ توڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔مسٹر ورما نے اپنے خط میں یہ گذارش کی ہے کہ ان کی ٹانگوں کی حفاظت کے لئے مناسب سیکوریٹی کا بندوبست کیا جائے اور جب تک یہ بندوبست نہیں کیا جاتا تب تک وہ دفتر نہیں جائیں گے۔دیکھا جائے تو مسٹر ورما کی گذارش نہایت جائز ہے کیونکہ ایک آئی اے ایس عہدیدار کی شخصیت میں ٹانگ ہی ایک ایسا عضو ہوتا ہے جسے بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور جب ٹانگ کا وجود ہی خطرہ میں

پڑ جائے تو بیچارہ آئی اے ایس عہدیدار اپنی باقی ماندہ شخصیت کو لے کر کیا کرے۔

جس کو ہو اپنی ٹانگ عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں؟۔ ماشاء اللہ زندگی میں کئی آئی اے ایس عہدیداروں سے ہمارے بھی گہرے مراسم رہ چکے ہیں جیسے بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، ہاشم علی اختر، خواجہ عبدالغفور، حسن الدین احمد وغیرہ۔ خدا کے فضل سے ان شریف النفس عہدیداروں کا شمار اُن آئی اے ایس عہدیداروں میں ہوتا تھا جنہوں نے زندگی بھر اپنی ٹانگوں کا استعمال اسی مقصد کے لئے کیا جس مقصد کے لئے قدرت نے انھیں اُن کے جسموں میں پیوست کر دیا تھا یعنی صرف چلنے پھرنے کے لئے۔ انھوں نے کسی معاملہ میں اپنی ٹانگ نہیں اڑائی حالانکہ بعض آئی اے ایس عہدیداروں کی شہرت، جسے آپ بدنامی بھی کہہ سکتے ہیں، ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی ٹانگ کی وجہ سے ہوتی ہے جو ہر اچھے بھلے معاملہ میں بلاوجہ اڑ جاتی ہے۔ کتنے ہی ضرورت مندوں اور غرض مندوں کے کام آئی اے ایس عہدیداروں کی اسی ٹانگ کی وجہ سے رُکے رہتے ہیں۔ کئی برس پرانی بات ہے۔ ایک بار کسی چھوٹے سے کام کے سلسلہ میں ہم بے خیالی میں ایک آئی اے ایس عہدیدار کے کمرہ میں چلے گئے تھے۔ پہلے تو انھوں نے بڑے غصہ کے ساتھ ہمیں دیکھا اور جب ہم نے اپنے کام کی بات کی تو بولے "آپ اجازت لئے بغیر میرے کمرہ میں کیسے آگئے؟"

ہم نے کہا "مگر اب تو ہم آپ کے کمرہ میں آچکے ہیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے"

بولے "تب تو آپ کمرہ سے باہر جا کر دوبارہ اجازت لے کر آئیں"۔

ہم نے کہا "اگر آپ ہمارا کام کرنے کا وعدہ کریں تو ہم دوبارہ اجازت لے کر آپ کے کمرہ میں آنے کو بھی تیار ہیں ورنہ ہمارے دوبارہ یہاں آنے کا کیا فائدہ؟"

بولے "پہلے آپ اجازت لے کر آیئے تو سہی۔ کام اگر جائز ہوا تو کر دیں گے۔ ابھی سے ہم کیسے وعدہ کر دیں"

اور ہم الٹے پاؤں وہاں سے نکل آئے۔ اتفاق سے ان کے افسر بالا، جو خود بھی آئی اے ایس عہدیدار ہونے کے علاوہ ان کے محکمہ کے سکریٹری بھی تھے، ہمیں اچھی طرح جانتے تھے۔ ہم نے سوچا تھا کہ اتنے معمولی سے کام کے لئے انھیں کیا زحمت دیں۔ سو ہم وہاں سے نکل کر سیدھے سکریٹری کے کمرہ میں اجازت لئے بغیر چلے گئے۔ بہت خوش ہوئے۔ چائے منگائی اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اتنے میں عہدیدار موصوف بھی ڈرتے سہمتے

ہوئے سکریٹری کے کمرہ میں چلے آئے۔(یہ اور بات ہے کہ اجازت لے کر آئے تھے۔) سکریٹری نے جب ہم سے ان کا تعارف کرانا چاہا تو ہم نے کہا ''حضور ہم انھیں اچھی طرح جانتے ہیں''۔

اب یہ سکریٹری کی بڑائی تھی کہ انھوں نے ہم سے یہ نہیں پوچھا کہ ہم اُنھیں کیسے جانتے ہیں۔اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ سکریٹری کے پاس ایک ایسی ٹانگ تھی جو صرف چلنے پھرنے کے کام آتی تھی جب کہ ان کے جونیئر عہدیدار کے پاس ایسی ٹانگ تھی جو اڑانے کے کام آتی ہے۔بہر حال آئی اے ایس افسر کی ٹانگ کی اپنی ایک الگ اہمیت ہوتی ہے لیکن بہار کے سکریٹری سرکاری زبان مسٹر ورما کا معاملہ دوسرا ہے۔انھوں نے جب دیکھا کہ ان کا وزیر ہر معاملہ میں غلط ٹانگ اڑا رہا ہے تو انھوں نے اپنی آئی اے ایس والی ٹانگ اڑا دی۔اسے کیا کیجئے کہ اب ہماری جمہوریت میں وزیر کی ٹانگ کو عہدیدار کی ٹانگ پر فوقیت حاصل ہوگئی ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وزیر اپنی ٹانگ اڑانے کی خاطر آئی اے ایس عہدیدار کی ٹانگ کو توڑنا شروع کردیں۔ مانا کہ حکومت آئی اے ایس عہدیدار کی ٹانگ کی حفاظت کے لئے کسی محافظ کا بندوبست کردے گی لیکن اگر وزیر نے ان کی ٹانگ کی بجائے ان کے جسم کے کسی اور عضو کو توڑنے کا فیصلہ کرلیا تو کیا ہوگا۔اب یہ تو ممکن نہیں کہ آئی اے ایس عہدیدار کے ہر عضو کی حفاظت کے لئے ایک الگ محافظ مقرر کیا جائے۔آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال بھی دسمبر کے مہینہ میں ہی جب راجستھان میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت تھی تو وہاں کے وزیر آب پاشی نے اپنے محکمہ کے سکریٹری اور سینئر آئی اے ایس عہدیدار مسٹر پی کے دیو کی پٹائی کی تھی۔نہ صرف پٹائی کی تھی بلکہ اس عہدیدار کا ایک انگوٹھا بھی غالباً اس غلط فہمی میں توڑ دیا تھا کہ کہیں عہدیدار بھی ان کی طرح انگوٹھا چھاپ نہ ہو۔معلوم ہوا تھا کہ اس وزیر نے اس سے پہلے بھی کئی آئی اے ایس عہدیداروں کی پٹائی کی تھی۔یوم جمہوریہ کے موقع پر ہمیں یہ باتیں اس لئے یاد آئیں کہ جب اس ملک میں آئی اے ایس عہدیداروں کے جمہوری حقوق تک محفوظ نہیں ہیں تو وہاں ہم جیسوں کے جمہوری حقوق کے بارے میں کون سوچے گا۔ایسی ہی وجوہات ہیں جن کے باعث جمہوریت پر سے ہمارا اعتقاد اٹھتا چلا جارہا ہے۔ہمیں تو یوں لگتا ہے جیسے کسی کی ٹانگ ٹوٹے یا نہ ٹوٹے ہماری جمہوریت کی ٹانگ تو آئے دن ٹوٹتی چلی جارہی ہے بلکہ ہمیں تو حیرت ہے کہ اب تک یہ چل کس طرح رہی ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۳۰؍جنوری ۲۰۰۰ء)

☆☆

رام پرکاش گپتا کی یادداشت

اختر انصاری مرحوم کا ایک مشہور شعر ہے

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اس شعر کو ہم نے روزمرہ کی بات چیت میں بلا مبالغہ سینکڑوں مرتبہ استعمال کیا ہوگا۔ یاد پڑتا ہے کہ بیس پچیس برس پہلے کسی نے ہمیں بتایا تھا کہ یہ شعر اختر انصاری کا ہے۔ یہ شعر تو ہمیں ہمیشہ یاد رہا لیکن بعد میں ہم یہ بات بھول گئے کہ اس شعر کے خالق اختر انصاری ہیں۔ پچھلے دنوں اختر انصاری کے بارے میں نورالحسن نقوی کا خاکہ پڑھا تو دوبارہ پتہ چلا کہ یہ شعر اختر انصاری کا ہے۔ تب احساس ہوا کہ قدرت اب سچ مچ ہمارے حافظ کو چھیننے کے درپے ہے۔ کہتے ہیں کہ اختر انصاری کا ماضی نہایت دردناک، غمناک اور افسوسناک وغیرہ تھا۔ تبھی تو انھوں نے اپنے ماضی اور حافظے دونوں سے دستبردار ہونے کی پیش کش کی تھی۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہمارا ماضی بھی کچھ کم المناک نہیں ہے۔ بُرے مفہوم والے لفظوں کے آگے 'ناک' لگاتے بلکہ رگڑتے چلے جائیں تو ایک لمبی فہرست مرتب ہو جائے۔ لیکن صرف اتنی سی بات پر ہم اپنے حافظہ سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ ہمیں تو اپنے دکھوں اور غموں سے بھی پیار ہے بلکہ سُکھ سے زیادہ دُکھ سے پیار ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ آپ جس دکھ کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے گذرے ہوں اسے اپنے حافظہ سے نکال دیں۔ بہرحال یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا

حافظہ جیسا بھی سہی برقرار ہے لیکن ادھر کچھ دنوں سے ہمیں محسوس ہو رہا ہے کہ ہماری یادداشت متاثر ہوتی جارہی ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ پہلے ہم کوئی بات نہیں بھولتے تھے۔ دوستوں سے لئے ہوئے قرض کی رقم ہمیں کبھی یاد نہیں رہی۔ رقم کی واپسی کے لئے دوستوں کو نہ صرف ہمیں یاد دلانا پڑتا تھا بلکہ حسب توفیق تقاضہ بھی کرنا پڑتا تھا لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہم نے کسی دوست کو بحالت مجبوری کچھ رقم بطور قرض حسنہ دی ہو اور اسے بھول گئے ہوں۔ تاہم پچھلے دنوں ہمارے ایک دوست نے جب ہمیں سو روپے واپس کرتے ہوئے بتایا کہ ہم نے انھیں یہ رقم ایک مہینہ پہلے بطور قرض دی تھی تو ہمیں یہ بات بالکل یاد نہیں تھی۔ ہم نے سوچا کہ یا تو ہماری مالی حالت بہتر ہوگئی ہے یا پھر ہماری یادداشت خراب ہوتی جارہی ہے۔ ہمیں تو موخرالذکر صورت کا اندیشہ زیادہ نظر آتا ہے۔ بہرحال ہم اپنی یادداشت کے تعلق سے فکرمند ہونے لگے تو خوش قسمتی سے ہماری نظر اس خبر پر پڑی جس کے مطابق اتر پردیش کے 76 سالہ چیف منسٹر رام پرکاش گپتا کا حافظہ تو اتنا خراب ہے کہ انھیں اپنی کابینہ کے وزیروں کے نام بھی یاد نہیں رہتے (کابینہ اتنی بڑی بھی نہیں ہونی چاہئے کہ چیف منسٹر کو اپنے کابینی رفقا کے نام یاد رکھنے میں دشواری پیش آئے)۔ پچھلے دنوں اُنھوں نے ایک شخص کو پکڑ کر پوچھا ''تم کون ہو؟ اور اس کمرے میں کیا کر رہے ہو؟''۔ اس پر اس شخص نے جواب دیا ''حضور! میں شیویندر سنگھ ہوں اور آپ سے وابستہ محکمہ کا مملکتی وزیر ہوں''۔ تب چیف منسٹر نے پوچھا ''اگر تم شیویندر سنگھ ہو تو پھر گھنگھریالے بالوں والا وہ دوسرا شخص کون ہے؟۔ کیا وہ بھی منسٹر ہے؟''۔ لوگوں کو احساس ہوا کہ چیف منسٹر کا اشارہ رنگناتھ مشرا کی طرف ہے جو خود بھی مملکتی وزیر ہونے کے علاوہ اپنے سر پر گھنگھریالے بال بھی رکھتے ہیں۔ رام پرکاش گپتا کا کمزور حافظہ اب سیاسی اور سماجی حلقوں میں خاصا زیر بحث ہے۔ تاہم انھیں کچھ یاد ہو یا نہ یاد ہو، یہ ضرور یاد ہے کہ 1967ء میں وہ اُتر پردیش کے ڈپٹی چیف منسٹر تھے چنانچہ اپنی ہر بات وہ اسی حوالہ سے کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں مرکزی وزیر توانائی پی آر کمارا منگلم سے ان کی ملاقات ہوئی تو رام پرکاش گپتا نے ان سے پوچھا ''جب میں اُتر پردیش کا ڈپٹی چیف منسٹر تھا تو آپ تب بھی مرکزی کابینہ میں تھے نا؟''۔ اس کے جواب میں کمارامنگلم نے قدرے توقف کے بعد کہا ''چیف منسٹر صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں میں نہیں بلکہ میرے والد موہن کمارمنگلم مرکزی کابینہ میں تھے''۔ ارکان اسمبلی اور سیاسی قائدین ان کی اس کمزور یادداشت کا خوب فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں۔ ایک رکن اسمبلی

نے کہا چیف منسٹر سے جو بھی کام کروانا ہو ہاتھ کے ہاتھ کروالو۔ دوسرے دن آپ پھر ان کے پاس جائیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ پوچھ بیٹھیں کہ آپ کون ہیں اور کس سلسلہ میں ان سے ملنے آئے ہیں۔

رام پرکاش گپتا کے کمزور حافظہ کے بارے میں بھلا ہم کیا اظہارِ خیال کریں کیونکہ سیاستدانوں کا حافظہ عموماً خراب ہی ہوتا ہے۔ الیکشن سے پہلے وہ عوام سے سینکڑوں وعدے کرتے ہیں لیکن برسراقتدار آتے ہی انھیں یہ وعدے یاد نہیں رہتے۔ ایسی باتوں کا تعلق سیاسی قائدین کے کمزور حافظہ سے نہیں بلکہ ہمارے اس سیاسی نظام سے ہے جس میں وعدے کئے ہی اس لئے جاتے ہیں کہ بعد میں انھیں بھلا دیا جائے۔ تاہم ہمارا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ رام پرکاش گپتا کا حافظہ بالکل خراب نہیں ہے کیونکہ اُنھیں یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ ایودھیا میں رام مندر کی تعمیر کا مسئلہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایجنڈے میں شامل ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے دیگر لیڈر ایجنڈے کے اس مسئلہ کو بھول گئے ہیں تو کیا ہوا۔ رام پرکاش گپتا کو یہ مسئلہ اچھی طرح یاد ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مہینہ بھر پہلے انھوں نے کہا تھا کہ رام مندر کی تعمیر کا مسئلہ اترپردیش کی بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایجنڈے میں شامل ہے۔ اس پر سارے ملک میں ہنگامہ ہوا تھا۔ بعد میں انھیں سمجھایا گیا کہ وہ مستقبل میں اپنے حافظہ کی مضبوط گرفت کا مظاہرہ نہ کریں۔ لیکن پچھلے ہفتہ انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں اس مسئلہ کو پھر سے اٹھایا۔ چنانچہ پھر ہنگامہ ہوا۔ اس پر ہمارے ایک صحافی دوست نے کہا ''رام پرکاش گپتا کا حافظہ واقعی خراب ہوگیا ہے۔ انھیں یہ یاد نہیں رہتا کہ انھیں اس مسئلہ کو اٹھانے سے منع کیا گیا ہے۔ مانا کہ ان کا حافظہ خراب ہے لیکن بنیادی بات تو انھیں اچھی طرح یاد رہتی ہے''۔

سیاسی قائدین کے کمزور حافظہ کے بارے میں ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے کیونکہ ہمارے بیشتر لیڈروں نے اتنی پارٹیاں بدلی ہیں کہ خود انھیں اب یہ یاد نہیں کہ وہ شروع میں کیا تھے اور اب کیا ہیں۔ دیکھا جائے تو خود ہمارا حافظہ بھی خراب ہوتا جارہا ہے۔ پھر حالات دن بہ دن کچھ ایسے سنگین ہوتے جارہے ہیں کہ انھیں یاد رکھنے کی بجائے انھیں بھول جانے میں ہی عافیت نظر آنے لگی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ جس طرح دروغ مصلحت آمیز ایک چیز ہوتی ہے اسی طرح حافظہ کو بھی مصلحت اندیش ہونا چاہئے۔ آدمی وہی بات یاد رکھتا ہے جس میں اس کا فائدہ مضمر ہو اور وہ بات بھول جاتا ہے جسے یاد رکھنے سے نقصان کا احتمال ہو۔ بے لوث بھلکو اب دن بہ دن کم ہوتے

جارہے ہیں۔ ایک ایسی معصوم غائب دماغی جس پر پیار آجائے اب دیکھنے کو نہیں ملتی۔

یادش بخیر! ہمارے ایک آرٹسٹ دوست ہوا کرتے تھے۔ ہمیشہ کھوئے کھوئے سے، سدا کسی نہ کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے۔ چیزیں ایسی بے ساختگی اور روانی کے ساتھ بھولتے تھے کہ ہنسی آجاتی تھی۔ ایک دن ہمارے دفتر آئے تو دیکھا کہ ان کے ایک پاؤں میں تو چپل ہے لیکن دوسرے پاؤں میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ گھر سے نکلتے وقت وہ دوسری چپل پہننا بھول گئے تھے۔ ہم نے شام میں ان کی اہلیہ سے کہا کہ جب آپ کے شوہر گھر سے باہر نکلنے لگیں تو انھیں کم از کم یاد تو دلایا کیجئے کہ وہ دونوں پاؤں میں چپلیں پہنیں۔ کہنے لگیں "یہ میرے بار بار یاد دلانے کا نتیجہ ہی ہوتا ہے کہ وہ کم از کم ایک پاؤں میں تو چپل پہن لیتے ہیں۔ اگر میں یاد نہ دلاؤں تو کیا عجب کہ وہ دوسرے پاؤں میں بھی چپل نہ پہنیں"۔ ہمارے ان ہی بھلکڑ دوست کا قصہ ہے کہ ایک دن یہ بھری دوپہر میں ہمارے دفتر آئے اور آتے ہی ہم سے پوچھا "تمہارے پاس کوئی رسیدی ٹکٹ ہے؟"۔ ہم نے فوراً ایک رسیدی ٹکٹ نکال کر انھیں دیدیا۔ انھیں یہ رسیدی ٹکٹ کسی رسید پر چسپاں کرنا تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اور جب رسید پر رسیدی ٹکٹ چسپاں کرنے کا انھیں دوبارہ خیال آیا تو پتہ چلا کہ رسیدی ٹکٹ کہیں غائب ہوگیا ہے۔ ہم نے کچھ دیر پہلے ہی خود اپنے ہاتھ سے انھیں رسیدی ٹکٹ دیا تھا۔ ہر جگہ تلاش کیا مگر یہ نہ ملا۔ اتنے میں اچانک ہمارے ذہن میں ایک خیال آیا تو ہم نے اپنے آرٹسٹ دوست سے کہا کہ وہ اپنی زبان باہر نکالیں۔ زبان باہر نکلی تو دیکھا کہ رسیدی ٹکٹ رسید کے بجائے اُن کی زبان پر چپکا ہوا ہے۔ گویا ہمارے دوست نے رسیدی ٹکٹ کو گیلا کرنے کے لئے اسے اپنی زبان پر تو رکھا لیکن اسے وہاں سے نکال کر رسید پر چسپاں کرنا بھول گئے۔ ایسے بے لوث بھولنے والے جنھوں نے بھولنے کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہو اب کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ رام پرکاش گپتا جی کی یادداشت اگر کمزور ہوگئی ہے تو انھیں اس بات کا یقین بھی ہے کہ اس کمزور یادداشت سے ان کا فائدہ ہی ہوگا نقصان نہیں۔

روزنامہ "سیاست" (۶ر فروری ۲۰۰۰ء)

☆☆

شبنم خالہ کو آداب

اس بار ملک میں جو نئے اسمبلی انتخابات ہوئے ہیں اُن میں بہار اسمبلی کے لئے پانچ چھ ایسے امیدوار بھی منتخب ہوئے ہیں جو قتل، ڈکیتی، غارتگری اور دنگوں وغیرہ کے مقدموں میں ملوث ہیں اور جیلوں میں آرام فرما رہے ہیں۔ دو چار کو تو ٹیلی ویژن پر بھی دکھایا گیا کہ سلاخوں کے پیچھے بند ہیں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی ہیں اور ان کے مدّاح انھیں ان کی جیت پر لڈو کھلا رہے ہیں۔ لڈو کھاتے کھاتے ان نو منتخب ارکان اسمبلی نے ان کاموں کے بارے میں بتایا جو وہ اپنے رائے دہندوں کی فلاح و بہبود کے لئے انجام دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ جب تک عدالتوں میں ان کا جرم ثابت نہیں ہو جاتا تب تک وہ ملک اور قوم کی خدمت کرتے رہیں گے۔ گویا کہنا یہ چاہتے ہوں کہ اگر قوم کی خدمت کے لئے مستقبل میں بھی انھیں کسی کو قتل کرنا پڑ جائے تو وہ اس سے نہیں چوکیں گے۔ عوام بھلے ہی قتل ہو جائیں لیکن اس ملک میں جمہوریت کا قتل نہیں ہونا چاہئے۔ پچھلے پچاس برسوں میں ہماری جمہوریت نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اب قتل کرنے کو بھی ایک جمہوری حق کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ہمارے پرانے لیڈر جب مرتے تھے تو ان کے حالات زندگی کو بیان کرتے وقت بڑے فخر کے ساتھ بتایا جاتا تھا کہ مرحوم قوم کی خدمت کی خاطر اتنی بار جیل گئے، اپنا گھر بار اور ساری جائیداد قوم پر نچھاور کر دی۔ آج کے لیڈر جب مریں گے (پتہ نہیں کب مریں گے) تو ان کے حالات زندگی کو بیان کرتے وقت بڑے فخر کے ساتھ بتایا جائے گا کہ مرحوم نے پندرہ قتل کیے، پچاس ڈاکے ڈالے اور بیسیوں موٹریں اور

کروڑوں روپیہ کا کالا دھن نہ صرف چھوڑ گئے بلکہ اپنے بڑے بیٹے کو بھی گدی پر بٹھا کر گئے کہ وہ بھی اس کالے دھن میں اضافہ کرتا رہے۔ سچ ہے کہ وقت بدلتا ہے تو جمہوریت کی قدریں بھی بدل جاتی ہیں۔ ہمارے ایک صحافی دوست ایک لیڈر کی نیک نامی، ایمانداری اور دیانتداری کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ موصوف پر بدعنوانیوں اور گھپلوں کے دس مقامات چلے لیکن یہ ان سب سے باعزت بری ہوگئے۔ ان کی ایمانداری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہئے۔ خیر اس معاملہ میں ہم مزید کچھ کہنا نہیں چاہتے کیونکہ اس ملک میں جب اچھے اچھوں کی زبانیں بند ہیں تو ہم کیوں اپنی زبان کھولیں۔ ہمیں بھی تو اپنی جان پیاری ہے اور ہم مقتول کہلائے جانے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔

تاہم آج ہم مدھیہ پردیش کی اُس رکن اسمبلی کے بارے میں ضرور کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جن کا اسم گرامی شبنم موسی یعنی شبنم خالہ ہے اور جو سہاگ پور کے حلقہ اسمبلی سے ضمنی انتخابات میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے امیدوار کو اٹھارہ ہزار ووٹوں سے ہرا کر منتخب ہوئی ہیں۔ موصوف یا موصوفہ کے بارے میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ وہ اس ملک کے پہلے ہیجڑے ہیں جنھیں رکن اسمبلی بننے کا شرف حاصل ہوا ہے (خیر ہم اولیت والے اس دعویٰ کو تو قبول نہیں کریں گے کیونکہ اس سے پہلے بھی کئی ہیجڑے نہ صرف ایوان اسمبلی بلکہ ایوان پارلیمنٹ میں بھی منتخب ہو کر جاتے رہے ہیں۔ اگر انھوں نے باضابطہ طور پر اپنے ہیجڑے ہونے کا اعلان نہیں کیا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تالی تو وہ بھی بجاتے رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس مہارت کے ساتھ نہیں بجا سکتے جس مہارت کے ساتھ ہماری شبنم خالہ بجاتی ہیں)۔ شبنم خالہ کے رکن اسمبلی بننے پر کچھ لوگ مذاق اُڑا رہے ہیں کہ اب تو ہیجڑے بھی ہمارے قانون ساز اداروں میں پہنچنے لگے ہیں۔ اعتراض کرنے والوں سے ہم یہ پوچھنا چاہیں گے کہ جب اس ملک میں قاتل، ڈاکو، اسمگلر اور بدنام زمانہ لوگ تک اسمبلی میں چلے جاتے ہیں تو ہیجڑے کیوں نہ جائیں۔ ان بیچاروں یا بیچاریوں نے کیا قصور کیا ہے۔ پرسوں ہم نے دوستوں کی محفل میں یونہی اس قبیلہ کی مدافعت میں کہہ دیا کہ یہ لوگ ملک کی جتنی بے لوث خدمت انجام دے سکتے ہیں وہ کوئی اور انجام نہیں دے سکتا۔ پہلی وجہ تو یہ کہ ان کے نہ بیوی، نہ شوہر اور نہ ہی بال بچے۔ ان کی کوئی خاندانی ذمہ داریاں تو ہوتی ہی نہیں کہ ان کے بال بچے قوم پر بھاری پڑ جائیں۔ ہمارے بیشتر لیڈروں کے ساتھ مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے

اپنے خاندان کی خدمت کرتے ہیں اور بعد میں اگر فرصت ملے تو قوم کی خدمت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے وہ اپنے بیٹوں، دامادوں، بھانجوں، بھتیجوں کے مفادات کے بارے میں سوچتے ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صرف ان ہی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ کرتے تو خاندان کی خدمت ہیں لیکن اسے 'قوم کی خدمت' کا عنوان دیتے ہیں۔ ارے صاحب اس کے جواب میں دوستوں نے ہمیں اس قبیلہ کے علمبردار کا عنوان عطا کر دیا۔ بھلا بتایئے ہم نے کونسی غلط بات کہی تھی۔ پھر اس قبیلہ کی خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ سراغ رسانی کے میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہوتا۔ سب کے نجی حالات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ کئی برس پہلے جب ہماری شادی ہوئی تھی تو یہ بن بلائے ہی خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے پہنچ گئے تھے کہ انعام دو اکرام دو۔ ہم نے جیسے تیسے انھیں ٹالا تو ٹھیک دس مہینے بعد عین اُس وقت ہمارے گھر پہنچے جب ہمارے گھر میں پہلے بیٹے کی ولادت ہوئی تھی حالانکہ ہم نے اُنھیں کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ بعد میں بھی یہ ایسے موقعوں پر ہمیں اپنی عنایتوں سے نوازتے رہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ اگر ان کی خدمات سے مناسب استفادہ کیا جائے تو حکومت کو سراغ رسانی اور خفیہ امور کے محکمے رکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ خرچ بھی کم ہو اور نتیجہ بھی ٹھیک نکلے۔

یہ لوگ خود تو شادی نہیں کرتے لیکن دوسروں کی شادی بیاہ اور چھلّے چھٹی کے سلسلہ میں جو دلچسپی لیتے ہیں اس پر ہمیں قدرت اللہ شہاب کے وہ ماتحت پیشکار یاد آگئے جو اپنے حُسن انتظام کے لئے اپنے علاقہ میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ قدرت اللہ شہاب جب آئی سی ایس میں منتخب ہو کر کسی ضلع کے کلکٹر مقرر ہوئے تو یہ پیشکار صاحب ان کی ماتحتی میں آگئے۔ یہ دفتر کا کام تو کم کرتے تھے لیکن کلکٹر کے گھریلو کام زیادہ انجام دیتے تھے۔ اس لئے قدت اللہ شہاب کی والدہ کے چہیتے اور منظورِ نظر ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب قدرت اللہ شہاب کی شادی مقرر ہوئی تو شادی کے سارے انتظامات ان پیشکار صاحب کے تفویض ہی کئے گئے۔ بینڈ باجے سے لے کر مہمانوں کی خاطر تواضع اور حجلہ عروسی کی سجاوٹ تک کے سارے کام ان ہی کی نگرانی میں انجام پائے۔ غرض پیشکار صاحب کے حُسن انتظام کے خوب خوب چرچے ہوئے۔ شادی کے بعد جب قدرت اللہ شہاب حجلہ عروسی میں داخل ہوئے اور جیسے ہی انھوں نے اپنی نئی نویلی دلہن کے چہرے سے گھونگھٹ ہٹایا تو اچانک ایک سیٹی کے بجنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی باہر بینڈ باجہ بھی بجنے لگا۔

قدرت اللہ شہاب نے گھبرا کر اچانک اوپر دیکھا تو روشندان میں اپنے پیشکار صاحب کو جھانکتے ہوئے اور سیٹی بجاتے ہوئے پایا۔ اللہ اللہ کیا حُسن انتظام تھا۔ شبنم خالہ کے قبیلہ کے افراد بھی ایسے معاملوں میں ایسے ہی حُسن انتظام کے قائل ہوتے ہیں۔ انھیں کسی خفیہ ایجنسی یا سی آئی ڈی وغیرہ کی مدد کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ہمیں یقین ہے کہ ایسے لوگ رکن اسمبلی بن جائیں تو انھیں اپنے حلقہ کے عوام کے حالات کو جاننے میں اتنی دشواری نہیں ہوگی جتنی کہ عام ارکان اسمبلی کو پیش آتی ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ ایسے لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں قانون ساز اداروں میں چلے جائیں اور ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھالیں۔

یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ یہ لوگ بڑے حاضر جواب ہوتے ہیں اور لیڈری میں حاضر جوابی اور حاضر دماغی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ خود ہمارے پاس ان کی حاضر جوابی کا ایک ایسا تجربہ ہے جسے ہم آج تک فراموش نہ کر سکے۔ ۱۹۶۲ء میں جب چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تو فوج میں نوجوانوں کی عام بھرتی ہونے لگی۔ ہم شام میں حیدرآباد کے مدینہ ہوٹل میں چند احباب کے ساتھ بیٹھے تھے کہ وہاں اس قبیلہ کے کچھ لوگ آ گئے۔ ہم نے یونہی مذاق میں ان میں سے ایک سے کہہ دیا ''تم لوگ ہٹے کٹے اور صحت مند ہو۔ فوج میں بھرتی ہو کر محاذ جنگ پر لڑنے کے لئے کیوں نہیں جاتے؟۔'' موصوفہ نے اچانک ہمارے منہ کے آگے ایک زوردار تالی ٹھونکی اور فرمایا ''اگر تم وعدہ کرو کہ ہمارے پیچھے یہاں تالی بجانے اور ہمارے ذمہ کے دوسرے ضروری کام تم کرتے رہو گے تو ہم ابھی محاذِ جنگ پر جانے کو تیار ہیں''۔ حاضر جوابی کی اس انمول مثال کو بخدا ہم آج تک فراموش نہ کر سکے بلکہ جب بھی اسے یاد کرتے ہیں تو پسینہ میں شرابور ہو جاتے ہیں۔ اور آج جب شبنم خالہ مدھیہ پردیش اسمبلی کی رکن بن گئی ہیں تو ہم اپنے لیڈروں کو مخلصانہ مشورہ دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے ذمہ کے کام شبنم خالہ کے قبیلہ کے لوگوں کے حوالہ کر دیں۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۲؍مارچ ۲۰۰۰ء)

☆☆

قوم کے درد سے گھٹنے کے درد تک

اب یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی کہ ہم بھی اسی مرض میں مبتلا ہیں جس میں وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی مبتلا ہیں۔ یہاں ہماری مراد قوم کے درد سے نہیں بلکہ گھٹنوں کے درد سے ہے۔ وزیراعظم کے بارے میں تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے البتہ اپنے بارے میں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ایک عرصہ تک قوم کے درد نے ہمیں بہت پریشان کئے رکھا۔ لیکن جب گھٹنوں کا درد ہماری ذات میں آہستہ آہستہ بڑھنے لگا تو قوم کا درد پس پشت چلا گیا۔ یوں بھی قوم کا درد اُس وقت تک بھلا معلوم ہوتا ہے جب تک آدمی کے جسم میں کوئی اور درد نہ ہو۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وزیراعظم کے گھٹنوں کا درد کتنا پرانا ہے۔ تاہم اتنا جانتے ہیں کہ گھٹنوں کے درد کے معاملہ میں ہم وزیراعظم سے خاصے سینئر ہیں۔ کم از کم پندرہ برسوں سے تو ہم اس درد کو چپ چاپ برداشت کرتے چلے آرہے ہیں۔ کسی نے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ میاں یہ کونسا درد ہے، کس طرح کا درد ہے اور کتنا پرانا درد ہے۔ چنانچہ ہم اکیلے ہی اکیلے اس درد کو خاموشی سے برداشت کرتے رہے۔ کسی کو اس درد کی تفصیلات نہیں بتائیں۔ مگر جب سے وزیراعظم کے اس درد میں مبتلا ہونے کی اطلاع آئی ہے تب سے یوں لگ رہا ہے جیسے گھٹنا ہی انسانی جسم کا سب سے اہم ترین عضو ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ گھٹنے کا شمار انسان کے اعضائے رئیسہ میں ہوتا ہے یا نہیں۔ لیکن اب تو اچھے اچھے اعضائے رئیسہ بھی گھٹنے کے آگے اعضائے غریباں معلوم ہونے لگے ہیں۔ جگہ جگہ گھٹنوں کی تصویریں چھپ رہی ہیں۔ اخباروں میں مضامین چھپ رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن والے پروگرام پیش کر رہے ہیں۔ اس مرض کے ماہرین کی قسمت بھی چمک اٹھی ہے۔ کل تک امراض قلب کے ماہرین ہی ٹیلی ویژن پر دکھائی

دیتے تھے۔اب گھٹنے کے درد کے ماہرین کو اتنی بار ٹیلی ویژن پر دکھایا جارہا ہے کہ بیٹھے بیٹھے ٹیلی ویژن دیکھتے ہوئے اچھے بھلے آدمی کے گھٹنوں میں بھی درد ہونے لگا ہے۔بعض اخبارات نے وزیراعظم کی پسندیدہ غذاؤں کی فہرست بھی چھاپ دی ہے۔اس فہرست کی اشاعت کا مقصد چاہے کچھ بھی رہا ہو لیکن اب عام آدمی ان غذاوں کے استعمال سے گریز کرنے لگا ہے، جنھیں وزیراعظم استعمال کرتے ہیں۔محض اس ڈر سے کہ کہیں اسے بھی گھٹنے کا درد لاحق نہ ہوجائے۔ذرائع ابلاغ کے ساتھ مشکل یہ ہوتی ہے کہ کسی چیز کے پیچھے پڑ جاتے ہیں تو بال کی کھال نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ اس مرض کے بارے میں ایسی ایسی غیر متعلق باتیں کہی جارہی ہیں کہ گھٹنوں کے درد کا ہم جیسا پرانا مریض بھی پریشان ہے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ اسی کو تو کہتے ہیں۔آپ نے اُس بزرگ کا قصہ تو سنا ہوگا جو کسی گاؤں میں اکیلے پڑھے لکھے آدمی سمجھے جاتے تھے۔ایک بار کسی ضرورتمند نے آکران سے گذارش کی کہ وہ کسی صاحب کے نام خط لکھ دیں۔ بزرگ نے معذرت کی کہ بھیا آج میں آپ کی طرف سے خط نہیں لکھ سکوں گا کیونکہ آج میری ٹانگ میں درد ہے۔ضرورت مند نے کہا ''حضور! مجھے تو آپ کا عذر 'عذر لنگ' لگتا ہے کیونکہ آپ ٹانگ کی مدد سے تو خط نہیں لکھتے۔ ہاتھ سے لکھتے ہیں''۔اس پران بزرگ نے کہا ''میاں بات دراصل یہ ہے کہ میں اس گاؤں کا اکیلا پڑھا لکھا آدمی ہوں۔اگر میں ان صاحب کے نام خط لکھوں گا تو اسے پڑھوانے کے لئے وہ مجھے ہی بلائیں گے اور ٹانگ میں درد کی وجہ سے میں وہاں نہیں جاسکتا۔ایسے میں مجھ سے خط لکھوانے کا کیا فائدہ''۔وزیراعظم کے گھٹنے کے درد کے حوالہ سے اب ایسی ہی کئی غیر ضروری اور غیر متعلق باتیں کی جانے لگی ہیں۔جب تک ہم گھٹنوں کے درد میں مبتلا رہے کسی نے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ یہ کیسا درد ہے۔اب وزیراعظم کے گھٹنوں میں درد ہونے لگا ہے تو ساری قوم اس بارے میں پریشان ہے۔وزیراعظم کے گھٹنے اور ایک عام آدمی کے گھٹنے میں یہی تو فرق ہے۔حالانکہ ہم برسوں سے انسانی جسم میں گھٹنوں کی مرکزی اور بنیادی اہمیت سے واقف ہیں۔ دیکھا جائے تو حکومت کو بھی گھٹنوں کی اہمیت کا اندازہ ہونا چاہئے کیونکہ وہ تو آئے دن امریکہ اور بڑی طاقتوں کے آگے گھٹنے ٹیکتی آئی ہے بلکہ گھٹنے ٹیکنے کے معاملہ میں ہماری حکومت جتنا وسیع تجربہ رکھتی ہے وہ دنیا کی کوئی اور حکومت نہیں رکھتی۔ ٹریڈ یونینیں، تاجر، صنعت کار اور منافع خور تو آئے دن حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرتے رہتے ہیں لیکن آج تک کسی نے گھٹنوں کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا۔ یہ تو اس مرض کی خوش بختی ہے کہ بالآخر وزیراعظم اس میں مبتلا ہوگئے ورنہ اس مرض کی خیر بت کون پوچھتا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ وزیراعظم واشنگٹن میں جہاں اپنے گھٹنوں کا چیک اپ کرارہے

ہیں وہاں، ہم بھی اپنے گھٹنوں کا معائنہ کروا چکے ہیں۔ امریکی ڈاکٹروں نے ہمارے گھٹنوں کی بُری حالت کو بھانپنے کے بعد کہا تھا ''میاں! ہمیں تو تمہارے چلنے اور بعض ایشیائی ملکوں کی سرکاروں کے اب تک چلتے رہنے پر سخت حیرت ہے۔'' سچ تو یہ ہے کہ خود ہمارے ملک کی سرکار کے گھٹنے بھی خراب ہیں اور ایک عرصہ سے ہماری جمہوریت اور سرکاریں لنگڑاتی ہوئی چل رہی ہیں۔ آدمی کے گھٹنے کا درد جب بڑھ جاتا ہے تو آدمی لاٹھی کی مدد سے چلنے کی کوشش کرتا ہے جب کہ ہماری موجودہ مرکزی حکومت کے گھٹنوں کی خرابی کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک نہیں دو نہیں بلکہ پورے دو درجن لاٹھیوں کی مدد سے چل رہی ہے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ وزیراعظم کے گھٹنے اتنے خراب نہیں ہیں جتنے کہ ہماری مرکزی حکومت کے گھٹنے خراب ہیں۔

گھٹنوں کے درد کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ آدمی ایک بار کُرسی پر بیٹھ جائے تو اُسے کرسی سے اٹھنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ عام آدمی کے لئے بھلے ہی یہ مرض نقصان دہ ہوتا ہو لیکن سیاسی قائدین کے لئے یہ مرض ایک نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ سیاسی قائدین ایک بار اقتدار کی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں تو انھیں اس کرسی سے اُٹھنے میں ہمیشہ دشواری پیش آتی ہے، چاہے ان کے گھٹنے کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں۔

ڈاکٹروں کا مشورہ ہے کہ ہم اپنے پرانے گھٹنوں کو نکال کر ان کی جگہ مصنوعی گھٹنے لگوالیں۔ ہم نے اس بات پر بہت غور کیا ہے۔ سوچتے ہیں کہ اب جب کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں وہاں مصنوعی گھٹنے لٹکا کر کیوں بیٹھیں۔ پرانے گھٹنوں کو ہی اپنے ساتھ لے کر اس دنیا سے کیوں نہ چلے جائیں۔ اگرچہ امریکی ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انسانی جسم میں ایک بار مصنوعی گھٹنے لگادئے جائیں تو یہ کم از کم تیس برس تک چلتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ آدمی کے مرنے کے بعد بھی اس کے پاؤں چلتے رہتے ہیں۔ بہر حال گھٹنوں کا درد ایک تکلیف دہ مرض ہے۔ جو اس کی تکلیف سے گذرتا ہے وہی اس کی اذیت کو بخوبی جان سکتا ہے۔ بخدا ہم نے بھی دنیا بھر کے علاج کرا رکھے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ ایک ایسا ناقابل علاج مرض ہے جو ایک بار کسی کو لاحق ہو جائے تو وہ چار کندھوں پر سوار ہو کر ہی اس دنیا سے جاتا ہے ورنہ تو ہمیں اس کے جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہمیں خوشی ہے کہ وزیراعظم کے گھٹنوں کے درد کی خبر عام ہو جانے کے بعد لوگ اب ہمارے گھٹنوں کے درد کی اہمیت کو بھی تسلیم کرنے لگے ہیں۔ اندھا کیا چاہے ایک لاٹھی۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۷ر ستمبر ۲۰۰۰ء)

☆☆

اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر لوگ بہار کے موسم کے گذرنے کے بعد یہ شکایت کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے، حالانکہ ان میں سے بیشتر کو معلوم نہیں ہوتا کہ بہار کا موسم کس کو کہتے ہیں اور یہ کب آتا ہے بلکہ بعض کو اس لفظ کے معنی بھی نہیں معلوم ہوتے۔ یوں بھی ہمارے ملک میں بہار کا موسم چوروں کی طرح آتا ہے اور گذر جاتا ہے۔ ہم اپنا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں کرتے ہیں جو بہار کے موسم کے گذر جانے کے بعد اس کے چلے جانے کا ماتم کرتے ہیں۔ نکمے اور نااہل لوگوں کا یہی شیوہ ہوتا ہے۔ پچھلے دو ڈھائی مہینوں سے ہم نے دنیا سے اور دنیا نے ہم سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔ کچھ پتہ نہیں کہ باہر کی دنیا میں ہماری اجازت کے بغیر کیا ہو رہا ہے اور ہم اپنے گوشۂ عافیت میں دنیا کی اجازت کے بغیر کیا کر رہے ہیں (بلکہ کیا نہیں کر رہے ہیں) حالانکہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے ہم خواہ مخواہ ہی اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اگر ہم بے تعلق ہو کر بیٹھ گئے تو اس دنیا کا کیا ہوگا۔

منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

یہ ملک کیسے ترقی کرے گا۔ زندگی کے یہ میلے کس طرح چلتے رہیں گے حالانکہ ان دنوں زندگی میں میلوں کی کم اور جھمیلوں کی زیادہ گنجائش رہنے لگی ہے۔ ہم غالب کی طرح حقیقت پسند نہیں ہیں جس نے جیتے جی یہ اعلان کر دیا تھا۔

غالبِ خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں

یہ سچ ہے کہ دنیا کا کوئی کام کسی کی وجہ سے نہیں رُکتا۔ چنانچہ ہماری عملی دلچسپی اور شمولیت کے بغیر بھی یہ ملک ترقی کرتا چلا جارہا ہے۔ قتل وغارتگری کا بازار گرم ہے، چیزوں کے دام بڑھ رہے ہیں، حادثوں میں اضافہ ہورہا ہے، ہڑتالیں جاری ہیں بلکہ ڈاک کی ہڑتال کی وجہ سے تو دنیا سے ہماری بے تعلقی کچھ اور بھی خالص اور گاڑھی ہوگئی تھی کیونکہ بعض لوگ بذریعہ ڈاک کچھ ایسی رقّت کے ساتھ آپ کی مزاج پرسی کرتے ہیں کہ لگتا ہے مزاج پرسی نہ کررہے ہوں بلکہ پُرسہ دے رہے ہوں۔ پھر ہمارے نہ دیکھتے ہی دیکھتے تین تین ہندوستانی حسیناؤں نے حُسن کے تینوں بڑے عالمی خطابات جیت لئے۔ ہم نے ان کی تصویریں بعد میں بغور دیکھیں، ماشاءاللہ اچھی ہیں لیکن اتنی بھی اچھی نہیں ہیں کہ انھیں لباس برہنگی پہنادیا جائے۔ جب سے ہندوستانی دوشیزائیں حُسن کے عالمی مقابلوں میں اعزاز حاصل کرنے لگی ہیں تب سے ہمارا یہ یقین پختہ ہوتا جارہا ہے کہ بھلے ہی ہندوستان میں حُسن کی صنعت ترقی کرتی جارہی ہو لیکن کپڑے کی صنعت تیزی سے روبہ زوال ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو چارگرہ کپڑے کی مدد سے ان کا سالم لباس تیار نہ کیا جاتا۔ درزی بھی پریشان ہیں کہ بدن کے کس حصّہ کو چھپائیں اور کس حصّہ کو نمایاں کریں۔ حُسن کے مقابلوں کی وجہ سے امیر اور غریب کا فرق مٹنے لگا ہے کیونکہ دونوں ننگے پائے جاتے ہیں، تاہم مقابلہ حُسن میں بیچارے درزی کا کیا کام۔ ان مقابلوں کے پیچھے تو بڑے بڑے صنعتی ادارے ہوتے ہیں، آرائشِ حُسن کا سامان بنانے والوں کے اور اشیائے تعیش تیار کرنے والوں کے۔ ابتداء میں یہ حسینائیں مختلف اشتہاروں میں ان چیزوں کے بیچنے کا کام انجام دیں گی اور بعد میں خود کہیں بک جائیں گی۔ صارفین کے معاشرہ میں بالاخر حُسن بھی ایک بکاؤ مال بن جاتا ہے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ اس بار جو دوشیزہ حسینہ عالم منتخب ہوئی ہے اس کا تعلق اتر پردیش سے ہے اور اس اطلاع سے متاثر ہوکر اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ راج ناتھ سنگھ نے اتر پردیش میں حُسن کے مقابلوں کے انعقاد پر پابندی عائد کردی ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں اتر پردیش میں مقامی سطح پر ایسا ہی ایک مقابلہ حُسن منعقد ہونے والا تھا جس پر پابندی کے بعد ہم نے بیچاری حسیناؤں کو حکومت اتر پردیش کے خلاف پرزور احتجاجی مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا۔ جیسے کہنا چاہ رہی ہوں برہنگی ہمارا پیدائشی حق ہے جسے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ سچ پوچھئے تو ہمیں ان کا احتجاجی مظاہرہ زیادہ اچھا لگا بہ نسبت ان کی برہنگی کے۔ یہ پہلا موقع ہے جب بھارتیہ جنتا پارٹی کے کسی لیڈر سے کسی مسئلہ پر ہمارا اتفاق رائے ہوا

ہے ورنہ کہاں ہم اور کہاں بھارتیہ جنتا پارٹی۔

اور تو اور ہماری شمولیت کے بغیر اس بار بہت ساری افطار پارٹیاں بھی ہوئیں۔ یہ پہلا ماہ رمضان تھا جس میں ہم نے ایک بھی افطار پارٹی میں شرکت نہیں کی ورنہ ہم افطار پارٹیوں کے نہایت مقبول اور معروف مدعوئین میں رہے ہیں۔ اس بار بھی صدر جمہوریہ نے بلایا۔ وزیر اعظم، نائب صدر جمہوریہ، سونیا گاندھی اور نہ جانے کتنے ہی وزراء نے بلایا لیکن ہم نہیں گئے اور اپنے گوشۂ عافیت میں مگن رہے (جاتے بھی تو کس گھٹنے سے جاتے) پھر ان افطار پارٹیوں میں غیر روزہ داروں کی جتنی بھیڑ ہوتی ہے اور ان میں کھانا حاصل کرنے کے لئے جتنی تگ و دو کرنی پڑتی ہے اس کے لئے ان کا صحت مند اور توانا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ لہذا اپنے کنج قفس میں ہی پڑے رہے۔ البتہ ٹیلی ویژن پر اپنے بعض احباب کو دیکھا جس کے بعد یہ یقین پختہ ہو گیا کہ بعض لوگ افطار پارٹیوں میں یوں شرکت کرتے ہیں جیسے فینسی ڈریس شو میں حصہ لے رہے ہوں۔ ہمارے ایک دوست کل ہماری مزاج پرسی کے لئے آئے تھے۔ انھیں پتہ چلا کہ اس بار ہم نے کسی افطار پارٹی میں شرکت نہیں کی تو بے حد خوش ہوئے اور بولے ''یہ پہلا رمضان ہے جس میں تم نے کوئی نیک کام انجام دیا ہے۔ اللہ تمہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔ بھلے ہی تم نے روزے نہیں رکھے لیکن اس کے باوجود تم کسی افطار پارٹی میں نہیں گئے یہ بہت بڑی نیکی ہے''۔

خوب یاد آیا کہ پچھلے سال ہماری ملاقات ایک سیاسی لیڈر سے ہوئی تھی جن سے جب ہم نے مسلمانوں کو مزید مراعات اور سہولتیں دینے کی بات کی تو بولے ''حضور! آپ کو آخر کتنی مراعات چاہئیں۔ ہر سال افطار پارٹیوں پر حکومت کا کروڑوں روپیہ برباد ہوتا ہے۔ تمہیں اور کیا چاہئے؟'' ہم نے کہا ''سال کے صرف ایک مہینہ میں چند مسلمانوں کو کھانا کھلا دینے سے ان کے معاشی مسائل تو حل نہیں ہو سکتے۔'' بولے ''مسلمانوں کے پسندیدہ اور محبوب جانور اونٹ کو دیکھئے کہ کس طرح اپنے کوہان میں مہینوں کی غذا جمع کر لیتا ہے اور کئی کئی دنوں تک بنا کھائے پئے کے صحراؤں کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ آپ بھی اپنے اندر ایک کوہان پیدا کیجئے اور اپنے کوہان کو مضبوط اور توانا بنائیے، افطار پارٹیوں کا کھانا اپنے کوہان میں اکٹھا کر لیں اور سال بھر اس سے کام چلائیں''۔ ان کے اس استدلال کو سن کر ہم دم بخود رہ گئے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمارے پاس کوہان نہیں ہے۔ ضرور ہے لیکن ہم اس میں غذا کو محفوظ رکھنے کے بجائے اپنے اسلاف کے شاندار ماضی

کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زندگی میں جب بھی کوئی دھکا لگتا ہے تو اس کوہان میں سے اپنے شاندار ماضی کو نکال کر اسے یاد کر لیتے ہیں اور پھر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ اس سال ہم کسی افطار پارٹی میں نہیں گئے ورنہ اپنے شاندار ماضی کے کوہان میں افطار پارٹیوں کی غذا کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے۔ بہر حال اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے، اگلے سال کے بارے میں ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ یوں بھی اکیسویں صدی کا پہلا سال ہم سے پوچھے بغیر ہی ہمارے دل کے دروازے پر دستک دے رہا ہے، دل کا دروازہ کھلے گا تو پھر وہی ہوگا جو صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ انسان کی قیمت کچھ اور کم ہوگی اور چیزوں کے دام کچھ اور بڑھ جائیں گے۔ کتنے لوگ ہیں جو ایک دن نئے سال کی خوشیاں منا کر سال بھر دُکھی رہتے ہیں۔ یہی صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہر نیا سال پچھلے سال سے خراب اور اس کے بعد آنے والے سال سے اچھا ہوتا ہے۔ وقت کے اس سیل رواں میں انسان ہی ایک ایسا حیوان ہے جو جینے کے ہزار بہانے ڈھونڈتا ہے اور دوسری مخلوقات کا جینا دوبھر کر دیتا ہے۔

کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

لیکن ہمیں تو اس قافلۂ نوبہار کے رُکنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کیونکہ قافلہ اُسے کہتے ہیں جو دوڑتا نہیں بلکہ سلیقہ سے چلتا ہے۔ ہم جسے قافلۂ نوبہار سمجھ بیٹھے ہیں وہ بے تحاشہ دوڑتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ایک ایسی دوڑ ہے جس کا تعلق مسابقت سے ہے۔ پہلے تو اس دوڑ میں انسان دوسری مخلوقات کے ساتھ دوڑتا رہا۔ بالآخر وہ ساری مخلوقات کو پیچھے چھوڑ کر اب آگے نکل آیا ہے۔ اب انسانوں، قوموں اور ملکوں کے درمیان مسابقت کی دوڑ شروع ہوگئی ہے جس کا بہار سے کیا تعلق۔ اس دوڑ کو اُن معصوم جذبوں سے کیا مطلب جو سالم دنیا کو ایک حسین پیکر میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

روزنامہ "سیاست" (۳۱ر دسمبر ۲۰۰۰ء)

بابری مسجد کس نے توڑی؟

وہ ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء کا ایک سرد مگر روشن دن تھا، مطلع آبر آلود نہیں تھا، دُھند بھی نہیں تھی۔ اُس دن ہم نے بعض احباب کو دوپہر کے کھانے پر اپنے گھر مدعو کر رکھا تھا۔ مشہور مورخ پروفیسر ارجن دیو تھے، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے بین الاقوامی تعلقات کے پروفیسر پُشپیش پنت تھے، دوردرشن کے شرد دت اور فلم ساز ارون کول کے علاوہ کچھ اور احباب بھی تھے۔ اُس دن یہ احباب ہمارے گھر حیدرآبادی کھانا کھانے کے ارادہ سے جمع ہوئے تھے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ عین اُسی وقت اور اُسی دن اُدھر ایودھیا میں ہزاروں کی تعداد میں کارسیوک جمع ہو گئے تھے۔ تاہم اطمینان یہ تھا کہ اُتر پردیش کی کلیان سنگھ سرکار نے مرکزی حکومت کو یہ ضمانت دے رکھی تھی کہ بابری مسجد کو نقصان نہیں پہنچنے دیا جائے گا۔ ہمارے دوست جمع ہوئے تو ہم نے کھانا شروع کرنے سے پہلے یونہی ٹیلی ویژن آن کر دیا۔ دیکھا کہ بابری مسجد کی پرانی عمارت کی گنبد پر کچھ کارسیوک چڑھے ہوئے ہیں اور اسے توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر ہمارے احباب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ کچھ دیر تک خبریں سننے کے بعد جب ہم نے اپنے احباب کو کھانے کی ٹیبل پر چلنے کی دعوت دی تو اُن کا کرب دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ چونکہ ہم میزبان تھے اس لئے جب ہم نے احباب کی رکابیوں میں کھانا ڈالنے کی کوشش تو سب نے منع کر دیا۔ ہم نے سمجھا کہ شاید کھانا ذائقہ دار نہ بنا ہو۔ بعد میں ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء کا بنا ہوا یہ کھانا کئی دنوں تک ہمارے ریفریجریٹر میں بند پڑا رہا۔ اُس دن کو ہم یاد کرتے ہیں تو آج بھی کوفت ہوتی ہے کہ ہم نے غفلت میں کس دن اپنے احباب کو کھانے پر

بلا لیا تھا۔ اگر چہ اس وقت کسی دوست نے اس حادثہ پر کوئی اظہار خیال نہیں کیا کیونکہ سب پر سکتہ طاری تھا۔ لیکن سب بخوبی جانتے تھے کہ بابری مسجد کو کس نے توڑا ہے۔

لیکن آج جب کہ اس واقعہ کو گذرے ہوئے صرف آٹھ ہی برس بیتے ہیں یہ پتہ چلانا دشوار ہوتا جارہا ہے کہ اُس دن بابری مسجد کو آخر کس نے توڑا تھا۔ یہ تو ہم بھی مانتے ہیں کہ وقت کے گذرنے کے ساتھ واقعات کی شدّت اور کیفیت میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ یہ بھی مانتے ہیں کہ طویل عرصہ گذر جائے تو تاریخ یا تو مسخ ہو جاتی ہے یا کردی جاتی ہے اور بہت سے حقائق پسِ پشت چلے جاتے ہیں۔ لیکن ہم نے سوچا بھی نہ تھا کہ تاریخ اتنی جلدی مسخ ہو سکتی ہے اور حقائق اتنے توڑے اور مروڑے جاسکتے ہیں کہ اُس وقت جو لوگ بابری مسجد کو گرانے کے ذمہ دار سمجھے جارہے تھے اُن کے بارے میں اب انکشاف ہو رہا ہے کہ وہ تو بابری مسجد کو بچانے کے لئے وہاں گئے تھے۔ اگر چہ ان لوگوں نے بابری مسجد کے گرنے کی خوشی میں مٹھائی بھی کھائی تھی لیکن اب معلوم ہو رہا ہے کہ بے شک انھوں نے مٹھائی کھائی تھی لیکن اس سانحہ کے زیر اثر وہ اتنے حواس باختہ ہو چکے تھے کہ انھیں یہ پتہ ہی نہیں چل پایا کہ وہ کیا کھا رہے ہیں۔ اس حیرت ناک تاریخی قلابازی پر ہم خود حیرت زدہ ہیں۔ اس وقت ہمیں اُس اسکول کی یاد آ گئی جہاں ایک انسپکٹر آف اسکولز معائنہ کے لئے گیا تو اس نے چھٹی جماعت کے ایک معصوم طالب علم سے پوچھ لیا ''بتاؤ دیوان غالب کس نے لکھا ہے؟'' اس سوال، کے جواب میں طالب علم خاموش رہا تو انسپکٹر نے قدرے ترش لہجہ میں پوچھا ''خاموش کیوں ہو؟۔ بتاتے کیوں نہیں کہ دیوان غالب کس نے لکھا ہے؟'' اس پر اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ''حضور! یہ بڑا شریر اور نٹ کھٹ لڑکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دیوان غالب اسی نے لکھا ہے۔ آپ ذرا سختی سے پیش آئیں تو اپنی غلطی اپنے آپ ہی تسلیم کرلے گا''۔

بابری مسجد کے انہدام کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ آٹھ برس کے مختصر سے عرصہ کے اندر ہی اب کسی کو پتہ نہیں چل رہا ہے کہ اُس دن بابری مسجد کو کس نے گرایا تھا۔ مانا کہ لوگوں کا حافظہ خراب ہوتا ہے لیکن یہ اتنا بھی خراب ہو سکتا ہے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ آر ایس ایس کے سربراہ کے۔ سدرشن جی تو اس سلسلہ میں بڑی دلچسپ قیاس آرائیاں کررہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بابری مسجد کو اصل میں بم کے دھماکے سے اُڑایا گیا تھا اور اس بم کا تعلق آر ایس ایس یا کسی کارسیوک

سے بالکل نہیں تھا۔ اگر چہ ہم بھی اس دن آخر وقت تک ٹیلی ویژن پر بابری مسجد کے انہدام کی کارروائی کو دیکھتے رہے لیکن ہمیں تو کہیں بھی بم کے دھماکے کی آواز نہیں آئی۔ دوسرے دن اخباروں میں جو خبریں چھپیں اُن میں بھی کہیں بم کا ذکر نہیں تھا۔ حیرت ہے کہ سدرشن جی کو پورے آٹھ برس بعد بابری مسجد کے اندر سے اس بم کی آواز سنائی دی ہے حالانکہ آواز کی رفتار تو خاصی تیز ہوتی ہے۔ آخر اس آواز نے سدرشن جی کے کانوں تک پہنچنے میں اتنی دیر کیوں کر دی۔ کیا آواز نے اب اپنی رفتار بدل دی ہے۔ سدرشن جی نے ایک حیرت انگیز انکشاف یہ بھی کیا ہے کہ اس بم کے ذریعہ بابری مسجد کو اُڑانے کا کام کسی کارسیوک نے نہیں بلکہ ایک مسلمان شہری انیس احمد گہلوٹ نے انجام دیا تھا۔ انیس احمد کے بارے میں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ شخص مغل حکمران بابر کو پسند نہیں کرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ بابری مسجد کی تعمیر اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہوئی ہے۔ کون کہتا ہے کہ بابری مسجد کو کارسیوکوں نے گرایا تھا۔ اسے تو ایک مسلمان نے گرایا تھا۔ انگریزی اخبار 'ٹائمس آف انڈیا' نے انیس احمد گہلوٹ کے بارے میں تحقیق کی تو پتہ چلا کہ سدرشن جی جن انیس احمد کا ذکر کر رہے ہیں اُن کا انتقال دو سال پہلے ہی ہوا ہے البتہ بابری مسجد کے انہدام کے دن وہ غازی آباد میں اپنے گھر پر موجود تھے۔ حیرت ہے کہ غازی آباد میں رہنے کے باوجود انھوں نے اتنی دور سے بیٹھے بیٹھے ریموٹ کنٹرول کے ذریعہ ایودھیا میں بابری مسجد کو بم سے اُڑا دیا۔ ہمیں یوں لگتا ہے کہ یہ ریموٹ کنٹرول تو کسی نیوکلیر بم کے ریموٹ کنٹرول سے کہیں زیادہ مؤثر تھا اور ذرا سائنس کی ترقی دیکھئے کہ اس بم کے پھٹنے کی آواز پورے آٹھ برس بعد سنائی دے رہی ہے، یہ اور بات ہے کہ سدرشن جی کے اس دعویٰ پر انیس احمد گہلوٹ کے بیٹے نے سخت احتجاج کیا ہے اور یہ اعلان بھی کیا ہے کہ اگر وہ برسرِ عام معافی نہ مانگیں تو وہ ان کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیں گے۔

اس سلسلہ میں ہماری عرض یہ ہے کہ سدرشن جی نے بابری مسجد کے گرنے کے سلسلہ میں خواہ مخواہ ہی ایک کمزور وجہ پیش کر دی ہے۔ ہم سے کہتے تو ہم انھیں بابری مسجد کے گرنے کے سلسلہ میں ایسے کئی اسباب پیش کر سکتے تھے کہ جنھیں کوئی جھٹلانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارا یہ یقین واثق ہے کہ بابری مسجد کو اصل میں ایک کوّے نے گرایا ہے۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے آٹھ سال پہلے اس کوّے کو ٹیلی ویژن پر بابری کے اوپر سے اُڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے پنجے

میں اُس وقت ایک اخروٹ تھا جسے وہ کسی محفوظ جگہ پر لے جاکر کھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ جب وہ بابری مسجد کے اوپر سے اُڑنے لگا تو نیچے ہزاروں کارسیوکوں کو دیکھ کر پریشان ہوگیا جو بار بار نعرہ لگا رہے تھے "ایک دھکا اور دو۔ بابری مسجد توڑ دو"۔ ہیبت میں اخروٹ کوّے کے پنجے سے چھوٹ گیا اور عین بابری مسجد کی گنبد پر جا گرا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ بابری مسجد چار سو سال پرانی عمارت تھی اور اس وقت اس کے درودیوار نعروں سے گونج رہے تھے۔ ایسے میں اخروٹ جیسی سخت چیز گنبد پر گر پڑے تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عمارت کی کیا حالت نہ ہوئی ہوگی، لہذا وہ اخروٹ کا بوجھ سہار نہ سکی اور دھڑام سے زمین پر آرہی۔ اگرچہ اخروٹ کو کھانے کی حسرت کوّے کے دل میں ہی رہ گئی لیکن کارسیوکوں کی مراد پوری ہوگئی۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ یہ کوّا یقیناً اس دنیا میں زندہ نہیں ہوگا لیکن ہم نے خود اُسے ٹیلی ویژن پر بابری مسجد کے اوپر سے اُڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہمیں تو واضح طور پر اس کے پنجے میں اخروٹ بھی نظر آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنے برس بعد اب آپ کو بابری مسجد کے ملبے میں سے یہ اخروٹ ملنے سے رہا۔ تاہم اگر اُس وقت کی ویڈیوگرافی کی فلمیں مل جائیں تو ان میں اس اخروٹ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ہم نے تو یہ بھی دیکھا تھا کہ اخروٹ کے گرنے کے بعد کوّا ایک پیڑ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ ہیبت زدہ نظروں سے ان کارسیوکوں کو دیکھتا رہا جو بابری مسجد کو بچانے کے لئے آئے تھے۔ پھر اپنے آپ ہی خوفزدہ ہوکر ہوا میں اُڑ گیا۔ بابری مسجد کے گرنے کے سلسلہ میں ہمارے اس دعویٰ کو کوئی جھٹلا کر دکھادے تو تب مانیں۔ چاہیں تو ہم ایسے اور بھی کئی اسباب پیش کرسکتے ہیں۔ ہمارا تو یہ خیال بھی ہے کہ بابری مسجد کو اصل میں ابراہیم لودھی کے بھوت نے گرایا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دینے کے بعد ہندوستان پر حکمرانی کی تھی۔ بہر حال اس معاملہ میں ہم سدرشن جی کی کیوں مدد کریں۔ ہماری عرض صرف اتنی ہے کہ اتنا جھوٹ بھی نہ بولئے کہ لوگ آپ کو جھوٹا سمجھنے لگیں۔ تھوڑا سا سچا جھوٹ ہو تو آدمی یقین بھی کرلے لیکن سراسر جھوٹا جھوٹ بولنا اچھی بات نہیں ہوتی۔

روزنامہ "سیاست" (۷/جنوری ۲۰۰۱ء)

☆☆

مجاہدینِ آزادی رکشا چلا رہے ہیں

ایک اخبار میں بہار کے بعض مجاہدین آزادی کے موجودہ حالات زندگی کی ایک دلخراش داستان شائع ہوئی ہے جس کے مطابق دو چار مجاہدینِ آزادی، جو اپنی سخت جانی کی وجہ سے آزادی ملنے کے بعد بھی اب تک زندہ رہ گئے ہیں، رکشا چلا کر اپنا پیٹ پال رہے ہیں۔ دو ایک مجاہدینِ آزادی ایسے بھی ہیں جو محنت مزدوری کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ لہذا فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کسی نے کھانے کو کچھ دیدیا تو کھالیا ورنہ بھوکے پڑے رہے۔ ان کی اولاد بھی اس قابل نہیں ہے کہ ان کی دیکھ بھال کر سکے کیونکہ وہ خود فٹ پاتھوں پر رہ کر زندگی گزار رہے ہیں۔

اس خبر کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ مجاہدینِ آزادی پر رکشا چلانے کی کوئی پابندی ہے کیونکہ ماشاء اللہ ہمارا ملک اب آزاد ہو چکا ہے اور یہاں ہر ایک کو کوئی بھی کام کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ چاہے وہ کام مجاہدِ آزادی ہی کیوں نہ رہا ہو۔ اگر کوئی مجاہدِ آزادی فاقہ کشی کی زندگی گذار رہا ہے تو اسے بھی یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ شوق سے بھوکوں مرے۔ آزاد ملک میں رہنے کے یہی تو فائدے ہیں۔ تاہم اگر اس خبر کی اشاعت کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہمارے ملک میں بعض مجاہدین آزادی رکشا چلانے پر مجبور ہو گئے ہیں، اور یہ ایک افسوسناک بات ہے، تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ اس میں بھی سارا قصور ان مجاہدینِ آزادی کا ہی ہے کیونکہ ہمارے ملک کے آزاد ہوتے ہی بیشتر مجاہدین آزادی نے حکومت چلانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ اگر ان مجاہدین آزادی نے کسی وجہ سے آزادی کے بعد حکومت چلانے کا کام نہیں سنبھالا تھا تو انھیں

بالآخر کچھ نہ کچھ تو چلانا ہی تھا، چاہے وہ رکشا ہی کیوں نہ ہو۔

بہت عرصہ بعد آج مجاہدینِ آزادی کی ہمیں یاد آئی ہے تو وہ دن بھی یاد آنے لگے ہیں جب ملک ابھی آزاد نہیں ہوا تھا اور مجاہدینِ آزادی تھوک کے حساب سے ملا کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ یادیں بھی اب دھندلی ہوتی جا رہی ہیں کیونکہ اس ملک کو آزاد ہوئے اب نہ صرف نصف صدی بلکہ اس کے اوپر مزید تین برس بیت چکے ہیں۔ اتنی پرانی باتوں کو اب کون یاد رکھے۔ پھر آزادی کے بعد اس ملک میں اتنا کچھ ہو چکا ہے اور ایسا کچھ ہو چکا ہے کہ حافظہ میں اب اچھی باتوں کو یاد رکھنے کی گنجائش کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب ملک کی جدوجہد آزادی زوروں پر تھی تو ہم بڑی مشکل سے گیارہ بارہ برس کے تھے لیکن اس کمسنی کے باوجود ہم بھی مجاہدِ آزادی بننے کے لئے بے تاب رہا کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے جب بھی جدوجہد آزادی میں حصہ لینا چاہا ہمارے والدین نے کان پکڑ کر ہمیں بازار سے سودا سلف لانے کے لئے بھیج دیا۔ ہمارا خیال تھا کہ اس ملک میں اب جتنے بھی مجاہدینِ آزادی زندہ رہ گئے ہیں وہ سب کے سب عمر میں ہم سے بڑے ہونگے۔ لیکن تین چار سال پہلے ہمیں پتہ چلا تھا کہ آندھرا پردیش میں دو چار مجاہدینِ آزادی ایسے بھی ہیں جن کی عمریں اس ملک کی آزادی کے وقت بڑی مشکل سے سات آٹھ برس کی رہی ہونگیں بلکہ ایک مجاہدِ آزادی کے بارے میں یہاں تک معلوم ہوا تھا کہ آزادی کے وقت موصوف صرف تین برس کے تھے۔ ہم نے جب اظہارِ حیرت کرتے ہوئے دریافت کیا کہ اس وقت تو موصوف پاؤں پاؤں چلنے کے بھی قابل نہیں رہے ہونگے، ایسے میں انھوں نے جدوجہد آزادی میں کس طرح حصہ لیا ہوگا تو ہمیں بتایا گیا کہ اصل میں ان کی والدہ نے جدوجہد آزادی کے سلسلہ میں نکالے گئے ایک جلوس میں حصہ لیا تھا اور اُس وقت ہمارے کمسن مجاہدِ آزادی اپنی والدہ کی گود میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب اس جلوس پر لاٹھی چارج ہونے لگا اور پولیس نے جب جب ہمارے کمسن مجاہدِ آزادی کی والدہ پر لاٹھی چلانے کی کوشش کی تو والدہ محترمہ نے، جو دیش پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے اتاولی ہو رہی تھی، ہمارے کمسن مجاہدِ آزادی کو لاٹھی کے آگے کر دیا۔ نتیجہ میں موصوف کے کمسن اور کومل بدن پر بھی دو چار بار لاٹھی کی ضربیں پڑیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات انہیں مجاہد آزادی بنانے کے لئے کافی تھی۔ مانا کہ ہمارے اس مجاہدِ آزادی نے راست طور پر جدوجہد آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن اپنی والدہ کی گود میں رہنے کی وجہ سے

بالواسطہ طور پر حصہ تو لیا ہی تھا۔ بس اتنی سی بات کی وجہ سے اُنھیں وہ ساری سہولتیں حاصل ہو گئیں جو دیگر مجاہدین آزادی کو بھی میسر ہیں۔ چنانچہ مذکورہ مجاہد آزادی، جن کی عمر اب پچپن برس (۵۵) کی ہو گی، حکومت سے وظیفہ پاتے ہیں اور ٹرینوں کے ایئر کنڈیشنڈ ڈبوں میں مفت سفر کرتے ہیں۔

ان مجاہدینِ آزادی کے ذکر پر ہمیں تحریک آزادی کے پرانے دن یاد آ گئے۔ کتنے اچھے دن تھے وہ جب ہم انگریز کے غلام تھے لیکن بہت سے کام کرنے کی ہمیں آزادی حاصل تھی۔ ہمیں وہ لوگ بھی رہ رہ کر یاد آ رہے ہیں جنھوں نے گاندھی جی کی 'ہندوستان چھوڑو' تحریک سے متاثر ہو کر اپنی تعلیم چھوڑ دی تھی۔ اگر آپ بیشتر پرانے مجاہدینِ آزادی کے حالات زندگی پڑھیں تو پتہ چلے گا کہ وہ اچھے بھلے اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے لیکن گاندھی جی کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اور 'خود گاندھی جی کو بتائے بغیر' تعلیم ترک کر کے بیٹھ گئے۔ یوں لگتا تھا کہ گاندی جی آزادی کی تحریک نہیں چلا رہے ہیں بلکہ ان مجاہدین آزادی کو تعلیم سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بھلا بتائیے کیا تعلیم کو جاری رکھتے ہوئے تحریک میں حصہ نہیں لیا جا سکتا تھا۔

وہ چاہتے تو 'اوور ٹائم' میں بھی آزادی کی تحریک میں حصہ لے سکتے تھے لیکن لگتا ہے بیشتر مجاہدین آزادی اصل میں تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی دلچسپی تو کسی طرح اسکول اور کالج سے دور رہنے میں تھی اور وہ گاندھی جی کی اپیل کو بہانہ بنا کر گھر میں بیٹھ جاتے تھے۔ لیکن اتفاق دیکھئے کہ جن جن لوگوں نے گاندھی جی کے کہنے پر تعلیم ترک کر دی تھی بعد میں وہ بہت مزے میں رہے کیونکہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد ان لوگوں نے ہی حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز تو ہندوستان کو چھوڑ کر چلا گیا لیکن ہم جیسے لوگ جنھیں کسی وجہ سے تعلیم کو ترک کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، انھیں گاندھی جی کی 'ہندوستان چھوڑو' تحریک پر بہت بعد میں عمل کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ ہمارے بہت سے ساتھیوں نے آزادی کے بعد ہندوستان کو چھوڑنا شروع کر دیا۔ ذرا دیکھئے تو سہی کہ آج کتنے ہندوستانی بیرونی ممالک میں آباد ہیں اور جو یہاں رہ گئے ہیں وہ بھی کسی ایسے موقع کی تلاش میں ہیں جس میں وہ ہندوستان کو چھوڑ کر کہیں چلے جائیں۔ یہ سب ہمارے ملک کی آزادی کا فیض ہے۔ ماشا اللہ آج ہم پوری طرح آزاد ہیں۔ جس کا جی چاہے گلا کاٹ دیں اور جس کا چاہے خون پی جائیں۔ تاجروں کو آزادی حاصل ہے کہ وہ چیزوں کے دام بڑھائیں اور عوام کو آزادی حاصل ہے کہ وہ چپ چاپ گرانی کو برداشت کرتے رہیں۔

اقتدار کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حاکموں کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جتنی چاہے رشوت لیں، دھاندلیاں کریں اور عوام پر ظلم کریں لیکن دوسری طرف عوام کو بھی یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ ظلم کو ہنسی خوشی سہتے چلے جائیں۔ انگریز کے خلاف تو تحریک چلائی جاسکتی تھی لیکن منافع خوروں، رشوت خوروں، اسمگلروں اور مجرموں کے خلاف تحریک کون چلاسکتا ہے۔ بس یہی ایک مجبوری ہے۔ ایسے میں اگر بہار کے بعض پرانے مجاہدین آزادی رکشا چلارہے ہیں تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے بلکہ ہمیں تو خوشی اس بات کی ہے کہ ان مجاہدین آزادی نے رکشا چلا کر یہ ثابت کردیا ہے کہ محنت مزدوری کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے رکشا چلانے سے ملک کے دیگر رکشا چلانے والوں کے وقار میں اضافہ ہوگا اور ان کے پیشے کی عزّت وتوقیر بڑھے گی۔ یوں بھی آج کے رکشا والے کرایہ کے معاملہ میں بڑی دھاندلی کرتے ہیں اور سواریوں سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ پرانے مجاہدین آزادی رکشا چلائیں گے تو اپنی پرانی اقدار کا لحاظ رکھیں گے بلکہ ہوسکتا ہے کہ رکشا کا کرایہ بھی وہی لیں جو آزادی سے پہلے اس ملک میں رائج تھا۔ مانا کہ بعض مجاہدین آزادی بھوکوں مر رہے ہیں لیکن اس پر بھی کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ہماری تہذیب میں فقر و فاقہ اور تنگدستی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ پیٹ بھر کھانا کھانے سے آدمی کا نفس موٹا ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ کولیسٹرول بھی بڑھ جاتا ہے جو بعد میں دل کی بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔ آزادی کے پچاس پچپن برس بعد اس ملک میں جو حالات پیدا ہوتے جارہے ہیں ان میں یہی کچھ ہوگا۔ گاندھی جی بھی اگر آج کے حالات میں زندہ ہوتے تو کیا عجب کہ اپنی ہی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہندوستان کو چھوڑ کر چلے جاتے اور جنوبی افریقہ میں پھر سے اپنی پریکٹس شروع کردیتے۔ ظاہر ہے کہ وہ رکشا تو نہیں چلاسکتے تھے۔

روزنامہ "سیاست" (۲۱ رجنوری ۲۰۰۱ء)

☆☆

جُرم اور جمہوریت کا ملن

پچھلے ہفتہ ہم نے بہار کے بعض عمر رسیدہ مجاہدینِ آزادی کے بارے میں لکھا تھا، جوان دنوں رکشا چلا کر اپنا پیٹ پال رہے ہیں، یعنی جنھیں ملک کی سیاست کو چلانا چاہئے تھا، وہ اب رکشا چلانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ملک کی آزادی کے بعد اتنے سارے برس بیت جانے کے باوجود ان مجاہدین آزادی کی قسمت پر ہم کفِ افسوس مل ہی رہے تھے کہ اطلاع آئی کہ اب ہمارے الیکشن کمیشن کی گولڈن جوبلی منانے کا موقع آ گیا ہے۔ گویا اب بہت جلد ہمارے ملک کی جمہوریت پر سے بھی پچاس برس بیت جائیں گے۔ صدر جمہوریہ کے آر نارائنن نے الیکشن کمیشن کی گولڈن جوبلی تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ ہماری سیاست میں اب جرائم پیشہ افراد کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اُنھوں نے ملک کی سرکردہ سیاسی جماعتوں سے خواہش کی ہے کہ وہ انتخابات میں جرائم پیشہ افراد کو ٹکٹ نہ دیا کریں۔ آزادی اور جمہوریت دو ہی ایسے موضوعات ہیں، جن کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے ہمیں ہمیشہ ڈر رہتا ہے۔ دنیا کے اور ملکوں کے لئے جمہوریت ایک نعمت سہی، لیکن ہمارے لئے تو یہ ایک زحمت ہی نظر آتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ملک کی باگ ڈور سیاست دانوں کے ہاتھوں میں ہے یا جرائم پیشہ افراد کے۔ صندل کی لکڑی کے اسمگلر ویرپّن کو ہی لے لیجئے۔ پچھلے کئی برسوں سے موصوف نے اپنے علاقہ میں دہشت اور خوف کا ماحول طاری کر رکھا ہے۔ تین تین ریاستوں کی پولیس انھیں پکڑنے کے لئے ہلکان ہوتی جا رہی ہے، لیکن موصوف کسی کے ہاتھ نہیں آتے۔ ایک فردِ واحد کے آگے جب تین ریاستوں کی حکومتیں

بے بس اور مجبور نظر آنے لگیں تو ذرا سوچئے کہ اس ملک میں جمہوریت کی حکمرانی ہے یا جرائم پیشہ افراد کی۔ لگتا ہے ویرپّن ہی اپنے علاقہ کا سب سے بڑا حکمران ہے۔ تینوں ریاستوں کے سربراہ گڑگڑا کر اس سے التجائیں کر رہے ہیں، اغوا کنندگان کو رہا کرنے کی اپیلیں کرتے ہیں، لیکن وہ مہینوں انھیں اپنے قبضہ میں رکھتا ہے اور حکومتوں سے اپنے مطالبات منوا لیتا ہے۔ پچھلے دنوں حکومت مہاراشٹرا نے داؤد ابراہیم کی جائیداد کو نیلام کرنے کا اعلان کیا تھا، نیلامی کے لئے زبردست انتظامات کئے گئے تھے، لیکن ایک بھی شخص اس جائیداد کو خریدنے نہیں آیا ؎

جس کو ہو جان و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں

یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس ملک میں اصل حکمرانی تو جرائم پیشہ افراد کی ہی ہے، جمہوریت خواہ مخواہ بدنام ہے۔ دیکھا جائے تو خود ہماری سیاست میں اب اتنے جرائم پیشہ لوگ جمع ہو گئے ہیں کہ بسا اوقات ان سے ملنے کے بعد ہم تو اپنی پاکٹ کو اچھی طرح ٹٹول کر دیکھ لیتے ہیں کہ اس میں ہماری پرس محفوظ بھی ہے یا نہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسے بھی ہیں جن کے گھروں کی تلاشی کے بعد کروڑوں روپیوں کی کرنسی تھیلیوں اور بوریوں میں بھری ہوئی پائی گئی۔ سوچا تھا کہ اب یہ جیل کی ہوا ضرور کھائیں گے، لیکن کچھ عرصہ بعد دیکھا کہ جیل میں جانے کی بجائے اسمبلی میں پہنچ گئے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کہتے ہیں کہ انھیں قانون ساز اداروں اور حوالات میں کوئی فرق نظر نہیں آتا، کیونکہ جنھیں اُصولاً حوالات میں بند ہونا چاہئے وہ قانون ساز اداروں میں آزادانہ دندناتے پھرتے ہیں۔ ایسے کئی سیاست دان ہیں، جن پر سنگین جرائم کے سلسلہ میں مقدمات زیر دوران ہیں، لیکن وہ اطمینان سے پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں براجمان ہیں، بلکہ بعض تو اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کئی قاتل ہیں جو گرفتاری سے بچنے کے لئے کسی قانون ساز ادارے میں جا کر پناہ لے لیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب اس ملک کے بعض اہم سیاست دانوں سے ہماری بھی راہ و رسم تھی، لیکن پھر جس طرح کے سیاست دان پیدا ہونے لگے ہیں، انھیں دیکھ کر ہم اپنے اور ان کے بیچ ایک شریفانہ فاصلہ برقرار رکھنے کو ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ جمہوریت کے اس پچاس سالہ سفر کے بعد اب سیاست دانوں کے ہاتھوں اس ملک میں کسی کی عزت محفوظ نظر نہیں آتی۔ عورتوں کی عصمتیں لٹ جاتی ہیں، شریفوں کی پگڑیاں اچھالی جاتی ہیں، کسی کا بھی اغوا کیا جا سکتا ہے۔ حد ہو گئی کہ آئی اے ایس عہدیدار بھی ان کے آگے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں، اپنی جان کی حفاظت کے

لیے مارے مارے پھرتے ہیں، کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں۔ بعض سیاست دان تو ایسے بھی ہیں جو منٹوں میں فسادات اور دنگے کرواسکتے ہیں اور خون کی ندیاں بہا سکتے ہیں۔ ان جرائم پیشہ سیاست دانوں کی وجہ سے اب جمہوریت ''قہر خداوندی'' کی طرح نظر آنے لگی ہے۔

ہمارے ایک دوست کو ان جرائم پیشہ سیاست دانوں کے فروغ میں بھی بھلائی کا ایک پہلو نظر آتا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ ایک زمانہ میں ہیضہ اور پلیگ جیسی بیماریوں کی وجہ سے شہر کے شہر ویران ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن طبی سہولتوں میں اضافہ کی وجہ سے اب ان بیماریوں پر قابو پالیا گیا ہے، لہذا اس ملک کی آبادی میں بے پناہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ تو اچھا ہے کہ اب جرائم پیشہ سیاست دان ان بیماریوں کے نعم البدل کے طور پر اُبھرنے لگے ہیں، ان کی وجہ سے فسادات اور قتل و غارتگری اور لوٹ مار کا جو بازار گرم ہو رہا ہے، اس سے کم از کم اس ملک کی آبادی میں تو کمی واقع ہوتی جا رہی ہے۔ یہ سیاست دان عوام کے نمائندے نہیں بلکہ قہر خداوندی کی علامت ہیں۔ یقین مانیے جب ہم ان جرائم پیشہ سیاست دانوں کی تصویریں اخباروں میں دیکھتے ہیں تو افسوس ہوتا ہے کہ جن تصویروں کو پولیس تھانوں میں لگایا جانا چاہئے تھا انھیں اخباروں میں بڑی عقیدت اور اہتمام کے ساتھ چھاپا جاتا ہے۔ اگرچہ صدر جمہوریہ نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے افراد کو عملی سیاست میں آنے کی اجازت نہ دی جائے، لیکن غور کرنے والی بات یہ ہے کہ ایسے لوگ اجازت لے کر تھوڑی آتے ہیں۔ وہ تو دندناتے ہوئے آتے ہیں۔ بھلا آج تک کسی قاتل نے مقتول سے کبھی یہ پوچھا ہے کہ ''بھیا! کیا میں آپ کو قتل کر سکتا ہوں؟'' قتل کے جرم کا ارتکاب تو اجازت لئے بغیر ہی کیا جاتا ہے۔ ایسے میں آپ کہتے ہیں کہ ایسے مشکوک اور مشتبہ افراد کو اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کا ٹکٹ نہ دیا جائے۔ کس کی مجال ہے جو انھیں ٹکٹ نہ دے، ایسے لوگ چاہیں تو آپ کی کنپٹی پر پستول رکھ کر بھی ٹکٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ کہیں گے اگر کسی پارٹی نے غلطی سے یا خوفزدہ ہو کر انھیں ٹکٹ دیا بھی ہے تو رائے دہندے انھیں اپنا ووٹ نہ دیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ رائے دہندے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالیں۔ انھیں بھی تو جان و مال اور اپنے بال بچوں کی خیر منانی ہے۔ بالفرض محال رائے دہندے اگر ایسے سیاست دانوں کو ووٹ نہیں دیتے تو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ ایسے سیاست دان اپنے زور بازو سے الیکشن بوتھ پر قبضہ کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ ہماری جمہوریت کو اب جرائم پیشہ افراد سے

محفوظ رکھنا دن بہ دن دشوار ہوتا جارہا ہے، بلکہ ہمارے ایک صلح پسند دوست کا خیال ہے کہ کیوں نہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں ان جرائم پیشہ افراد کے لئے الگ سے نشستیں محفوظ کردی جائیں۔ اگر قانون سازاداروں کی کچھ نشستیں اسمگلروں، قاتلوں، ڈاکوؤں، بدمعاشوں اور اوباشوں کے لئے محفوظ کردی جائیں تو اس میں کیا قباحت ہے۔ آخر یہ لوگ بھی تو ہمارے ہی سماج کا حصہ ہیں، بلکہ اصل حصہ تو یہی ہیں۔ لہذ اہمارے قانون سازاداروں میں ان کی بھرپور نمائندگی ہونی چاہئے تا کہ ایک زمانہ ایسا آئے جب قتل، ڈکیتی، اسمگلنگ، اغوا اور دنگوں کو ہمارے ملک میں قانونی حیثیت حاصل ہوجائے۔ ہماری سیاست میں اعلیٰ وارفع اقدار کا خاتمہ ہو ہی چکا ہے، قانون کی حکمرانی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ لہذا کیوں نہ اس ملک کی باگ ڈور اسمگلروں، قاتلوں اور ڈاکوؤں کے ہاتھ میں سونپ دی جائے۔ انشاء اللہ! آپ دیکھیں گے کہ اگر ہماری جمہوریت پر سے مزید پچاس برس گزر جائیں اور ہماری جمہوریت کے ارتقاء کا یہی حال رہا تو ایک دن حکومت میں اس طرح کی وزارتیں بھی بنیں گی، جیسے وزارت برائے فروغ اسمگلنگ، وزارت قتل و ڈکیتی، وزارت غارتگری اور دہشت گردی، وزارت گانجہ، چرس اور افیون، وزارت برائے اغوا اور خواتین سے چھیڑ چھاڑ وغیرہ۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

روزنامہ ''سیاست'' (۲۸ر جنوری ۲۰۰۱ء)

☆☆

مُنہ نوچوا کیوں پیدا ہوا؟

ہمارے ملک کی خوبی یا خرابی یہ ہے کہ ہم لوگ افواہوں کے بارے میں خاصے خودکفیل واقع ہوئے ہیں۔ طرح طرح کی افواہیں پھیلانا اور ان افواہوں پر اعتبار کرنا ہمارا قومی مشغلہ ہے۔ بلکہ کچھ لوگ تو اسے تخلیقی کام بھی سمجھتے ہیں اور اس تخلیقی کام میں اپنے آپ کو مصروف بھی رکھتے ہیں۔ جس ملک میں بیروزگاری عام ہو اور لوگوں کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہ ہو تو وہ ایسی افواہیں پھیلا کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب محض تفریح طبع یا تفنن طبع کے طور پر افواہیں پھیلائی جاتی تھیں۔ لیکن اب چونکہ زمانہ دہشت گردی کا آ گیا ہے اس لیے ان افواہوں کو پھیلانے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگوں میں دہشت پیدا کی جائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال ان ہی دنوں میں دہلی اور آس پاس کے علاقوں میں یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ ایک 'انسان نما بندر' اس علاقہ میں آ گیا ہے جو لوگوں پر حملہ کر کے انہیں زخمی کر دیتا ہے۔ گرمی کے دن تھے اور دہلی میں چونکہ اکثر بجلی بند رہتی ہے، لہٰذا لوگوں نے 'انسان نما بندر' کے شبہ میں ایسے کئی افراد کی پٹائی کر دی تھی جو شکل سے تو بندر لگتے تھے لیکن ان کے انسان ہونے پر شبہ کیا جا سکتا تھا۔ بعض کمزور دل کے لوگوں نے اس 'بندر نما انسان' کے شبہ میں اپنی جانیں تک گنوا دیں بلکہ اس شبہ میں ہم نے بھی ایک رات ایک چبوترے پر سے چھلانگ لگا دی تھی۔ بعد میں جب بجلی آئی تو پتہ چلا کہ جسے ہم نے انسان نما بندر سمجھا تھا وہ اصل میں ایک کمبل تھا جسے ایک درخت پر سوکھنے کے لیے ڈال دیا گیا تھا۔ اس انسان نما بندر کا خوف دہلی کے باشندوں پر اتنا طاری تھا کہ شام ہوتے ہی یہاں کی سڑکیں

ویران ہو جایا کرتی تھیں۔ اس انسان نما بندر کے بارے میں مشہور تھا کہ اس پر پانی ڈال دیا جائے تو یہ غائب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک اندھیری رات میں جب ہم اپنے مکان کے زینے پر چڑھ رہے تھے تو خود ہماری بیوی نے بالکنی میں سے ہم پر پانی کی بالٹی انڈیل دی تھی۔ چونکہ شدید گرمی کے دن تھے اس لیے ہمیں انسان نما بندر بننا اچھا لگا۔ آج ہمیں انسان نما بندر اور اس سے متعلق افواہوں کی یاد اس لیے آ گئی کہ پچھلے کچھ دنوں سے اتر پردیش کے کئی اضلاع میں ایک نئی مخلوق نے عوام میں دہشت پیدا کر دی ہے۔ بلرام پور، سیتا پور، بہرائچ اور گونڈہ کے لوگ اس مخلوق سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ راتوں کو گھر سے نہیں نکلتے۔ اس نئی مخلوق کو 'منہ نوچوا' کا نام دیا گیا ہے کیوں کہ یہ موقع پاتے ہی کسی بھی انسان کا منہ نوچ لیتا ہے۔

کچھ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ یہ اصل میں ایک آبی کیڑا ہے جو تالابوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے دو پنجے، بڑی بڑی نیلی آنکھیں ہوتی ہیں جن سے روشنی نکلتی رہتی ہے۔ سونڈ جیسی ناک ہوتی ہے۔ اس کے پنجوں میں زہر ہوتا ہے جن کی مدد سے جب یہ کسی انسان کا منہ نوچ لیتا ہے تو جلن کے مارے اس کا بڑا حال ہو جاتا ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ چونکہ قحط سالی کی وجہ سے تالابوں میں پانی نہیں رہنے لگا ہے تو یہ کیچڑ میں سے نکل آیا ہے۔ تاہم 'منہ نوچوا' کے حلیے کے بارے میں عینی شاہدین کے بیانات میں بڑا اختلاف ہے۔ ایک شاہد نے اس کی لمبائی چار انچ کی بتائی ہے تو دوسرے شاہد نے اسے کھینچ کر چودہ انچ بتایا ہے۔ افواہوں کی یہی تو خوبی ہوتی ہے۔

سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

یہ ہوا میں اُڑتا ہے اور جگنوؤں کی طرح روشنی پھینکتا رہتا ہے۔ اس کے حلیے کے بارے میں اختلاف کا یہ عالم ہے کہ بلرام پور میں ایک رات آسمان پر ایک چمکیلی شئے ایک طرف سے دوسری طرف کو جاتی ہوئی دکھائی دی تو لوگوں نے اس پر نہ صرف سرچ لائٹس ڈالنی شروع کر دی بلکہ کچھ لوگوں نے بندوقوں سے اس پر فائر بھی کیا۔ تب بھی یہ 'منہ نوچوا' نہیں مرا۔ تاہم بعد میں ضلع کے پولیس افسر نے بتایا کہ جسے عوام نے 'منہ نوچوا' سمجھ لیا تھا وہ اصل میں ایک ہوائی جہاز تھا جو آسمان میں خاصی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ ہوائی جہاز تو بچ کر چلا گیا لیکن اب لوگ یہ افواہیں پھیلانے لگے ہیں کہ منہ نوچوا کی آواز ہوائی جہاز جیسی ہوتی ہے۔

چاہے کچھ بھی ہو ہمیں یہ بات اچھی لگی کہ لوگوں نے اس مخلوق کو 'منہ نوچوا' کا نام دیا

ہے۔اس نام میں نہ صرف اس کیڑے کے خصوصی کام کی طرف اشارہ ہے بلکہ بولنے میں بھی یہ اچھا لگتا ہے۔ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ یہ مخلوق آج کے حالات کے پسِ منظر میں خصوصی طور پر اپنے آپ ہی پیدا ہوگئی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے بیشتر قائدین اور رہنما اب عوام کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئے ہیں۔خود ہمارے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی حالیہ فسادات کے بعد جب گجرات گئے تھے تو انہوں نے ایک جلسہ میں بڑے دکھ کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ ان فسادات نے انہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔ یہ اور بات ہے کہ دو چار دن بعد جب وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے گوا گئے تو اپنے اس بیان کو بھول گئے ۔قدرت نے سوچا کہ اپنے پہلے بیان کے باوجود وزیر اعظم پھر سے اپنا منہ دکھانے لگے ہیں تو کیوں نہ ایک ایسی مخلوق پیدا کی جائے جو لوگوں کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ سچ پوچھئے تو اس مخلوق کو ہم وقت کی ایک اہم ضرورت سمجھنے لگے ہیں۔بس ہمیں یہ شکایت ہے کہ یہ مخلوق غفلت میں بے قصور اور معصوم عوام کے منہ نوچتی چلی جارہی ہے۔اسے تو ان لوگوں کے منہ نوچنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے جو شہیدوں کی نعشوں کو محفوظ رکھنے کی غرض سے خریدے جانے والے تابوتوں کے دھندے میں کمیشن کھاتے ہیں۔چوری چھپے اپنے رشتہ داروں اور اپنی پارٹی کے کارکنوں کو پٹرول پمپ اور گیس کی ایجنسیاں الاٹ کرتے ہیں۔ جگہ جگہ فرقہ وارانہ فسادات کراتے ہیں اور فسادات میں مرنے والوں کی نعشوں پر اپنے اقتدار کا محل کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔لوگوں کو اغوا کرتے ہیں اور موقع ملے تو انہیں ہلاک بھی کر دیتے ہیں۔کروڑوں روپیوں کی رشوت لیتے ہیں اور انہیں اپنے ملک کے دستور کی دھجیاں اڑاتے ہوئے بھی شرم نہیں آتی۔دیکھا جائے تو ایسے لوگوں میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو وہ سماج کو اپنے منہ نہ دکھاتے۔لیکن پھر بھی نہ صرف اپنے منہ دکھا رہے ہیں بلکہ ان پر مسکراہٹ بھی سجاتے چلے جارہے ہیں۔ایسے لوگوں کو سبق سکھانے کی غرض سے اگر قدرت نے 'منہ نوچوا' جیسی مخلوق پیدا کی ہے تو اس پر عوام کو دہشت میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔منہ نوچوا بالآخر ایک جانور ہے اور اسے ان لوگوں کے پتے نہیں معلوم ہیں جن کے منہ نوچے جانے چاہئیں۔اس وقت 'منہ نوچوا' کام تو صحیح کر رہا ہے لیکن غلط لوگوں کے منہ نوچ رہا ہے۔جب اسے ذرا عقل آجائے گی تو غلط انسانوں کے صحیح منہ نوچنے لگ جائے گا۔ ہمارے ملک میں ایسے بے شمار افراد موجود ہیں جو اب منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئے ہیں لیکن پھر بھی بڑی بے شرمی کے ساتھ سماج میں دندناتے

پھر رہے ہیں بلکہ ٹیلی ویژن پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔

قدرت اپنا حساب کتاب اور توازن ضرور برقرار رکھتی ہے۔قدرت کے معاملوں میں دیر تو ہوتی ہے لیکن اندھیر نہیں ہوتی۔اب اس نے آج کے رہنماؤں کے کرتوتوں کے مطابق طرح طرح کی مخلوقات کو پیدا کرنا شروع کردیا ہے۔ہمارا تو خیال ہے کہ صرف 'منہ نوچوا' سے کام نہیں بنے گا۔دنیا کو ایسی اور بھی کئی مخلوقات کی ضرورت ہے۔جیسے ایک مخلوق 'ٹانگ توڑوا' ہونی چاہئے جس کے ذمہ چھوٹی موٹی بدعنوانیاں کرنے والوں کی ٹانگیں توڑنے کا کام ہو،ایک مخلوق 'گردن مروڑوا' بھی ہونی چاہئے۔جب کوئی بڑی ہستی فخر سے اپنی گردن اکڑانے لگے تو یہ مخلوق برموقع اُس کی گردن مروڑ دے۔ایک مخلوق 'سر پھوڑوا' بھی ہوسکتی ہے جو رہنماؤں کے سر پھوڑنے کا فریضہ انجام دیتی رہے۔'ناک کاٹوا' 'بال نوچوا' اور' کان مروڑوا' جیسی مخلوقات بھی پیدا ہوسکتی ہیں تا کہ رہنماؤں کی بدعنوانیوں کے مطابق انہیں قرار واقعی سزا دی جاسکے۔

روزنامہ ''سیاست'' (یکم ستمبر ۲۰۰۲ء)

امریکہ کا وزیرِ خارجہ، دنیا کے ہر ملک کا وزیرِ داخلہ

ایک زمانہ تھا جب ہمارے ملک میں غذائی اجناس کی قلت ہوا کرتی تھی تو 'امریکی امداد' کے طور پر ہمارے ملک میں امریکی گیہوں درآمد کیا جاتا تھا۔ برسوں بیت گئے لیکن اس امریکی گیہوں کا کسیلا ذائقہ اب تک ہماری زبان پر اور ہمارے ذہن میں محفوظ ہے۔ خدا خدا کر کے ہمارے ملک کی غذائی صورتِ حال بہتر ہوئی تو ہمیں امریکی غذائی اجناس سے نجات ملی۔ اگرچہ علامہ اقبال نے برسوں پہلے طائرِ لاہوتی کو ایسے رزق سے پرہیز کرنے کی تلقین کی تھی جس سے پرواز میں کوتاہی آتی ہو۔ ہمیں نہیں معلوم کہ طائرِ لاہوتی کیسا ہوتا ہے؟۔ کہاں پایا جاتا ہے اور اس کی غذا کیا ہوتی ہے؟۔ ہم نے تو اسے علامہ اقبال کی شاعری میں ہی دیکھا، لیکن یہ پرندہ امریکہ کی دریافت سے بہت پہلے سے کائنات میں موجود ہے۔ اب کہاں رہتا ہے؟ یہ ہمیں نہیں معلوم۔ اگر اس دھرتی پر کہیں موجود ہے تو یقیناً اس کے رزق میں امریکی رزق بھی شامل رہا ہوگا کیونکہ اس کے بغیر آج دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہے۔ ہمیں دیکھیے کہ کوکا کولا اور پیپسی کے مشروب اور میکڈانلڈ کی تیار کردہ اشیا آئے دن استعمال کرتے رہتے ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہماری غذائی صورت حال بہتر ہوگئی ورنہ ہم آج بھی امریکی گیہوں اور چاول پر گزارہ کرتے رہتے۔ اب بھلے ہی امریکی غذائی اجناس کی درآمد ہمارے ملک میں نہ ہوتی ہو لیکن اور طرح کی چیزیں اپنے آپ ہی درآمد ہونے لگی ہیں جیسے اگریکلچر کے بجائے کلچر وغیرہ۔ یہاں تک بھی ٹھیک ہے کیونکہ امریکہ

اس وقت دنیا کا طاقتورترین ملک ہے اور کمزور ممالک کا طاقتور ملک سے متاثر ہونا لازمی امر ہے۔تاہم جب سے جارج بش امریکہ کے صدر بنے ہیں تب سے اور بھی کئی طرح کی امریکی اشیا کمزور ممالک میں درآمد ہونے لگی ہیں۔پچھلے چند دنوں سے جارج بش بار بار یہ اعلان کر رہے ہیں کہ جب تک عراقی عوام صدام حسین کو اقتدار سے بے دخل نہیں کریں گے تب تک عراق کے خلاف تحدیدات ختم نہیں کی جائیں گی۔مظلوم فلسطینیوں سے کہا جا رہا ہے کہ وہ یاسر عرفات کے بجائے کسی اور کو اپنا قائد بنائیں۔گویا اب امریکہ دوسرے ممالک کی حکومتیں اپنے ملک میں تیار کرنے اور پھر انہیں وہاں سے ایکسپورٹ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔اس سے بہتر تو یہ تھا کہ وہ حسب معمول غذائی اجناس ہی برآمد کرتا رہتا۔اس سے بھلے ہی کھانے والوں کی پرواز میں کوتاہی آتی ہو لیکن ملکوں کا وجود تو خطرے میں نہیں پڑتا۔اب تک امریکہ ساری دنیا میں جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار سمجھا جاتا رہا ہے لیکن اب اس کی حیثیت عالمی کوتوال کی سی ہوگئی ہے۔جارج واشنگٹن اور ابراہم لنکن اگر آج زندہ ہوتے تو امریکہ کے موجودہ روپ کو دیکھ کر نہ جانے کیا سوچتے۔ہمارے لیے 'امریکی مداخلت' کوئی نئی بات نہیں ہے۔یوں بھی پچھلی صدی میں امریکہ نے مداخلت کرنے کے سوائے کیا ہی کیا ہے۔دنیا کا کون سا ایسا خطہ ہے جہاں امریکہ نے مداخلت نہ کی ہو (یہ اور بات ہے کہ رُسوا بھی ہوا ہے)۔جاپان پر ایٹم بم پھینکا، ویت نام میں ٹانگ اڑائی، سوویت یونین کو نیچا دکھانے کے لیے افغانستان کے مجاہدین کو آلہ کار بنایا اور جب سوویت یونین ٹوٹ گیا تو خود افغانیوں کی کمر توڑ دی۔

ہمارے کرم فرما پروفیسر سراج الدین امریکہ میں خاصا لمبا عرصہ گزارنے کے بعد پچھلے دنوں حیدرآباد واپس ہوئے ہیں۔ہمیں بھی دو بار امریکہ جانے اور لمبے عرصے تک وہاں قیام کرنے کا موقع مل چکا ہے۔پچھلے دنوں ہم حیدرآباد گئے تو پروفیسر سراج الدین سے امریکہ کا حال چال پوچھا۔انھوں نے باتوں باتوں میں ایک دلچسپ بات کہی کہ جب تک آدمی امریکہ کی سرحدوں میں رہتا ہے تو تب تک یہ ملک نہایت اچھا اور خوبصورت لگتا ہے لیکن جیسے ہی آپ اس کی سرحدوں سے باہر نکل آتے ہیں تو نہ جانے کیوں اس ملک سے خوف سا محسوس ہوتا ہے۔امریکہ کی آسائشیں، اس کی خوشحالی کے کیا کہنے۔سارا ملک ایک رئیس کے سجے سجائے ڈرائنگ روم کی طرح لگتا ہے۔وسیع وعریض سڑکیں، بڑے بڑے سبزہ زار، چاروں طرف دوڑتی ہوئی موٹریں، فضا

میں پرندوں کی طرح اُڑتے ہوئے ہوائی جہاز، انواع واقسام کی اشیا سے بھرے ہوئے ڈپارٹمنٹل اسٹور، سجے سجائے ریستوران، آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتیں، ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی، ترقی ہی ترقی۔ دو آنکھوں کی مدد سے اتنی ساری خوشحالی کو دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ اگر دنیا میں کہیں جنت ہے تو بس یہیں ہے۔ ہر کام مشینیں انجام دے رہی ہیں۔ جھاڑو لگا رہی ہیں، کپڑے دھو رہی ہیں۔ برتن صاف کر رہی ہیں، سبزہ زار پر گھاس کاٹ رہی ہیں۔ ادھر بٹن دبایئے اور اُدھر کام انجام پا گیا۔ لگتا ہے یہاں کے ہر باسی کے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ ہے۔ منٹوں میں ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص سے کسی بھی وقت، کہیں سے بھی بات کر لیجئے۔ سڑکوں پر پیدل چلتے ہوئے آدمی بھی دکھائی نہیں دیتے۔ سارے لوگ موٹروں میں دوڑتے اور بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہم نے اس صورتِ حال کے بارے میں ایک بار لکھا تھا کہ امریکہ میں جس آدمی کے پاس موٹر نہیں ہے یا جو موٹر چلانا نہیں جانتا وہ یہاں آکر میت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب تک اسے چار پہیوں کی گاڑی میں لاد نہیں دیا جاتا تب تک وہ ہلنے جُلنے کے قابل نہیں رہتا۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ جب ہر کام مشینیں انجام دے رہی ہیں تو پھر آدمی یہاں کیا کر رہا ہے؟۔ بے مصرف سی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ ایک بار ہمیں لاس اینجلس سے لمبا سفر طے کر کے سان ڈیاگو ہوتے ہوئے امریکہ کی سرحد کو عبور کر کے میکسیکو میں بھی جانے کا موقع ملا تھا۔ امریکہ کی سرحد سے پچاس قدم چل کر میکسیکو کی سرحد میں داخل ہوئے تو یوں لگا جیسے دنیا ہی بدل گئی ہے۔ وہی پھٹے حال لوگ، بے روزگار نوجوان، ان کے چہروں سے ہویدا پریشان حالی، عجیب وغریب غم وغصہ اور گندی بستیاں۔ ہمیں تو یوں محسوس ہوا جیسے یہ مفلوک الحال لوگ میکسیکو کے اس سرحدی شہر میں اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ ادھر موقع ملے اور سرحد کو عبور کر کے امریکہ میں داخل ہو جائیں۔ اتفاق سے اس سفر میں ہمارے دوست حسن چشتی اور تابش خانزادہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے یوں ہی مذاق مذاق میں کہہ دیا کہ اگر امریکہ کی سرحدیں اپنے آپ میں سمٹ کر رہنے کے بجائے کچھ اور آگے بڑھ جائیں تو ان مفلوک الحال انسانوں کا بھی بھلا ہو سکتا ہے۔ حسن چشتی نے کہا ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟۔'' ہم نے کہا ''یہ بات ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ امریکہ کی سرحد کے اندر آتے ہی آدمی اپنے آپ کو تونگر سمجھنے لگتا ہے اور اس کی سرحد سے باہر نکلتے ہی اچانک کنگال بن جاتا ہے۔'' جو بات ہم نے دو سال پہلے مذاق میں کہی تھی وہی بات اب پروفیسر سراج الدین

پوری سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ پچھلے دو برسوں میں امریکہ کے تیور یکسر بدل گئے ہیں۔ اب وہ عراقی عوام سے کہہ رہا ہے کہ وہ صدام حسین کی جگہ کسی اور کو اپنا قائد بنائیں۔ مظلوم فلسطینیوں سے کہہ رہا ہے کہ وہ یاسر عرفات سے چھٹکارا حاصل کریں۔ ہمیں تو یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ جس طرح پسماندہ ممالک میں امریکہ میں بنی ہوئی چیزیں درآمد کی جاتی ہیں کہیں اسی طرح مستقبل میں ان ممالک کی سرکاریں بھی امریکہ میں بن کر ان ملکوں میں درآمد نہ ہونے لگ جائیں۔ تبھی تو ہمارا خیال ہے کہ امریکہ کا وزیر خارجہ اب دنیا کے سارے ملکوں کا وزیر داخلہ بھی بن گیا ہے۔ یوں بھی امریکہ کا وزیر خارجہ امریکہ میں کم رہتا ہے اور دوسرے ممالک کے دوروں میں زیادہ مصروف نظر آتا ہے۔ امریکہ کی فوج کا جب بھی لڑائی لڑنے کو جی چاہتا ہے تو وہ دوسرے ملکوں کا رُخ کرتی ہے۔ امریکہ ساری دنیا کو جنگی سازوسامان فراہم کرتا ہے، جس کا استعمال وہ خود اپنے ملک میں کبھی نہیں کرتا۔ امریکہ کی سرحدوں میں رہنے کا یہی تو فائدہ ہے۔ پرسوں کی بات ہے دہلی کے پریس کلب میں ہم نے اپنے ایک صحافی دوست کو بریانی کھانے کی دعوت دی تو بولے ''یار! جارج بش نے بریانی کھانے سے منع کیا ہے۔ کھلانا ہی ہو تو کوئی اور چیز کھلاؤ۔'' ہم ہنسنے لگے تو بولے ''یار! یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ کیا عجب کہ کچھ برسوں بعد ہمارے پریس کلب کا مینو بھی امریکہ سے بن کر آنے لگے۔ امریکہ کے ہاتھ اب اتنے لمبے ہو چکے ہیں کہ یہ ہمارے کلب کے کچن تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔''

روزنامہ ''سیاست'' (اکتوبر ۲۰۰۲ء)
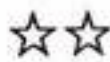
دہلی کے جنگلی جانور

دہلی بھی عجیب شہر ہے۔ پتہ نہیں اس شہر کو پہلے پہل کس نے راجدھانی بنایا تھا۔ جس کسی بادشاہ نے اس کو راجدھانی بنایا ہو اس کے بارے میں تو ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ مگر سنا ہے کہ دلی سات بار اُجڑی اور اسے ساتوں مرتبہ پھر سے بسایا گیا۔ ہمیں اصل اعتراض تو اُن لوگوں پر ہے جنہوں نے اس کو دوبارہ بسایا۔ جب یہ اُجڑ گئی تھی تو اسے پھر سے بسانے کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی سات مرتبہ۔ ایک بار کی غلطی تو پھر بھی معاف کی جاسکتی ہے لیکن غلطی بار بار سرزد ہو تو اسے غلطی نہیں کہتے بلکہ بیوقوفی کہتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی شہر ہے جسے راجدھانی بنایا جائے۔ گرمی ہوتی ہے تو ایسی شدید کہ آدمی کا دین ایمان پگھل جائے۔ انسان کی شرافت اور انسانیت بھاپ بن کر اڑ جائیں۔ سردی ایسی کڑاکے کی کہ آدمی کا دل منجمد ہو کر پتھر بن جائے۔ یوں بھی حکمرانوں کا پتھر دل ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہی دیکھئے کہ پچھلے بیس دنوں سے دہلی کُہر اور دھند میں لپٹی ہوئی ہے۔ لوگوں نے سورج کی شکل نہیں دیکھی۔ کیونکہ سورج شرم کے مارے کہرے کے پیچھے منہ چھپائے بیٹھا ہے۔ ہم تو پچھلے تیس برسوں سے اس شہر کے موسموں کو برداشت کرتے چلے آرہے ہیں اور ان حکمرانوں کو کوس رہے ہیں جنہوں نے اس شہر کو راجدھانی بنایا تھا۔ برسوں پہلے ایک عقلمند بادشاہ محمد بن تغلق نے دلی کی بجائے دولت آباد کو اپنا پایہ تخت بنانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن مورخین اسے بیوقوف گردانتے ہیں۔ دیکھا جائے تو محمد بن تغلق پر اعتراض کرنے والے مورخین خود ہماری نظر میں کچھ کم بیوقوف نہیں ہیں۔ دہلی کی آبادی اور یہاں کی

ٹریفک کے بارے میں ہم کیا عرض کریں۔ جو یہاں رہتا ہے وہی اس کرب کو بخوبی جانتا ہے۔ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ دہلی میں حکمرانوں کی شکل میں بڑے خونخوار جانور پائے جاتے ہیں اور بسا اوقات ہم از راہِ تجسس ان کی ٹانگوں کی تعداد کا بھی جائزہ لے لیتے ہیں کہ دو ہی ہیں یا چار ہوگئی ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے جب یہ حکمران اقتدار کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو ہمیں چار ٹانگوں کی جگہ چھ ٹانگیں نظر آتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں چار ٹانگیں اقتدار کی کرسی کی بھی ہوتی ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ چوپائے ہی جب اتنے خطرناک ہوتے ہیں تو چھ پاؤں والی مخلوق کتنی خطرناک نہ ہوتی ہوگی۔ یہ بات ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ پچھلے کچھ عرصہ سے خونخوار جانور بھی، جنہیں اُصولاً جنگل میں ہونا چاہئے، اب دہلی میں دکھائی دینے لگے ہیں۔ دو ہفتے پہلے کی بات ہے جنوبی دہلی میں فرنیچر کی ایک دکان جب صبح کو کھولی گئی تو پتہ چلا کہ ایک خونخوار تیندوا ایک صوفہ پر بیٹھا ہوا ہے اور دکان کے ملازمین پر جھپٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سارے علاقہ میں بھگدڑ مچ گئی۔ پولیس کو طلب کیا گیا۔ چڑیا گھر کے عہدیداروں کو اطلاع دی گئی اور ان سب نے اسے پکڑنے اور قابو میں کرنے کی کچھ ایسی کوشش کی کہ بالآخر اس کی موت واقع ہوگئی۔ بعد میں جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ تیندوے کے ناخن غالباً کسی 'بیوٹی پارلر' میں تراشے گئے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق تیندوے کے پیٹ میں جو غذا پائی گئی وہ ایسی غذا نہیں تھی جو عموماً کسی جنگلی جانور کے پیٹ میں پائی جاتی ہے۔ یہ غذا زود ہضم بھی تھی اور مرغن بھی۔ جنگلی جانور کی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ جنگل میں جو بھی شکار اُس کے ہاتھ آجائے اُسے کھانا پڑتا ہے۔ چاہے وہ ثقیل ہو یا زود ہضم۔ اس تیندوے کی غذا کے معائنہ سے پتہ چلا کہ یہ غذا بطورِ خاص اس تیندوے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ گویا یہ تیندوا 'مینو' کے حساب سے بریک فاسٹ، لنچ اور ڈنر کھانے کا عادی تھا۔ تب چڑیا گھر کے عہدیداروں کو احساس ہوا کہ اس تیندوے کو جنوبی دہلی کے کسی 'فارم ہاؤس' میں پالتو جانور کے طور پر پالا پوسا جارہا تھا جہاں سے یہ نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ دہلی کے مضافات میں دہلی کے امیر گھرانوں کے کئی 'فارم ہاؤس' ہیں جو کئی سو ایکڑ کے رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمیں بھی یہاں کے دو چار 'فارم ہاؤسوں' میں جانے کا موقع مل چکا ہے۔ (بحیثیت جنگلی جانور نہیں بلکہ بحیثیت مہمان کے)۔ ان فارم ہاؤسوں کے مالکوں کے عالیشان گھر دہلی میں تو ہیں ہی ان فارم ہاؤسوں کو شہر سے باہر اس لئے رکھا جاتا ہے کہ جب بھی امیروں کا جی جنگل میں منگل

منانے کو چاہے تو وہ یہاں احباب وغیرہ کے ساتھ آ جائیں۔ رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتی ہیں۔ عشائیوں کا اہتمام ہوتا ہے اور صاحبان اقتدار کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ فارم ہاؤس اس ملک کا حصہ نہیں ہیں۔ یہ ایک الگ ہی دنیا ہے۔ بڑے بڑے سوئمینگ پول یہاں موجود ہیں۔ خوبصورت روشیں ہیں، جگہ جگہ فوارے چل رہے ہیں، بڑے بڑے سبزہ زار ہیں اور ان کے بیچوں بیچ عالیشان عمارتیں ہیں۔ ان فارم ہاؤسوں کے بعض شوقین مالکوں نے یہاں جنگلی جانور بھی پال رکھے ہیں جیسے تیندوے، مگر مچھ، گینڈے، ہرن، اژدھے اور نیل گائے وغیرہ۔ پولیس اور چڑیا گھر کے عہدیداروں کو جب یہ اندازہ ہوا کہ اس تیندوے کو کسی فارم ہاؤس میں پالا پوسا جا رہا تھا تو انہوں نے ان فارم ہاؤسوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ ایک فارم ہاؤس میں ہرنوں، نیل گایوں کے علاوہ دو بڑے اژدھے بھی ملے۔ ان چھاپوں سے گھبرا کر فارم ہاؤسوں کے مالکوں نے اپنے جنگلی جانوروں کو آزاد کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ جنوبی دہلی کی ایک مصروف شاہراہ پر لوگوں نے دیکھا کہ موٹروں اور اسکوٹروں کے ساتھ ایک ہرن بھی بھاگا جا رہا ہے۔ اس ہرن کی گردن میں ایک گھنٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔ ایک جگہ ایک بڑے اژدھے کو سڑک کو عبور کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ اس صورتحال سے عوام الناس بھی ہراساں ہیں۔ پرسوں رات گھرے کہرے میں ہم یونہی اپنی ہاؤسنگ سوسائٹی میں نکلے تو دیکھا کہ ہمارے ایک پڑوسی زینے کے آگے کھڑے تھر تھر کانپ رہے ہیں اور منہ سے ایک لفظ بھی ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ہم نے سوچا کہ شاید شدید سردی نے ان کا یہ حال بنا رکھا ہے۔ ہم نے ان کا حال چال پوچھا تو سامنے ایک سائے کی طرف اشارہ کر کے ڈرتے ڈرتے بولے ''شیر۔ شیر''۔ ہمیں بھی تھوڑی دیر کے لئے کچھ شبہ سا ہوا اور جب ہم نے شیر کا نشانہ لے کر اس پر پتھر پھینکا تو شیر کی دہاڑ کے بجائے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ تب ہم دونوں کو پتہ چلا کہ یہ ہمارے پڑوسی کا کتا ہے کسی فارم ہاؤس کا شیر نہیں۔ ہمارے پڑوسی نے ہماری بہادری کی تعریف کرنا چاہی تو ہم نے انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا حضور! دہلی میں رہتے ہوئے جنگلی شیر سے ڈرنا تو بڑی بزدلی ہے۔ دہلی میں دو پاؤں والے ایسے خطرناک اور خونخوار شیر رہتے ہیں کہ ان کے آگے جنگلی شیر کی درندگی بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جنگلی شیر اصولوں کا پابند ہوتا ہے۔ وہ کسی پر اُس وقت تک حملہ نہیں کرتا جب تک کہ اسے چھیڑا نہ جائے۔ وہ کسی کے گھر کو یونہی آگ نہیں لگا دیتا۔ وہ معصوم بچوں اور عورتوں پر بھی حملہ آور نہیں ہوتا۔ وہ نہ کسی

کو دھوکہ دینا جانتا ہے اور نہ ہی بے گناہ لوگوں کی زندگیاں برباد کرتا ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ جنگلی جانوروں میں جتنی 'انسانیت' ہوتی ہے، اتنی تو اب انسانوں میں بھی باقی نہیں رہی۔ دہلی کے لوگ فارم ہاؤسوں سے چھوڑے جانے والے سانپوں سے خواہ مخواہ ہی خوفزدہ ہیں ۔ مانا کہ سانپ زہریلے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اُس وقت تک کسی کو نہیں کاٹتے جب تک کہ انہیں چھیڑا نہ جائے۔ ان میں زہر ہوتا بھی ہے تو اتنی قلیل مقدار میں ہوتا ہے کہ بڑی مشکل سے وہ بیک وقت دو چار لوگوں کو ہی کاٹ سکتے ہیں اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ ان میں فرقہ پرستی کا زہر نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں دو پاؤں والے کچھ سانپ ایسے ہیں جو ساری قوم میں فرقہ پرستی کے زہر کو داخل کرتے چلے جارہے ہیں اور یہ زہر ایسا ہے جس کی مدد سے غریبوں کے گھر جلائے جاسکتے ہیں، عورتوں کی عصمتیں لوٹی جاسکتی ہیں اور معصوم بچوں کے گلے کاٹے جاسکتے ہیں۔ ایسی زہریلی ہستیوں کے درمیان رہنے کے بعد اگر ہم سانپ جیسی بے ضرر مخلوق سے ڈرنے لگیں تو لعنت ہے ہم جیسوں پر۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ بعض رہنماؤں کے چیلے ان رہنماؤں کو 'شیر' کا لقب عطا کر دیتے ہیں۔ ہر علاقہ کا کوئی نہ کوئی شیر ہوتا ہے جیسے شیر پنجاب، شیر بنگال، شیرِ تلنگانہ اور شیرِ کشمیر وغیرہ وغیرہ لیکن انہیں یہ پتہ نہیں ہوتا کہ 'شیر' کی بنیادی خصلت کیا ہوتی ہے۔ وہ شیر کی خوبیوں سے قطعاً ناواقف ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت بعد میں یہ کاغذی شیر بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے میں اگر دہلی میں اصلی شیر، تیندوے، زہریلے سانپ اور مگر مچھ فارم ہاؤسوں سے نکل کر آبادی میں آنے لگے ہیں تو اس بات سے اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ان جنگلی جانوروں میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ وہ سماج کو کوئی بڑا نقصان پہنچا سکیں۔ ان دنوں 'جنگل راج' شہروں میں جتنا رائج ہے اتنا تو جنگلوں میں بھی دکھائی نہیں دیتا۔ پھر انسان خود ایک ایسا جانور بن گیا ہے جو جنگلی جانوروں کو ان کے ٹھکانوں سے بیدخل کرتا چلا جارہا ہے۔ حکومتیں قانون اکر بعض جنگلی جانوروں کا تحفظ کرنے پر مجبور ہوگئی ہیں۔ ان حالات میں اگر امیر طبقہ کے لوگ اپنے صرفہ سے خطرناک حکمرانوں کو پالنے کے ساتھ ساتھ جنگلی جانوروں کو بھی پالنے لگے ہیں تو اس میں تشویش کی کونسی بات ہے۔

روزنامہ ''سیاست'' (۲۶ر جنوری ۲۰۰۳ء)

☆☆

وزیرِاعظم کی داڑھ

پچھلے دنوں دہلی کے اخباروں میں یہ خبر نہایت اہتمام سے شائع ہوئی تھی کہ وزیرِاعظم
اٹل بہاری واجپائی کی داڑھ میں درد کے باعث دہلی کے عام آدمی کے سر میں درد رہنے لگا ہے۔
اس خبر کی سرخی کو پڑھ کر بادی النظر میں ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ وزیرِاعظم کی داڑھ کے
درد کا عوام کے سر درد سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ تو ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ والی بات ہوگئی۔ پھر سوچا
کہ اگرچہ طب کے شعبہ میں بڑی ترقی ہو رہی ہے، لیکن اس شعبہ میں افراتفری بھی بہت ہے۔
آدمی کی بیماری کچھ اور ہوتی ہے لیکن اس کا علاج کچھ اور ہوتا ہے۔ آپ نے اس مریض کا قصہ
تو ضرور سنا ہوگا جو ایک ڈاکٹر کے پاس یہ شکایت لے کر گیا تھا کہ اس کے پیٹ میں ہمیشہ درد رہنے
لگا ہے۔ ڈاکٹر نے تفصیلی معائنوں کے بعد مریض کو مشورہ دیا کہ وہ پہلے اپنی آنکھوں کا معائنہ
کرائے۔ مریض نے حیران ہو کر ڈاکٹر سے کہا ''حضور! یہ کیا بات ہوئی کہ درد میرے پیٹ میں
رہتا ہے اور آپ مجھ سے آنکھوں کا معائنہ کرانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔'' اس پر ڈاکٹر نے پہلے
تو مریض سے اپنی فیسِ مشورہ طلب کی اور جب یہ اسے مل گئی تو کہا ''جناب! اصل میں آپ کی
بینائی خراب ہوگئی ہے جس کی وجہ سے آپ بنا دیکھے الا بلا چیزیں کھا لیتے ہیں اور نتیجہ میں آپ کے
پیٹ میں درد رہتا ہے۔'' سنا ہے کہ بعد میں مریض نے اپنی آنکھوں کا معائنہ کرایا اور اس کے بعد
اس کے پیٹ کا درد سچ مچ دور ہوگیا۔ پھر ہم نے سوچا کہ وزیرِاعظم کی داڑھ کوئی معمولی داڑھ نہیں
ہے اور وزیرِاعظم کی خرابی صحت کا اثر کسی پر بھی پڑ سکتا ہے۔ ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ امریکہ کے

صدر کو اگر چھینک بھی آتی ہے تو بازار میں چیزوں کے دام بڑھ جاتے ہیں۔ مانا کہ اٹل بہاری واجپائی امریکہ کے صدر جیسے جلیل القدر سربراہ نہیں ہیں لیکن پھر بھی دنیا کے ایک بڑے جمہوری ملک کے حکمران ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی داڑھ کا درد پھیل کر عوام کے سر درد میں تبدیل ہو جاتا ہو۔ بعد میں ہم نے ان کی داڑھ کے درد کی خبر ذرا تفصیل سے پڑھی تو معلوم ہوا کہ پچھلے اتوار کو وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی اپنی داڑھ کے معائنہ کی غرض سے اپنے خصوصی معالج یعنی ڈینٹسٹ کے مطب پر گئے تھے جو دہلی کے مشہور و معروف علاقہ خان مارکیٹ میں واقع ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ان دنوں وزیراعظم کی سیکوریٹی کا معاملہ نہایت نازک اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ پچھلے دو ہفتوں میں تین غیر متعلق افراد وزیراعظم کے حفاظتی گھیرے کو توڑ کر اس کے اندر داخل ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد سے دہلی کی پولیس پریشان ہے۔ خبر کے مطابق وزیراعظم کو رات میں آٹھ بجے اپنے ڈینٹسٹ کے پاس جانا تھا لہٰذا پولیس نے شام کے ساڑھے چار بجے ہی خان مارکیٹ کے 150 دکانداروں سے کہہ دیا کہ وہ اپنی دکانیں بند کردیں۔ جب کہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب زیادہ گاہک خان مارکیٹ میں آتے ہیں۔ دکانداروں کا بیان ہے کہ اُس دن اُن کا تیس فیصد کاروبار ٹھپ رہا کیونکہ خان مارکیٹ میں ڈینٹسٹ کے سوائے سب کے کاروبار بند رہے۔ اس کے علاوہ آس پاس کی سڑکوں پر دو گھنٹوں تک ٹریفک بند رہا بلکہ بعض لوگوں کو اس ٹریفک جیم سے نکلنے میں تین گھنٹے لگ گئے اور یہ جب وہاں سے نکلے تو ان میں سے بیشتر اصحاب سر کے درد میں مبتلا ہو چکے تھے۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ وزیراعظم کی داڑھ کا درد بالآخر کس طرح عوام کے سر درد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہمیں اس بات پر اُردو کا ایک مشہور شعر یاد آ گیا۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دیجیو
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

ہمیں ایک عرصہ تک اس شعر کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ کسی سے پوچھا تو بتایا گیا کہ یہ شعر بھی ہے اور پہیلی بھی۔ پہلے اس پہیلی کو حل کرو تو اس پیچیدہ شعر کا آسان یا آسان شعر کا پیچیدہ مطلب فوراً سمجھ میں آ جائے گا۔ اصل میں شاعر نے اس شعر میں آسان سی بات یہ سمجھائی ہے کہ میاں شہد کی مکھی کو باغ میں جانے نہ دیجئے کیونکہ شہد کی مکھی باغ میں جائے گی تو پھولوں کا رس چوسے گی اور اس کے بعد شہد کے چھتے میں جا کر اس رس کو شہد میں تبدیل کرے گی اور جب شہد

تیار ہو جائے گا تو کوئی ظالم اس شہد کے چھتے پر حملہ کر کے شہد کو نکال لے گا اور جو ’خانہ زنبور‘ بچے گا، اس کی مدد سے کوئی دوسرا ظالم موم تیار کرے گا اور اس موم کی مدد سے بالآخر موم بتی بنائی جائے گی اور جب یہ موم بتی رات کو کہیں جلے گی تو کوئی نہ کوئی پروانہ اس موم بتی کی آگ میں جل مرنے کے لئے آجائے گا اور یوں پروانہ شمع پر اپنی جان نچھاور کر دے گا۔ اس شعر کے آسان سے مطلب کو سمجھنے کے بعد ہی ہمیں پتہ چلا کہ دور کی کوڑی لانا کس کو کہتے ہیں اور اسے لانے کے لئے آدمی کو کتنی دور تک جانا پڑتا ہے۔

وزیراعظم کی داڑھ کے درد اور عوام کے سر درد کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ اگر وزیراعظم کی داڑھ میں درد نہ ہوتا تو وہ اپنے ڈینٹسٹ کے پاس کیوں جاتے اور اگر ڈینٹسٹ کا مطب خان مارکیٹ میں نہ ہوتا تو وزیراعظم کی سیکوریٹی کا عملہ وہاں کی دکانوں کو کیوں بند کرواتا اور اس کے آس پاس کے علاقے میں دو گھنٹوں تک ٹریفک کو کیوں روک لیتا۔ ظاہر ہے کہ اس اہتمام اور پابندی کے بعد وزیراعظم کی داڑھ کا درد تو ضرور کم ہو گیا ہوگا لیکن اس کے نتیجہ میں عوام کے سر درد میں جو اضافہ ہوا ہے اس کا مداوا کون کرے گا۔ اس خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جس دن وزیراعظم اپنے ڈینٹسٹ کے پاس اپنی داڑھ کو دکھانے کے لئے خان مارکیٹ میں آئے تھے تو اسی دن وہ صبح میں نہرو پلیس کی طرف جانے کے لئے خان مارکیٹ کے علاقہ ہی سے گزرے تھے اور تب بھی خان مارکیٹ کے آگے ٹریفک کو روک دیا گیا تھا۔ خان مارکیٹ کے ایک بھولے بھالے دکاندار نے یہ شکایت کی ہے کہ وزیراعظم جب صبح میں خان مارکیٹ کے علاقہ سے گزرے ہی تھے تو اسی وقت انہوں نے اپنے ڈینٹسٹ سے اپنی داڑھ کا معائنہ کیوں نہیں کروالیا۔ اس طرح اس علاقہ کے لوگوں کو خواہ مخواہ ہی دو مرتبہ ٹریفک کی دشواریوں سے گزرنا نہ پڑتا۔ جس کسی دکاندار نے یہ اعتراض کیا ہے اسے یہ نہیں معلوم کہ ایک عام آدمی کے معمولات اور وزیراعظم کے معمولات میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ بظاہر یہ بات آسان سی لگتی ہے کہ جس راستے سے گزرو اس راستے پر پڑنے والے سارے کام کرتے چلے جاؤ۔ ہمارا بھی یہی اصول ہے کہ کسی کام سے گھر سے باہر نکلو تو اس کام کے راستے میں پڑنے والے دیگر ضروری اور غیر ضروری کام بھی انجام دیتے چلو۔ بجلی کا بل جمع کرنے کے ارادے سے نکلتے ہیں تو سبزی ترکاری بھی خرید لیتے ہیں، بال بھی بنوا لیتے ہیں کیونکہ نائی کی دکان راستہ میں ہی پڑتی ہے۔ چونکہ دواؤں کی دکان بھی اسی راستہ میں پڑتی ہے

تو متوقع بیماریوں کی دوائیں بھی مرض میں مبتلا ہونے سے بہت پہلے ہی حفظ ماتقدم کے طور پر خرید لیتے ہیں کہ بعد میں ادھر جانا نہ پڑ جائے۔ اگرچہ راستہ میں 'تجہیز و تکفین' کا کام انجام دینے والی ایک دکان بھی پڑتی ہے، کئی بار خیال آیا کہ کیوں نہ اس معاملہ میں بھی 'حفظ ماتقدم' کا خیال رکھا جائے تاکہ عین وقت پر ایمرجنسی میں لواحقین کو اتنی دور آنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑ جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ بسا اوقات ہماری جیب میں اتنی رقم نہیں ہوتی کہ اپنی دوراندیشی کے اس منصوبہ پر عمل کریں۔ اصل قصہ یہ ہے کہ عام آدمی کے پاس وقت تو بہت ہوتا ہے لیکن پیسے نہیں ہوتے اس لئے وہ حتی الامکان اس طرح کے کام منصوبہ بند طریقہ سے انجام دیتا ہے۔ جبکہ وزیراعظم کے پاس سہولتیں تو بہت سی ہوتی ہیں لیکن وقت بالکل نہیں ہوتا اس لئے انہیں ایک ہی راستہ سے دو دو مرتبہ گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تو بہت معمولی سی بات ہے جو ہر کسی کی سمجھ میں آجانی چاہئے۔ یوں بھی آدمی ایک بار وزیراعظم بن جائے تو وہ آدمی کی سطح سے اُوپر اٹھ جاتا ہے اور اس کے تقاضے مختلف ہو جاتے ہیں۔

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ادھر جب سے ہمارے قائدین کی سیکوریٹی کو سخت کر دیا گیا ہے تب سے دہلی کے عام آدمی کی زندگی متاثر ہوگئی ہے۔ یہاں صدر جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ، وزیراعظم، نائب وزیراعظم تو رہتے ہی ہیں جن کی خاطر عام حالات میں بھی سیکوریٹی کا انتظام ضروری ہو جاتا ہے۔ ان کے علاوہ یہاں ایسے کئی سیاسی قائدین رہتے ہیں جن کا شمار وی۔ وی۔ آئی۔ پی میں ہوتا ہے۔ پھر دہلی میں ایک ریاستی سرکار بھی ہے جس کے لیفٹننٹ گورنر، چیف منسٹر اور وزراء کو باہر نکلنا پڑتا ہے۔ ضروری نہیں کہ سبھی داڑھ کے درد کے علاج کے لئے نکلیں۔ انہیں اپنے سرکاری فرائض تو انجام دینے پڑتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ضعیف الاعتقاد اور شکی مزاج آدمی ہیں۔ گھر سے باہر نکلنے کے بعد اگر کوئی بلی یا کوئی وی۔ آئی۔ پی ان کا راستہ کاٹ دے تو وہ الٹے پاؤں گھر واپس آجایا کرتے تھے لیکن اب ان کی ضعیف الاعتقادی دور ہوگئی ہے۔ کہتے ہیں سخت سیکوریٹی کی وجہ سے بلی تو خیر اب راستہ نہیں کاٹتی لیکن کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب وہ گھر سے باہر نکلیں اور دو یا تین وی۔ وی۔ آئی۔ پی ان کا راستہ نہ کاٹیں۔ انہیں مجبوراً اپنی ضعیف الاعتقادی سے کنارہ کش ہونا پڑا ہے۔ اب آپ سے کیا چھپائیں کہ ہم نے خود اپنی عمر عزیز کی کئی بیش قیمت ساعتیں ان وی وی آئی پی قسم کے حضرات کو گزارنے میں گنوادی ہیں۔ گھنٹوں اس انتظار میں رہتے

ہیں کہ ادھر یہ سڑک سے گزر جائیں تو ہم بھی گزریں۔ ایک بار تو خود ہماری داڑھ میں بڑا زبردست درد تھا۔ ڈاکٹر کو دکھانے کے ارادے سے نکلے تو پتہ چلا کہ ایک وی۔وی۔وی۔ وی۔آئی۔پی صاحب سڑک سے گزرنے والے ہیں (غالباً ان کی داڑھ میں بھی درد تھا)۔ ہم دو گھنٹوں تک انتظار کرتے رہے لیکن موصوف سڑک سے نہیں گزرے۔ ہم نے گھڑی دیکھی تو اندازہ ہوا کہ ہمارے ڈاکٹر کے اوقاتِ مطب تو کب کے ختم ہو چکے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ داڑھ کا درد اپنے آپ آتا ہے اور اپنے آپ ہی چلا بھی جاتا ہے۔ انتظار کا درد جب حد سے زیادہ بڑھ گیا تو داڑھ کا درد اپنے آپ ہی غائب ہو گیا۔ خوشی خوشی وی وی آئی پی مذکور کو دعائیں دیتے ہوئے واپس آ گئے کہ ان کی عنایت کی وجہ سے ہمیں ڈینٹسٹ کے پاس جانا نصیب نہیں ہوا۔ ورنہ ڈاکٹر ہماری جیب سے یونہی سو ڈیڑھ سو روپئے نکلوا لیتا۔ ایک اور مرتبہ ہم ایسے ہی ایک ٹریفک جیم میں پھنس گئے۔ ہمیں ایک ادبی تقریب میں شرکت کے لئے دہلی سے کہیں باہر جانا تھا اور ہم ریلوے اسٹیشن کی جانب رواں دواں تھے کہ ایسے میں پولیس والوں نے سیٹیاں بجا بجا کر ہمیں روک لیا اور اتنی دیر تک روکے رکھا کہ ہماری وہ ریل گاڑی چھوٹ گئی جس میں ہمیں سوار ہونا تھا۔ چار و نا چار وی وی آئی پی کو کوستے ہوئے گھر واپس ہوئے لیکن دوسری صبح اخبار آیا تو معلوم ہوا کہ جس گاڑی سے ہمیں سفر کرنا تھا وہ گاڑی راستہ میں حادثہ کا شکار ہو گئی ہے اور بالخصوص وہی ڈبہ سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے جس میں ہمیں بیٹھنا تھا۔ بلکہ اس ڈبہ میں سوار بعض مہلوکین کے نام بھی اخبار میں درج تھے۔ یوں ہم مشیت ایزدی کے قائل ہو گئے کہ ہمیں زندہ رکھنے کے لئے قدرت نے ایک وی وی آئی پی کو ہمارے راستہ کی رکاوٹ بنا دیا۔ اس واقعہ کے بعد سے ہم نے دہلی کے وی وی آئی پی ٹریفک جیم کے خلاف اپنے احساسات اور جذبات کو ابھارنا چھوڑ دیا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس میں بھی قدرت کی کوئی مصلحت ہوگی۔

روزنامہ ''سیاست'' (۱۶ر فروری ۲۰۰۳ء)

☆☆

پردہ فاش ریلی سے
گریباں چاک ریلی تک

کسی کو پتہ ہو یا نہ ہو دہلی میں رہنے والوں کو ضرور پتہ ہوتا ہے کہ ریلی کس کو کہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اسے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ریلی کیوں نکالی جاتی ہے، کب نکالی جاتی ہے اور کیسے نکالی جاتی ہے۔ کیونکہ یہاں ریلیاں دیکھتے ہی دیکھتے یوں نمودار ہو جاتی ہیں جیسے کسی شاعر کے ذہن میں آناً فاناً کوئی مضمون غیب سے چلا آتا ہے۔ ایک زمانہ میں ریلیاں خاصے اہتمام کے ساتھ کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر بڑی تگ و دو کے بعد نکالی جاتی تھیں۔ آزادی سے پہلے ایسی ریلیوں کو احتجاجی مظاہروں اور احتجاجی جلوس وغیرہ کا نام دیا جاتا تھا اور غالباً ایسے ہی احتجاجی مظاہروں کا نتیجہ تھا کہ انگریز بالآخر اس ملک کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ایسے احتجاجی مظاہروں پر لاٹھی چارج تو ہوتا ہی تھا، بسا اوقات فائرنگ بھی ہو جایا کرتی تھی اور لوگ شہید بھی ہو جاتے تھے۔ مگر جب سے احتجاجی مظاہروں کا نام بدل کر ''ریلی'' رکھ دیا گیا ہے تب سے ریلیوں کی حیثیت بھی 'ادب برائے ادب' کی سی ہو گئی ہے۔ یہ خود سے نہیں نکلتیں بلکہ نکالی جاتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر ریلی نکالی جاتی تھی جیسے مہنگائی کے خلاف ریلی، بدعنوانی کے خلاف ریلی، ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ کی مانگ کے لئے ریلی وغیرہ وغیرہ۔ اب ان ریلیوں کے موضوعات ہی نہیں عنوان بھی بدل گئے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے زمانہ میں کوئی فلم بنتی تھی

تو ایک ہی لفظ کی مدد سے اس کا نام رکھ دیا جاتا تھا جیسے ''قسمت''، ''زینت''، ''محل''، ''داغ''، ''شہید'' وغیرہ لیکن زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ فلموں کے لمبے لمبے نام رکھے جانے لگے جیسے ''دل والے دلہنیاں لے جائیں گے''، ''ہم دل دے چکے صنم''، ''البرٹ پنٹو کو غصہ کیوں آتا ہے'' وغیرہ۔ اسی طرح اب ریلیوں کے بھی بڑے دلچسپ نام رکھے جانے لگے ہیں۔ ''دھتکار ریلی'' کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ اس ریلی کا مقصد چونکہ واضح نہیں تھا اسی لئے اس کے کام کو سامنے رکھ کر اس ریلی میں مخالفوں کو دھتکارا گیا تھا۔ اس ریلی میں جن کو دھتکار پلائی گئی تھی انہیں ہم نے مخلصانہ مشورہ دیا تھا کہ آپ بھی دھتکار ریلی نکالنے والوں کے خلاف ایک ریلی نکالیں اور اس کا نام ''پھٹکار ریلی'' رکھیں۔ یہ لفظ ہم قافیہ بھی ہے اور دھتکار سے کہیں زیادہ شدت آمیز اور معنی خیز ہے۔ چونکہ وہ شعر و ادب کی باریکیوں سے ناواقف تھے اس لئے ہماری بات نہیں مانی۔ بعد میں انہوں نے غالباً ''تھوتھو ریلی'' نکالی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس ریلی کا مقصد مخالفین پر تھوکنا تھا۔ (ملک کی سیاست کا معیار اب اتنا پست ہوگیا ہے کہ یہاں اب تھوکنا اور دوسروں پر گندگی پھینکنا روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔) ہماری عادت ہے کہ ہر کس و ناکس کو مخلصانہ مشورے دیتے رہتے ہیں۔ ہم نے ''تھوتھو ریلی'' نکالنے والوں کی خدمت میں دست بستہ عرض کی تھی کہ اگر اس ریلی کا نام صرف ''تھوتھو'' رکھنے کی بجائے ''آخ تھو ریلی'' کردیں تو اس ریلی کے مقصد میں نئی وسعت، گہرائی، گیرائی اور معنی خیزی پیدا ہوجائے گی۔ بولے ''میں بھی اس بات کو مانتا ہوں کہ 'آخ تھو' میں بڑی گہرائی ہے لیکن صرف 'تھوتھو' میں جو روانی اور سلاست ہے وہ 'آخ تھو' میں کہاں۔ تھوتھو کہنے میں آسان بھی ہے اور محنت طلب بھی نہیں ہے۔ جب کہ 'آخ تھو' کہنے میں زیادہ زور لگانا پڑتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ریلی میں شرکت کرنے والے زائد کام کی مناسبت سے زیادہ معاوضے کا مطالبہ نہ کر بیٹھیں۔'' چنانچہ ہمارے مشورے کے باوجود ''تھوتھو ریلی'' ہوگئی۔ ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ دیکھیں ریلیوں کے باب میں اب کونسا نیا گُل کھلے گا کہ اتنے میں اتر پردیش کی چیف منسٹر مایاوتی نے اعلان کیا کہ وہ بہت جلد ایک ''پردہ فاش ریلی'' نکالنے کا ارادہ رکھتی ہیں جس میں سماج وادی پارٹی کے لیڈر ملائم سنگھ یادو اور ان کی پارٹی کے قائدین کی حرکتوں کا پردہ فاش کیا جائے گا۔ یقین مانیئے اس نام کو سن کر ہماری باچھیں کھل اٹھیں۔ ریلی جیسی بے مقصد اور بے معنی چیز کو ایسا بلیغ نام دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ پھر اس ''پردہ فاش'' کا تعلق اُردو زبان و ادب سے کچھ اس طرح

جڑا ہوا ہے کہ بھلے ہی اس ریلی میں کسی کا پردہ فاش ہوا ہو یا نہ ہوا ہو یہ ضرور ''فاش'' ہو گیا کہ جس کسی نے اس ریلی کے لئے یہ نام تجویز کیا ہے اس کا گہرا تعلق اُردو شعر وادب کی روایت سے ہے۔ بخدا ''پردہ فاش ریلی'' والا نام ہمیں بہت پسند آیا۔ اگرچہ ہماری عملی سیاست میں اب ایسی کوئی بات نہیں رہ گئی ہے جسے پردے میں رکھا جا سکے۔ ہر چیز بے پردہ اور ننگی ہو گئی ہے۔ قائدین کھلم کھلا لوگوں سے رشوت لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں یہ حرکت کرتے ہوئے ٹیلی ویژن پر بار بار دکھایا جاتا ہے۔ پہلے یہ چیزیں پردے کے پیچھے ہوا کرتی تھیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جو حرکت علی الا علان ہوتی ہو اور جس کا پردہ پہلے ہی فاش ہو چکا ہو اس پردے کو آپ اور کتنا فاش کریں گے۔ ہمارے فیشن شوز کو دیکھئے کہ ان میں حصہ لینے والیاں اپنے بدن کو کس حد تک پردے میں رکھتی ہیں۔ جسم کا انگ انگ بے پردہ ہو چکا ہے۔ جو تھوڑا بہت پردہ رہ گیا ہے اگر اسے بھی آپ ''فاش'' کر دیں تو باقی کیا رہ جائے گا۔ چنانچہ مایاوتی جی نے اپنی ''پردہ فاش ریلی'' میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ ان کے مخالفین کی حرکتوں پر جو کچھ بھی پردہ پڑا ہوا ہے اسے فاش نہ کیا جائے۔ یوں بھی سیاسی قائدین کے قول و فعل کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ انہوں نے پردہ کو فاش کرنے کی بجائے اپنے مخالفین کے خلاف کئی مقدمات دائر کر دیئے۔ ہمارا ارادہ اس معاملہ کی گہرائی میں جانے کا نہیں ہے کیونکہ ہم 'رموزِ مملکت' سے بالکل نا آشنا ہیں۔ ہمیں تو بس اس ریلی کا شاعرانہ نام پسند آ گیا ہے جس کی داد دینے کے لئے ہم یہ چند سطریں لکھ رہے ہیں۔ ریلیوں کا بندوبست کرنے والوں سے ہماری گزارش ہے کہ وہ مستقبل میں اپنی ریلیوں کو ایسے ہی خوبصورت ناموں سے نوازتے رہیں۔ کچھ نام ہمارے ذہن میں بھی آئے ہیں جیسے ''گریباں چاک ریلی''، ''کلیجہ چاک ریلی''، ''سینہ چاک ریلی''، ''آہ و فغاں ریلی''، ''گلا پھاڑ ریلی''، ''چھپر پھاڑ ریلی''۔ ہم تو یونہی چند نام نمونے کے طور پر لکھ رہے ہیں۔ اُردو شعر وادب سے تعلق رکھنے والے اصحاب اپنے ذوق، ہمت، فکر اور استطاعت کے مطابق ایسے کئی نام تجویز کر سکتے ہیں۔

دہلی میں رہنے کے باعث ان ریلیوں سے ہمارا گہرا تعلق پیدا ہو چکا ہے۔ اگر کسی دن یہاں کوئی ریلی نہ نکلے تو یوں لگتا ہے جیسے اُس دن کا سورج طلوع ہی نہیں ہوا۔ ایک زمانہ میں یہاں ریلیاں کم نکلا کرتی تھیں اور ان ریلیوں میں حصہ لینے والوں کو پتہ رہتا تھا کہ وہ کس مقصد کے تحت اس ریلی میں شامل ہو رہے ہیں۔ انہیں معلوم رہتا تھا کہ کس بات پر ''زندہ باد'' کہنا ہے اور کہاں

''مردہ باد'' کا نعرہ لگاتا ہے۔ آج کی ریلیوں میں حصہ لینے والے اتنے فراخ دل، روادار اور وسیع القلب ہوگئے ہیں کہ جسے ''مردہ باد'' سے نوازتا ہے اسے بھی ''زندہ باد'' کے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ریلی نکالنا اب ایک پیشہ بن گیا ہے اور اس میں وہ مہارت حاصل کرلی گئی ہے کہ ادھر آپ ریلی کا آرڈر بک کرائیں اور اُدھر لوگ چیونٹیوں کی طرح دہلی کی سڑکوں پر اُبل پڑتے ہیں۔ بسوں، ٹرکوں اور آٹو رکشاؤں میں لاد کر انہیں یوں لایا جاتا ہے جیسے ذبح ہونے والے مرغوں کو جال کے بنے ہوئے پنجروں میں بند کر کے لایا جاتا ہے۔ مرغ تو خیر حسبِ توفیق اور حسبِ موقع آوازیں بھی نکالتے ہیں لیکن ریلی میں شرکت کرنے والے اُس وقت تک آواز نہیں نکالتے جب تک کہ انہیں آواز نکالنے کی ہدایت نہ دی جائے۔ پھر وہ مخصوص جملے ہی اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں کیونکہ انہیں ان ہی مخصوص نعروں کی آوازوں کا معاوضہ چند سکوں کی شکل میں ادا کیا جاتا ہے۔ آواز اٹھانے کی اس محدود آزادی کی وجہ سے ریلیوں میں شرکت کرنے والے بعض اصحاب مر بھی جاتے ہیں مگر اپنی زبان سے اُف تک نہیں کرتے کیونکہ انہیں یہ علم نہیں ہوتا کہ خود اپنی زندگی کی حفاظت کے لئے انہیں کونسا لفظ ادا کرنا چاہیے۔

دہلی میں ایک لمبے عرصہ تک رہنے کی وجہ سے ہمیں اندازہ ہے کہ ان ریلیوں کا دہلی کی عام زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہاں آئے دن کوئی نہ کوئی ریلی ضرور نکلتی ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ ہماری زندگی کی کتنی ہی عزیز اور قیمتی ساعتیں ان ریلیوں کی وجہ سے ضائع ہوگئیں۔ کسی اور شہر میں رہتے تو ہوسکتا ہے ہماری زندگی کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور ہمارا شمار بھی سماج کے معزز شہریوں میں ہوتا۔ دہلی میں ایسی جگہ رہتے ہیں جہاں سے مرکزی دہلی میں جانے کے لئے ہمیں جس چوراہے سے گزرنا پڑتا ہے وہاں سے یہ ریلیاں جان بوجھ کر ضرور گزرتی ہیں۔ رام لیلا میدان بھی پاس میں ہے، راج گھاٹ بھی سیدھے ہاتھ پر پڑتا ہے، جہاں سے لال قلعہ بھی دکھائی پڑتا ہے۔ ریلی والے اگر آپ کو آگے جانے کا موقع عطا کریں تو اگلے چوراہے سے سپریم کورٹ کی عمارت بھی دکھائی دیتی ہے۔ سنا ہے کہ یہاں لوگوں کو انصاف وغیرہ ملتا ہے بشرطیکہ آپ انصاف مانگنے جائیں اور وکیلوں کو معقول فیس وغیرہ دینے کے اہل ہوں۔ چونکہ ہمیں اپنی خودی اور غربت دونوں میں مگن رہنے کی عادت پڑ گئی ہے اسی لئے ہر نا انصافی کا ہنستے کھیلتے مقابلہ کر لیتے ہیں اور کبھی انصاف کی طلب میں کسی زنجیرِ عدل کو نہیں کھینچا۔ کیا بتائیں کہ ہمیں اس علاقہ سے گزرنے میں کتنی دقتوں کا

سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کہتے ہیں کہ اس میدان میں ہمیں جو وسیع تجربہ حاصل ہے اس کا فائدہ ہمیں دوسری دنیا میں پُل صراط کو عبور کرتے وقت ضرور ملے گا۔ دو ہفتے پہلے کی بات ہے کہ دہلی میں تین بڑی سیاسی پارٹیوں کی جانب سے ایک ہی دن میں تین عظیم الشان ریلیاں نکالی گئی تھیں۔ اتفاق سے عین اُسی دن ہمیں کناٹ پلیس میں ایک ضروری کام سے جانا تھا۔ وہاں جانے کے لئے ہم نے دہلی کے ہر متبادل اور طویل مسافت والے راستے کو اپنانے کی کوشش کی۔ لیکن ہر جگہ کسی نہ کسی ریلی کی دُم یعنی آخری سرے نے ہمیں روک لیا۔ پانچ گھنٹوں تک ٹھوکریں کھا کر اپنے گھر واپس آ گئے۔ تین تین ریلیاں ایک ساتھ نکلیں گی تو ہم جیسوں کو تو خیر کیسے پتہ چلے گا کہ یہ کس کی ریلی ہے۔ بسا اوقات تو خود ریلی میں شرکت کرنے والوں کو پتہ نہیں رہتا کہ وہ اس وقت کس کی ریلی میں موجود ہیں۔ جو لوگ کبوتر بازی کا شوق رکھتے ہیں وہ اس بات سے بخوبی واقف ہوں گے کہ بعض اوقات کبوتروں کا کوئی غول آسمان میں اُڑتا ہے تو واپسی میں کبوتروں کے دوسرے غول کے بعض کبوتروں کو بھی اپنے ساتھ اُڑا کر لے آتا ہے۔ ریلیاں اور ریلیوں میں شرکت کرنے والے آپس میں کچھ اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ ان کی شناخت مشکل ہو جاتی ہے اور انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ کونسی ریلی میں کس مقصد سے شرکت کرنے آئے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ ایک بار تو ہم خود بھی دہلی کے صفائی کرمچاریوں کی ریلی میں شرکت کر چکے ہیں۔ بات یوں ہوئی کہ جب صفائی کرمچاریوں کی ریلی گزر رہی تھی تو ہم نے سوچا کہ کیوں نہ اتنی دیر میں پنواڑی کی دکان سے پان اور سگریٹ وغیرہ خرید لیں۔ اس سے فارغ ہو کر ہم سڑک پر چلنے لگے تو ایک ہندی اخبار کے فوٹو گرافر نے اچانک ہماری تصویر کھینچ لی جسے دوسرے دن ریلی کی تصویر کے طور پر اس اخبار میں نمایاں طور پر شائع کیا گیا۔ تصویر کو دیکھنے سے یوں لگتا تھا جیسے ہم صفائی کرمچاریوں کی ریلی کی قیادت کر رہے ہیں۔ اس پر کچھ دوستوں نے فون کر کے ہم سے اظہارِ ہمدردی بھی کیا کہ میاں ہمیں پتہ نہیں تھا کہ تم اپنے حالات کی خرابی کے باعث صفائی کرمچاری بن گئے ہو۔ ہم نے کہا ''بھیا! جب سے دیکھا ہے کہ تم جیسے لوگ سماج میں گندگی پھیلاتے چلے جا رہے ہیں تو سوچا کہ کیوں نہ صفائی کرمچاری بن جائیں۔'' کبھی کبھی ہمارا جی چاہتا ہے کہ ان ریلیوں سے تنگ آ کر ہم اپنا گریبان چاک کر لیں اور ان ریلیوں کے خلاف ایک ''گریباں چاک ریلی'' نکالیں۔

روزنامہ ''سیاست'' (جولائی ۲۰۰۳ء)

☆☆

تاج محل کی گمشدگی

خبر آئی ہے کہ تاج محل تک جانے کے لئے جو راہداری بنائی جا رہی تھی اُس کی تعمیر کے دوران کھدائی وغیرہ کے کام کی وجہ سے تاج محل کی بنیادوں میں جمنا کا پانی آنے لگا ہے اور یہ کہ تاج محل کی عمارت کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ (پتہ نہیں اس راہداری کو کون بنا رہا تھا، کب سے بنا رہا تھا اور کیوں بنا رہا تھا۔ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ خود شاہ جہاں کے ایک سابق حکم کے مطابق یہ کام شروع کر دیا گیا تھا کیونکہ اب ہر کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ اس کام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اُتر پردیش کی چیف منسٹر مایاوتی بھی اپنی گدی چھوڑ کر غائب ہو چکی ہیں۔) بہر حال اس پس منظر کے ساتھ ایک صبح سورج طلوع ہوا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ تاج محل کی عظیم الشان عمارت اچانک غائب ہو گئی ہے۔ اس پر ہمیں تو کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ ہمیں پہلے سے علم ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ جو یہاں آتا ہے اُسے ایک نہ ایک دن واپس بھی جانا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ سورج، چاند، سیارے اور ستارے بھی ایک نہ ایک دن فنا ہونے والے ہیں۔ تاج محل کی گمشدگی کی تحقیقات حکومتیں، سی بی آئی، پارلیمنٹ کی کمیٹیاں اور عدالتوں کے قائم کردہ کمیشن وغیرہ تو کرتے رہیں گے لیکن ہمیں اتفاق سے تاج محل کی ''آپ بیتی'' کا ایک نسخہ مل گیا ہے۔ جس کا سلسلہ ہمارے موجودہ حکمرانوں کی ''پاپ بیتیوں'' سے جا ملتا ہے۔ پیش ہیں اس آپ بیتی کے کچھ حصے!

''حضرات! میں تاج محل ہوں۔ لگ بھگ پونے چار سو برس تک میرا قیام آگرہ میں

رہا۔ اچھی خاصی گزر رہی تھی لیکن اب میں نے یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ فیصلہ میں نے بہ رضا و رغبت اپنے طور پر کیا ہے۔ بھلے ہی انسانوں میں اب خودداری نہ ہوتی ہو لیکن عمارتوں میں اور خاص طور پر تاریخی عمارتوں میں تو یہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ (بلکہ سمنٹ کے ساتھ ملائی جاتی ہے۔) ٹیپو سلطان نے کہا تھا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو دن کی زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں کہ کہیں کسی نے میرا اغواء تو نہیں کر لیا۔ اس لئے کہ ان دنوں اغواء کی وارداتیں بہت زیادہ پیش آنے لگی ہیں۔ لہٰذا آپ لوگ میری گمشدگی کا اعلان اخباروں وغیرہ میں میری تصویروں کے ساتھ ہرگز شائع نہ کرائیں۔ یوں بھی میری تصویریں آپ کو تاج محل بیڑی، تاج محل صابن، تاج محل ہیر کٹنگ سیلون، تاج محل بیکری وغیرہ پر آسانی سے دستیاب ہو جائیں گی۔ بلکہ زیادہ تر لوگوں کو تو میری تصویریں منہ زبانی یاد ہیں۔ ویسے بھی میں کوئی دوّنی، چوّنی یا اٹھنّی نہیں ہوں کہ آپ اسے تلاش کرنے کے لئے دوسروں کی مدد لیں۔ میں تو کئی ایکڑ اراضی پر پھیلی ہوئی عمارت ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ان دنوں بڑی بڑی عمارتیں اچانک غائب ہونے لگی ہیں۔ ابھی دس گیارہ برس پہلے تک اس ملک میں ایک بابری مسجد ہوا کرتی تھی جو ایک دن دیکھتے دیکھتے اچانک غائب ہو گئی۔ ہندوستان کی بات تو چھوڑیئے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں ایک عمارت ہوا کرتی تھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر۔ نہایت بلند و بالا اور پرشکوہ عمارت تھی۔ زیادہ پرانی بھی نہیں تھی۔ یہ عمارت بھی ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو سب کی آنکھوں کے سامنے صفحۂ ہستی سے غائب ہو گئی۔ اب تک پتہ نہیں چلا کہ کہاں گئی۔ بغداد میں بھی ایسی ہی کئی عمارتیں آناً فاناً غائب ہو گئیں۔ میں نے سوچا کہ اس طرح کی نوبت آنے سے پہلے کیوں نہ میں خود غائب ہو جاؤں۔ پرہیز علاج سے بہتر ہوتا ہے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میرا شمار دنیا کے سات بڑے عجائبات میں ہوا کرتا تھا اور مجھے غالباً اس لئے بھی عجائبات میں شمار کیا جاتا تھا کہ میری عمارت خود بڑی عجیب و غریب عمارت تھی۔ یہ عمارت کسی کے رہنے یا کسی خاص مقصد کے لئے نہیں بنائی گئی تھی بلکہ اس میں دو ایسی ہستیوں کو دفن کیا گیا تھا جو آپس میں بہت محبت کرتی تھیں اور یہ دونوں ہستیاں مرنے کے بعد یکے بعد دیگرے یہاں آباد ہونے کے لئے آئی تھیں۔ بھلا بتایئے روحیں بھی کہیں عمارتوں میں رہتی ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مجھے شاہ جہاں نے بنوایا تھا جسے عمارتیں بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ سارا وقت

عمارتوں کو بنوانے کے نئے نئے منصوبے بنایا کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ امور سلطنت کی طرف بالکل دھیان نہیں دیتا تھا جس کی وجہ سے اُس کے دور حکومت میں ہر طرف چین اور امن وسکون تھا۔ اس اہم نکتہ کو دیگر مغل حکمرانوں نے بالکل محسوس نہیں کیا جس کی وجہ سے بالآخر مغل سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ شاہ جہاں کو اپنی ملکہ ممتاز محل سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اپنی ملکہ سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اپنی چودہ سالہ ازدواجی زندگی میں اس نے چودہ اولادیں پیدا کیں بلکہ چودھویں اولاد کی ولادت کے دوران ہی ملکہ کا انتقال ہوا۔ محبت کرنے کے معاملہ میں اتنی شدّت کسی اور بادشاہ نے نہیں دکھائی۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں شاہ جہاں کے جانشین بیٹے، اورنگ زیب نے شاہ جہاں کے بچے کھچے سارے شہزادوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود شاہ جہاں کو آگرہ کے قلعہ میں قید کر دیا۔ تاہم شاہ جہاں کی سہولت کے لئے اُس نے قلعہ میں اُسے ایسی جگہ قید کیا تھا جہاں سے وہ تاج محل کا دیدار کر سکتا تھا۔ افسوس کہ اس زمانہ میں شاہ جہاں کو تاج محل تک جانے کے لئے ایک راہداری بنانے کا خیال نہیں آیا ورنہ وہ اس کے ذریعہ قلعہ سے تاج محل تک آ سکتا تھا۔ جب راہداری کی ضرورت پیش آئی تو وہ اقتدار سے محروم ہو چکا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ آج کے حکمرانوں کو شاہ جہاں کے انتقال کے پونے چار سو برس بعد اس طرح کی راہداری بنانے کا خیال آیا۔ شاہ جہاں کے والد شہنشاہ جہانگیر بھی اپنی ملکہ کو بہت چاہتے تھے اور ان کی اس چاہت کا راز نور جہاں کی معصومیت میں مضمر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر نے پہلے پہل جب نور جہاں کو دیکھا تو نور جہاں کے ہاتھوں میں دو کبوتر تھے۔ ان میں سے ایک کبوتر اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اُڑ گیا تو بادشاہ نے نور جہاں سے پوچھا کہ یہ کبوتر کیسے اڑ گیا۔ اس پر نور جہاں نے بڑی معصومیت کے ساتھ دوسرے کبوتر کو بھی اپنے ہاتھ سے آزاد کرتے ہوئے جواب دیا ''ایسے چھوٹ گیا۔'' جہانگیر کو نور جہاں کی یہ ادا کچھ اتنی پسند آئی کہ اس نے نور جہاں کو اپنی ملکہ بنا لیا۔ مؤرخین یہ تو کہتے ہیں کہ نور جہاں کے ہاتھوں سے دونوں کبوتر چھوٹ گئے لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ نور جہاں نے ان کبوتروں کی جگہ شہنشاہ ہندوستان کو اپنے ہاتھوں میں پھانس لیا تھا۔ شاہ جہاں نے ممتاز محل کو پسند کرنے کے معاملہ میں کبوتروں، میناؤں، بلبلوں اور فاختاؤں وغیرہ کو بالکل زحمت نہیں دی۔ اس نے ممتاز محل کو صرف اس لئے پسند کیا کہ وہ ممتاز محل تھی اور وہ کبوتروں کی مرہون منت نہیں تھی۔ بہر حال یہ شاہ جہاں اور ممتاز محل کا ذاتی معاملہ تھا۔

شاہ جہاں کو جب بھی ممتاز محل سے محبت کرنے سے فرصت ملتی تھی تو وہ عمارتوں کی تعمیر کے منصوبے بنایا کرتا تھا۔ چنانچہ مجھے بنانے کا منصوبہ بھی اس نے بنایا۔ اس زمانہ میں فن تعمیر نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کیونکہ ان دنوں پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کا محکمہ نہیں تھا۔ بلڈر مافیا کا زور بھی نہیں تھا۔ ٹھیکیداروں وغیرہ کا بھی بول بالا نہیں تھا۔ نقشے بنانے والے اور انہیں پاس کرانے والے بھی نہیں تھے۔ میرا اشمار غالباً اس ملک کی واحد عمارت میں ہوتا ہے جس کی تعمیر کے لئے جو بجٹ مختص کیا گیا تھا وہ سب کا سب مجھ پر خرچ کیا گیا۔ آج کی طرح کا معاملہ نہیں تھا کہ کسی بڑے تعمیراتی کام کو شروع کرنے کا منصوبہ بنے تو اس کے بجٹ میں سے پہلے حکمرانوں اور ان کے رشتہ داروں کے گھر بن جاتے ہیں۔ پھر بلڈروں، انجینئروں اور ٹھیکیداروں وغیرہ کے کمیشن کا معاملہ طئے ہوتا ہے۔ اصل عمارت کی تعمیر پر بجٹ کا صرف بیس فیصد حصّہ خرچ ہوتا ہے اور باقی کا حصّہ کمیشن کے طور پر منصوبہ بنانے والوں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ غرض چارسو برسوں تک دنیا بھر سے لوگ مجھے دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ شاہ جہاں اور ممتاز محل کی محبت ساری دنیا میں مشہور ہوگئی۔ میں بھی خوش تھا کہ چلو اس زمانہ میں بھی لوگوں کو محبت کا خیال تو آتا ہے ورنہ لوگ اب محبت، آپسی بھائی چارہ، اخوت، رواداری سب کو بھولتے جارہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ایک سیاسی پارٹی کا کنونشن آگرہ میں منعقد ہوا تھا۔ کنونشن کے بعد اس پارٹی کے کارکنوں نے میری عمارت پر گندگی پھینکی اور مجھے مسخ کرنے کی کوشش کی۔ اس واقعہ کے بعد ہی میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب یہاں سے چلے جانے میں ہی عافیت ہے۔ اسی اثنا میں یہ اطلاع آئی کہ مجھ تک پہنچنے کے لئے ایک راہداری بنائی جارہی ہے۔ جب پوچھا گیا کہ یہ راہداری کون بنا رہا ہے تو ہر کسی نے یہ کہہ کر اپنا دامن بچالیا کہ اس راہداری کی تعمیر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جس ملک میں تعمیرات کا یہ معیار ہو وہاں اب کوئی عمارت بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے میں نے بہ رضا و رغبت یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ لہٰذا آپ اس معاملہ میں بالکل پریشان نہ ہوں۔

بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

روزنامہ "سیاست" (۷ ستمبر ۲۰۰۳ء)

☆☆

☆ ''مجتبیٰ حسین WIT کے مردِ میدان یعنی بذلہ سنجی اور ذکاوت کا پیکر ہیں۔ میرے نزدیک WIT مزاح کا موثر آلہ ہے اور اس کی مثالیں مجتبیٰ حسین کے ہاں جا بجا ملتی ہیں''۔

(آلِ احمد سرور)

☆ ''ایسا لطیف مزاح اور ایسی شُستہ زبان اُردو میں آج شاذ ہی کسی کو نصیب ہو''۔

(شمس الرحمٰن فاروقی)

☆ ''مجتبیٰ حسین بلاشبہ ہمارے عہد کے بڑے طنز و مزاح نگار ہیں اور ہمارا عہد اُن کی تحریروں میں ایک منفرد انداز سے جلوہ گر ہے''۔

(مشفق خواجہ)

☆ ''مجتبیٰ حسین کے سفرناموں کو پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے آپ پر ہنسنے کا زبردست حوصلہ رکھتے ہیں''۔

(خوشونت سنگھ)

☆ ''پچھلی نسلوں نے ہمارے لیے طنز و مزاح کا جو ورثہ چھوڑا تھا مجتبیٰ حسین نے اُس کو اور اُس کی خصوصیات کو نہ صرف محفوظ رکھا ہے بلکہ اُس کو زمین سے گہرائی تک اور عام آدمی کے زندہ مسئلوں سے دور تک جوڑ کر زیادہ وسیع اور بامعنیٰ بنا دیا ہے''۔

(نثار احمد فاروقی)

☆ ''مجتبیٰ حسین نے اس صدی کے آشوب کو ملائم کرنے اور قابلِ برداشت بنانے میں عہد آفریں حصہ لیا ہے''۔

(ضمیر جعفری)

☆ ''مجتبیٰ حسین کو واقعہ نگاری اور مرقع کشی میں کمال حاصل ہے۔ اُن کا مشاہدہ جزیات بین ہے اور اس وصف کو کام میں لا کر وہ کسی واقعہ کے مضحک پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ کسی واقعہ کو محسوس بنا کر پیش کرنا اور اس کر[illegible] جیتی جاگتی تصویر کھینچ دینا مجتبیٰ حسین کے فن کا خاص وصف ہے''۔

([illegible]بسم)

☆ ''مزاحیہ ادب کو مزاحیہ ہونے سے پہلے ادب ہونا چاہیے۔ ہمارے اکثر مزاح نگار اس فرق کو فراموش کر جاتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی تحریریں اپنے اُسلوب، طریقۂ اظہار اور زبان و بیان کی جمال آفرینی کے باعث ادب کے بلند درجہ پر فائز ہیں''۔

(مظہر امام)

☆ ''اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ہندوستان کے مزاحیہ ادب کی بھرپور نمائندگی کون سا شہر کرتا ہے تو بلا جھجک حیدرآباد کا نام لوں گا اور اگر یہ دریافت کیا جائے کہ حیدرآباد کی نمائندگی کون کرتا ہے تو میں بے دریغ ایک ہی نام لے سکتا ہوں اور وہ ہے مجتبیٰ حسین۔ جو خصوصیت اُنہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اُن کی حیدرآبادیت ہے''۔

(وحید اختر)

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (India)
Phones: 3216162, 3214465 Fax: 91-011-3211540
E-mail: eph@onebox.com

81-8223-002-0